خزاں کی بارش

بادل ڈکیت

اے حمید

واشنگٹن میں سارا دن بارش ہوتی رہی تھی۔ آسمان اس وقت بھی ابر آلود تھا۔ جب ظفر شبانہ اور عقیل بھائی کو لے کر ایئرپورٹ کی پارکنگ پلیس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ شبانہ گرم کوٹ میں تھی اس نے مفلر بھی لپیٹ رکھا تھا۔ پھر بھی اسے اتنی سردی محسوس ہو رہی تھی کہ اس کے دانت بجنے لگے۔ پارکنگ پلیس میں ہزاروں گاڑیاں کھڑی تھیں ظفر کی شیورلیٹ بڑی گاڑی کافی دور کھڑی تھی۔

گاڑی کی فضا، باہر کی نسبت گرم تھی۔ شبانہ سمٹ کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی ظفر نے انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، "آج یہاں کافی سردی ہے برف کا سیزن شروع ہو چکا ہے۔"

اس نے گاڑی کا ہیٹر آن کر دیا۔ گاڑی پارکنگ پلیس سے نکل کر ایئرپورٹ کی حدود سے باہر آئی تو شبانہ کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے وہ آتشدان کے پاس بیٹھی ہے سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا گاڑی واشنگٹن کی کشادہ سڑک پر دوڑی جا رہی تھی ظفر کا تھری بیڈ روم والا گارڈن ہاؤس فالز چرچ کے علاقے میں سیون کارنر کے عقب والے علاقے میں تھا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے انہیں تقریباً پون گھنٹہ لگ گیا۔ سارے راستے میں روشنیاں تھیں گاڑی دریائے پوٹامک کے ساتھ ساتھ چلنے لگی تو ظفر نے شبانہ کو بتایا کہ یہ واشنگٹن کا پوٹامک دریا ہے۔

سیون کارنر کا بہت بڑا چوک آیا تو شبانہ نے دیکھا کہ سات جانب سے سڑکیں آ کر وہاں مل رہی تھیں ٹریفک سگنلز کا ایسا انتظام تھا کہ کسی گاڑی کو وہاں دو منٹ سے زیادہ نہیں رکنا پڑتا تھا سیون کارنر والے چوک سے نکل کر ظفر نے گاڑی

ولسن بلیوارڈ پر ڈال دی۔ دائیں بائیں بلند و بالا ہائی رائیز عمارتیں دیکھ کر شبانہ کو عجیب سا احساس ہوا۔ ٹاؤن ہاؤسز اور دوسری عمارتوں کے اپارٹمنٹ روشنیوں سے جگمگا رہے تھے۔ ان سڑکوں پر دکانیں نہیں تھیں۔ کچھ ریستوران شبانہ نے دیکھے جن کے نیون سائنز جھلملا رہے تھے۔ ولسن بلیوارڈ پر آنے کے تھوڑے ہی دیر بعد ان کے بائیں جانب کیولرز اپارٹمنٹ کی ہائی رائیز بلڈنگ آ گئی یہاں سے ظفر نے گاڑی کو میکنلے انٹرسیکشن سے دائیں جانب موڑ لیا یہ سیون کارنرز اپارٹمنٹس والی سڑک تھی جو گھوم کر آگے روٹ سیون میں مل جاتی تھی۔ یہاں ایک طرف سیون کارنرز ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی دو منزلہ عمارت تھی دوسری جانب سیف وے فوڈ اسٹور تھا۔

یہاں سے چوک پار کیا تو بائیں طرف روشنیوں میں گارڈن ہاؤسز شروع ہو گئے یہ باغیچوں میں گھرے ہوئے کاٹیج ٹائپ کے خوبصورت مکان تھے جن کی چھتیں ڈھلوان تھیں۔ ایسے میں ایک خوبصورت اور کشادہ باغیچے والے گارڈن ہاؤس میں ظفر نے گاڑی موڑ دی گاڑی گیٹ کے اندر جا کر سیدھی چھتے ہوئے گیراج میں رک گئی۔

ایک نیگرو ملازم نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور شبانہ کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے یو آر ویل کم لیڈی کہہ کر اس کا خیر مقدم کیا شبانہ کو ساتھ لئے بڑی شان سے اٹھلا اٹھلا کر چلتا ہاتھ میں چابیاں گھماتا ظفر گارڈن ہاؤس کا پہلے جالی دار دروازہ اور پھر دوسرا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

مکان کی فضاء نیم گرم تھی یہ سنٹرلی ہیٹڈ تھا جیسا کہ واشنگٹن کے سبھی اپارٹمنٹ ہاؤسز، کاٹیج اور اسٹور ہوتے ہیں۔ سٹنگ روم خالص امریکی انداز میں سجایا گیا تھا۔ شبانہ نے ایسے کمرے امریکی فلموں میں بہت دیکھ رکھے تھے فضاء میں کسی پرفیوم کی ہلکی ہلکی مہک رچی ہوئی تھی دبلی پتلی نیگرو خادمہ ایپرن باندھے جلدی سے سٹنگ روم میں آ گئی۔ وہ پورے دانت کھولے مسکرا رہی تھی اس نے بھی شبانہ کو گرمجوشی سے خوش آمدید کہا عقیل بھائی صوفے پر دراز ہو گئے۔

"سوزن! کھانا لگا دیا کیا؟"

"یس مسٹر احمد۔"

اور وہ تیزی سے ڈائننگ روم کی طرف گھوم گئی ظفر نے عقیل کی طرف دیکھ کر کہا "بھائی جان آپ کو بیڈ روم بتانے کی ضرورت نہیں وہی بیڈ روم جہاں آپ پہلے بھی آ کر ٹھہرا کرتے ہیں۔" اور عقیل مسکرا دیا۔

"ہاں... ارے یہ تو مجھے اپنے گھر کی طرح یاد ہے۔ شبانہ تمہاری طبیعت ٹھیک ہے ناں؟"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں بھائی۔" ظفر نے شبانہ کی طرف دیکھا کہنے لگا۔

"جیٹ کا اثر ہوتا ہے رات آرام کرو گی تو طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی آؤ کھانا کھا لیں۔"

شبانہ کو واقعی بھوک نہیں تھی اس کو ہلکے ہلکے چکر آ رہے تھے اس نے کہا۔ "میرے سر میں درد ہے اور بھوک بھی نہیں آپ لوگ کھا لیں میں آرام کروں گی۔"

ظفر نے قدرے ترش روئی سے کہا۔ "اور یہ میں نے جو اتنا کھانا پکوا رکھا ہے وہ کون کھائے گا۔"

عقیل نے بھی ظفر کے لہجے کی سختی کو محسوس کیا جلدی سے بولا۔ "چلو شبو ظفر ٹھیک کہتا ہے بھئی اس نے تو اتنے شوق سے تمہارے لئے کھانا بنوایا ہے آج ذرا امریکی کھانا بھی تو کھا کر دیکھو طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔"

شبانہ جھکے سے اٹھ کر ظفر کے ساتھ ڈائننگ روم میں آ گئی۔ آبنوسی رنگ کی بیضوی میز پر قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ کینڈل لائٹس روشن تھیں۔ خادمہ سوزن ایک طرف کھڑی تھوڑا تھوڑا مسکرا رہی تھی۔ شبانہ نے اس گارڈن ہاؤس میں داخل ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا کہ وہاں کی فضاء بند بند سی ہے اور پرفیوم کی مہک کے ساتھ گرم مسالوں کی خوشبو بھی پھیلی ہوئی ہے ایسا لگتا تھا کہ یہ خوشبوئیں باہر نہیں نکل رہیں اور ان کی وجہ سے ڈائننگ روم کی فضاء خاصی بوجھل تھی۔ شبانہ کا

جی چاہا کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے باہر کھلی ہوا میں نکل جائے یا کھڑکی کھول دے مگر وہاں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ شیشے کی ریلنگ والا دروازہ ضرور تھا جو باہر باغیچے میں کھلتا تھا مگر اس وقت اس پر بھاری پردہ گرا ہوا تھا۔

ظفر سب سے پہلے ڈائننگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا امریکہ میں اتنے برس گزارنے کے باوجود بھی وہ ادب و آداب سے بے بہرہ ہی تھا۔ مگر شبانہ نے محسوس کیا کہ اس نے جان بوجھ کر پہلے شبانہ کے بیٹھنے کا انتظار نہیں کیا۔ کیا وہ اسے ذلیل کرنا چاہتا تھا؟ شبانہ انہی خیالوں میں الجھی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بلوریں گلاس میں سے ایپرن نکال کر شبانہ نے اپنی گود میں رکھ لیا۔

ظفر نے مسکرا کر جیسے طنزیہ انداز میں کہا۔ "یہ انگریزوں کا ایٹی کیٹ ہے امریکہ میں نہیں چلتا یہاں تو ٹیشو پیپر ہی استعمال کیا جاتا ہے۔"

اور ظفر نے تیزی سے دو تین ٹیشو پیپر اٹھا کر ان سے اپنے ہونٹ پونچھے۔ انہیں گولا سا بنا کر کوڑے والے ٹریش بیگ میں پھینکا اور سوزن کو کھانا بڑھانے کا اشارہ کیا عقیل بولا۔

"ظفر بھائی تم نے تو پلاؤ بھی پکوا رکھا ہے۔ میرا خیال ہے سوزن اب پاکستانی کھانے پکانے میں ماہر ہو گئی ہے۔"

سوزن اپنا نام سن کر مسکرانے لگی ظفر نے کہا۔ "یہ کہاں پلاؤ پکا سکتی ہے اس کی بڑی بریفنگ کی ہے پھر بھی نہیں پکا سکی۔ اب شبانہ آ گئی ہے یہ خود ہی پکایا کرے گی میں تو امریکی کھانے کھا کھا کر تنگ آ گیا ہوں۔"

شبانہ اپنی پلیٹ میں چمچے سے پلاؤ ڈال رہی تھی وہ سوچنے لگی کیا وہ پلاؤ پکا سکے گی؟ اس نے گھر پر کبھی کچھ نہیں پکایا تھا ہاں چائے یا آملیٹ ضرور بنا لیتی تھی اس نے نوکروں اور خانساموں میں آنکھ کھولی تھی جب کہ ظفر نے لاہور کے اندر جس مکان میں آنکھ کھولی تھی وہاں اس کی والدہ چولہے کے آگے بیٹھ کر روٹیاں اور ساگ پکاتی تھی اور ظفر وہیں پیڑھی پر بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ شبانہ نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح پلاؤ پکانا سیکھ لے گی آخر وہ عورت تھی اور ہر عورت میں کھانا پکانے کی صلاحیت موجود ہوتی ہے۔

ظفر نے تھوڑا سا پلاؤ کھانے کے بعد پلیٹ پرے رکھ دی اور ٹشو پیپر سے ہونٹ پونچھتے ہوئے بولا۔ "سوزن ساری زندگی پلاؤ نہیں پکا سکتی۔" وہ چونکہ پنجابی میں بات کر رہا تھا اس لئے سوزن نہ سمجھ سکی مگر اپنا نام سن کر مسکرا دی وہ سمجھی کہ شاید اس کے کھانے کی تعریف کی جا رہی ہے کونے میں کیبنٹ پر رکھے ٹیلیویژن پر ایک سنہری بالوں والی خوبصورت عورت مسکراتے ہوئے خبریں پڑھ رہی تھی۔

ظفر نے مرغ روسٹ کی ایک ٹانگ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے سوزن کی طرف دیکھا اور کہا "ہنی ڈارلنگ اسے چینل فور لگاؤ۔"

سوزن ٹیلی ویژن سیٹ کے پاس گئی اور چینل فور لگا دیا وہاں فینسی ڈریس میں ملبوس نیگرو اور گوری امریکی لڑکیاں میوزک کی دھن پر تھرک تھرک کر رقص کر رہی تھیں ظفر بھی رقص کی دھن پر سر دھننے لگا روسٹ مرغ ٹانگ پر ٹماٹو ساس ڈالتے ہوئے بولا۔ "میوزک تو امریکہ میں ہے بس۔ ایک دم سے خون گرم ہو جاتا ہے۔"

شبانہ خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔ وہ ایک نوالے کو چار حصوں میں تقسیم کر کے کھا رہی تھی۔ اس کا سر ابھی تک چکرا رہا تھا۔ عقیل بھائی ظفر کے ساتھ اس کے کاروبار کے بارے میں گفتگو کرنے لگا تھا۔ ظفر اسے بتا رہا تھا کہ میں نے ایک اور اسٹیٹ ایجنسی میں شیئر خرید لئے ہیں۔ شبانہ نے اپنے چھوٹے بھائی عامر کے بارے میں پوچھا تو ظفر نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"سان فرانسسکو میں ہے۔ بڑے مزے میں ہے خوب پڑھائی کر رہا ہے۔ میں اسے ہر ماہ ہزار ڈالر بھیج دیتا ہوں۔ کبھی کبھی فون بھی آ جاتا ہے۔"

شبانہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "کیا میں اسے یہاں سے فون کر سکتی ہوں؟"

ظفر نے پلٹ کر شبانہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ اور بے تاثر

عادی تھا۔ بولا۔ "پہلے کھانا تو کھالو۔ کھانا میں نے تمہارے لئے بنوایا ہے۔"

عقیل نے فوراً مسکراتے ہوئے کہا۔ "بھئی ظفر ہمیں تو کھانا بہت مزے دار لگا۔"

شبانہ کو اپنے بھائی کی بے بسی پر رونا آگیا۔ وہ ظفر کے سخت رویے کو سمجھ رہا تھا مگر اپنی بہن کی وجہ سے اور اس بھاری رقم کی وجہ سے جو شبانہ کے بھائی اور والد نے ظفر سے قرض لے رکھی تھی، اس کی خوشامد کرنے پر مجبور تھا۔ کھانے کے بعد کافی آگئی۔ کافی پینے سے شبانہ کی طبیعت قدرے سنبھل گئی۔

ظفر اندر اٹھ کر کارنر ٹیبل کی طرف گیا اور وہاں سے ٹیلیفون اور چھوٹی نوٹ بک اٹھا کر شبانہ کے سامنے رکھ کر بولا۔ "بھائی کو فون کرلو۔ فکر نہ کرنا۔ چاہے ایک گھنٹے تک بات کرو۔ یہ لاہور نہیں ہے۔"

عقیل کافی کی پیالی اٹھا کر صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ خاموش تھا۔ اس کے دل پر اپنی بہن کے بارے میں جو گزر رہی تھی وہ اس کا ذکر کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ نہ ظفر سے نہ شبانہ سے اور نہ اپنے والد صاحب سے۔ ظفر نے نوٹ بک میں سے وہ صفحہ کھول کر شبانہ کے سامنے کر دیا جس پر اس کے بھائی عامر کا ٹیلیفون نمبر لکھا تھا۔

"پہلے یہ نمبر ڈائل کرنا۔ یہ لانگ ڈسٹینس کال ہے پھر یہ عامر کا نمبر ہے۔"

شبانہ کا جی چاہا کہ وہ نوٹ بک بند کر کے پرے پھینک دے اور عامر کو فون نہ کرے۔ مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے نمبر ڈائل کئے۔ دوسری طرف سے گھنٹی کی آواز آنے لگی۔ پھر کسی نے انگریزی میں کہا۔ "عامر ہیئر۔"

بھائی کی آواز سن کر شبانہ کی آنکھوں میں ایک دم سے آنسو آگئے مگر وہ انہیں باہر نہیں لا سکتی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"عامر! میں شبو بول رہی ہوں۔ ہاں۔ وعلیکم السلام ہاں ہاں۔ ہم ابھی تھوڑی دیر ہوئے آئے ہیں۔ عقیل بھائی بھی ساتھ ہیں۔ ابو بالکل ٹھیک ہیں۔ تم کیسے ہو۔ اچھا۔ خدا کا شکر ہے۔ لو بھائی جان سے بات کرو۔"

شبانہ نے عقیل بھائی کو فون دے دیا۔ ظفر صوفے پر بیٹھا کافی پیتے ہوئے ایسی

نظروں سے عقیل اور شبانہ کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی آقا اپنے غریب رشتہ داروں کو دیکھتا ہے۔ سوزن نے جھک کر ظفر سے کہا۔ "میں نے بیڈ روم سیٹ کر دیا ہے اب میں جا رہی ہوں۔"

ظفر نے کافی کی پیالی ملازمہ سوزن کو دیتے ہوئے کہا "او کے سوزن گڈ نائٹ۔"

سوزن بھی گڈ نائٹ کہہ کر کچن کی طرف چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد یہ دُبلی پتلی تیکھی بیباک آنکھوں والی نیگرو لڑکی گیراج سے اپنی کار نکال کر اپنے اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو گئی۔ عقیل، ظفر کے پاس آکر بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ شبانہ اپنے بھائی سے فون پر گفتگو کر رہی تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"ضرور عامی ضرور۔ تم دو ایک دن کے لئے میرے پاس آجاؤ۔"

ظفر نے وہیں سے آواز بلند کر کے کہا۔ "اس کی پڑھائی کا جو حرج ہو گا۔"

عقیل خاموشی سے ٹیلیویژن پر رقص کرتی عورتوں کو دیکھتا رہا۔

شبانہ کے چہرے کی بشاشت غائب ہو گئی۔ اس نے اپنے خاوند ظفر کا جملہ سن لیا تھا۔ ہلکا سا سانس بھر کر بولی۔ "تمہاری پڑھائی کا حرج ہو گا عامی۔ تم چھٹیوں میں آ جانا۔ میں تو اب یہیں ہوں۔"

پھر شبانہ نے فون بند کر دیا۔ وہ سست قدم اٹھاتی آئی اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ ظفر نے کہا۔ "آؤ میں تمہیں بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ تم تھکی ہوئی ہو جا کر آرام کرو۔"

ظفر شبانہ کو بیڈ روم میں لے گیا۔ ڈبل بیڈ والا یہ کمرہ کسی تیز پرفیوم سے مہک رہا تھا۔ اسی پرفیوم کی وجہ سے بیڈ روم کی فضا بوجھل ہو رہی تھی۔ کلوزٹ میں سے ظفر نے شبانہ کا اٹیچی کیس نکال کر پلنگ پر رکھ دیا اور کلوزٹ کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "یہاں کپڑے ٹانگنے اور سوٹ کیس اور جوتے وغیرہ رکھنے کے لئے اس قسم کے کلوزٹ ہوتے ہیں۔ کپڑے اور جوتے باہر مت یونہی ڈال دیا کرنا۔ اب تم کپڑے تبدیل کر کے لیٹ جاؤ۔"

بیڈ روم میں بھی ایک چھوٹا سا کلر ٹی وی میز پر رکھا ہوا تھا۔ ظفر نے میز پر سے

ریموٹ کنٹرول اٹھا کر اس کا بٹن دبا دیا۔ ایک زوردار جھنکار کے ساتھ ٹی وی پر نیم برہنہ لڑکیوں کا رقص شروع ہو گیا۔ شبانہ نے کہا۔

"ذرا آواز کم کر دیں پلیز!"

ظفر نے ٹی وی آف کر دیا اور ریموٹ کنٹرول پلنگ کی سائڈ ٹیبل پر پھینک کر بولا۔ "یہ امریکہ ہے۔ یہاں تیز میوزک کو پسند کیا جاتا ہے۔ تیز بولنے والوں کو پسند کیا جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر ظفر کمرے سے نکل گیا۔ شبانہ اٹیچی کیس میں سے کپڑے نکالنے لگی۔ ظفر سے وہ ایسے ہی رویے کی توقع کر رہی تھی۔ اس کا دل ضرور بھر آیا مگر وہ ایک مشین کی طرح کپڑے نکال کر پلنگ پر رکھتی گئی۔ اس نے حالات سے پوری طرح سمجھوتہ کر لیا تھا اور اپنے سینے پر پتھر رکھنے کے لئے تیار ہو کر ظفر کے پاس آئی تھی۔ اس نے عہد کر رکھا تھا کہ وہ ہر قسم کا ظلم و ستم برداشت کرے گی مگر زبان سے اُف تک نہ کرے گی اور کبھی اپنے ابو اور بھائی کو اپنے دل کے زخم نہیں دکھائے گی۔

عقیل بھائی اپنے بیڈ روم میں جا کر سو گئے۔ ظفر نے نائٹ ڈریس یا سلیپنگ سوٹ پہنا اور سبز رنگ کے مشروب کا گلاس لے کر شبانہ کے پاس آ گیا۔ شبانہ نے ظفر کے ہاتھ میں سبز رنگ کا مشروب دیکھا تو سمجھ گئی کہ اس میں کیا ہے۔ وہ بستر میں لیٹی سونے کی کوشش کر رہی تھی مگر اجنبی... بالکل ہی اجنبی جگہ اور بند بیڈ روم ہونے کی وجہ سے اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کھڑکی کے شیشوں میں سے یوکلپٹس کے درخت دیکھنا چاہتی تھی مگر یوکلپٹس کے درخت بہت پیچھے رہ گئے تھے۔

ظفر نے بیڈ روم کا دروازہ لاک کیا اور پلنگ پر آ کر بیٹھ گیا۔ گلاس اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا اور ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا کر ٹیلی ویژن آن کر دیا۔ ٹیلی ویژن پر کوئی انگریزی فلم دکھائی جا رہی تھی۔ وہ مشروب کے گھونٹ بھرنے لگا۔ پھر شبانہ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"یہ یہاں کے عام مشروب ہیں اگر تم بھی چاہو تو پی سکتی ہو۔ یہاں اسے برا نہیں سمجھا جاتا یہ لاہور نہیں ہے امریکہ ہے۔"

شبانہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ ظفر کی نگاہیں ٹی وی پر جمی تھیں پھر اس نے گلاس میز پر رکھ دیا اور سلیپنگ سوٹ کی جیب میں سے سفید رنگ کا مڑا تڑا رومال نکالا اسے شبانہ کی طرف پھینک کر بولا۔ "اسے باتھ روم میں جا کر صابن سے اچھی طرح دھو کر استری کر دو۔ میں یہاں ٹشو پیپر زیادہ استعمال نہیں کرتا۔"

شبانہ جلدی سے اٹھی۔ رومال لے کر باتھ روم میں چلی گئی۔ وہ صابن سے رومال دھو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔ اس نے آنکھوں پر پانی کا چھینٹا مارا اور اپنے دل سے کہا۔ "نہیں۔ آنسو نہیں بہانا۔ کچھ بھی گزر جائے اپنے خاوند کی خدمت کرنی ہے۔ اب یہی تیری زندگی کا مقصد ہے۔"

بیڈ روم کے کونے میں اسٹینڈ پر استری پڑی تھی۔ شبانہ سوئچ آن کر کے گیلے رومال پر استری پھیرنے لگی تو ظفر نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "سٹیم کا بٹن مت دبانا یہ امریکی استری ہے۔ معلوم ہے سٹیم کا بٹن کہاں ہے؟ ٹھہرو میں تمہیں بتاتا ہوں۔"

ظفر مشروب کا سارا گلاس ختم کر چکا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر شبانہ کے پاس آیا۔ استری کے ایک بٹن پر انگلی رکھ کر بولا۔ "یہ سٹیم کا بٹن ہے۔ اس کو دباؤ تو اندر سے اپنے آپ کپڑے کو نم ملنے لگتا ہے۔ رومال بہت گیلا ہے۔ اس کو ذرا یہیں پڑا رہنے دو۔ تم گھر میں اس طرح گیلے کپڑوں پر ہی استری کیا کرتی تھیں؟"

شبانہ نے کہا۔ "میں نے سوچا رومال ہے جلدی سوکھ جائے گا۔"

ظفر خالی گلاس لے کر بیڈ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔

"رومال ہے تو کیا ہوا۔ داغ پڑ گیا تو کون ذمہ دار ہوگا۔" وہ بیڈ روم سے نکل گیا۔ شبانہ رومال کو ہوا میں لہرا کر سکھانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں ظفر واپس آ گیا۔ اس کا گلاس سبز مشروب سے بھرا ہوا تھا۔ آتے ہی اس نے شبانہ کی طرف دیکھا اور بولا۔ "بس بس اب لاہور کی طرح اسے ہوا میں مت سکھاؤ۔ کر دو استری۔ مجھے رومال جلدی چاہیئے۔"

شبانہ رومال استری کر کے پلنگ پر آ گئی۔ اس نے رومال دوسری طرف بڑھایا۔

اور ذرا سا مسکرا کر بولی "آپ پرفیوم کون سا لگاتے ہیں۔"

ظفر نے ٹی وی بند کر کے ریموٹ کنٹرول ہاتھ سے رکھ دیا اور سگریٹ سلگا کر سر پلنگ کی پشت سے لگا دیا۔ سگریٹ کا ہلکا سا کش لگا کر بولا۔ "تمہیں اچھا لگا یہ سینٹ؟"

ہاں۔ شبانہ نے بادل نخواستہ کہا۔ حالانکہ جو پرفیوم ظفر نے چلو بھر بھر کر اپنی گردن اور چہرے پر لگا رکھی تھی اس کی وجہ سے بیڈ روم کی فضا بے حد بوجھل ہو رہی تھی اور شبانہ کا سر درد کرنے لگا تھا۔ عقیل بھائی کے سامنے تو ظفر نے پھر بھی شبانہ کے ساتھ نسبتاً بہتر سلوک کیا لیکن جب وہ واپس پاکستان چلے گئے تو ظفر نے شبانہ کے ساتھ نوکروں ایسا سلوک شروع کر دیا۔

وہ بات بات پر شبانہ کو طنز کرتا۔ اس کی تعلیم کا مذاق اڑاتا۔ شبانہ انگریزی پڑھ لکھ سکتی تھی مگر اسے انگریزی میں بات کرنے کی مشق نہیں تھی۔ علاوہ ازیں امریکہ میں بولی جانے والی انگریزی شبانہ کی سمجھ میں کم آتی تھی۔ ظفر طنزیہ لہجے میں کہتا۔ "تم نے پندرہ جماعتیں نقل مار کر پاس کی ہیں کیا فائدہ تمہارے کنیرڈ کالج میں پڑھائی کرنے کا جب تم انگریزی آسانی سے نہیں بول سکتیں۔"

ظفر اپنے رومال اور بنیان قمیض تولیے شبانہ سے دھلواتا۔ وہ اس سے بوٹ بھی پالش کرواتا۔ سوزن کے ہوتے ہوئے بھی شبانہ کی یہ ڈیوٹی لگا دی گئی تھی کہ وہ خود پلنگ پر بستر لگائے۔ پہلے دن شبانہ ٹھیک طرح سے پلاؤ نہ بنا سکی تو ظفر نے مشروب پی کر اسے سخت برا بھلا کہا۔

"تمہیں کسی نے کھانا پکانا نہیں سکھایا؟ کیا کرتی رہی ہو تم اپنے گھر میں؟ بس سرخی پاؤڈر لگا کر گاڑی میں سیر سپاٹے ہی کرتی رہی ہو؟"

ایک رات ظفر نے مشروب پی کر شبانہ کو لاہور والی وہ شام یاد دلائی جب اس نے ظفر کو "شٹ اپ" کہا تھا اور منگنی کی انگوٹھی واپس پھینک کر چلی گئی تھی۔ پہلے تو وہ [illegible] انداز میں بولتا رہا اس کے بعد اس کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ پھر وہ پلنگ سے اتر کر قالین پر بے چینی اور غصے کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ وہ ساتھ ساتھ نفرت بھرے انداز میں بو

جا رہا تھا۔ "اگر اتنا غرور تھا تو پھر باپ سے کہہ دینا تھا کہ وہ مجھ سے دس لاکھ روپے قرض نہ لے۔ میرے ساتھ شادی کرنے سے انکار کیوں نہیں کر دیا پھر؟ کہاں گئی تھی تمہاری وہ اکڑی ہوئی گردن؟"

ظفر شبانہ کی بے عزتی کرتا رہا اور شبانہ سر جھکائے روتی رہی۔ آنسو بہاتی رہی۔ اس پر ظفر غضبناک ہو گیا اس نے شبانہ کو بالوں سے پکڑ کر بستر پر گرا دیا اور اس کی گردن دباتے ہوئے چلایا۔ "آنسو بہا کر مجھے ظالم ثابت کرنا چاہتی ہو؟ ہیں؟ لو لو؟ کیا میں ظالم ہوں؟ فون کروں تمہارے باپ کو لاہور؟"

شبانہ کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ ظفر نے جھٹک کر اسے پرے گرا دیا اور پلنگ کے بجائے نیچے قالین پر ہی چادر بچھا کر لیٹ گیا اور شبانہ کے باپ اور بھائیوں کو برا بھلا کہنے لگا اس نے عامر کو بھی گالیاں دیں کہ اس کے ٹکڑوں پر سان فرانسسکو میں پل رہا ہے۔ شبانہ پلنگ پر بت بنی بیٹھی سب کچھ سنتی رہی۔ وہ اونچی آواز میں رو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کے رونے سے ظفر مشتعل ہو جاتا تھا۔

شبانہ نے اپنا ہونٹ دانتوں تلے دبا رکھا تھا اور اپنی ہچکیوں کو روکے دم سادھے تھی واشنگٹن کی رات آہستہ آہستہ گزر رہی تھی۔ وقت آہستہ آہستہ گزرتا چلا گیا۔ لاہور سے باپ اور بھائی کا خط آتا تو شبانہ جواب میں یہی لکھتی کہ وہ واشنگٹن میں بڑی خوش ہے۔ ظفر اس کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ ہفتے میں دو ایک بار سان فرانسسکو سے عامر بھائی کا بھی فون آ جاتا لیکن شبانہ کو اجازت نہیں تھی کہ وہ عامر کو فون کرے۔ شبانہ کو اذیت دینے کا یہ بھی ایک طریقہ تھا۔

ظفر نے اسے ملازمہ سوزن اور نیگرو خادم سے بھی زیادہ بات کرنے سے منع کر رکھا تھا۔ شبانہ کو صرف اتنی اجازت تھی کہ وہ دن میں ایک آدھ بار قریبی اسٹور میں جا کر سودا سلف خرید لے۔ وہ اکیلی گھومنے پھرنے یا علاقے کے روز گارڈن میں سیر کے لئے بھی نہیں جا سکتی تھی۔ ظفر سارا دن اپنے کاروبار کے سلسلے میں گھر سے باہر رہتا۔ کبھی کبھی وہ آدھی رات کو لڑکھڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوتا۔ شبانہ اسے سنبھالنے کی کوشش کرتی

تو وہ اسے گالیاں دینی شروع کر دیتا۔ ایک رات وہ اپنے ساتھ ایک امریکی عورت کو لے آیا دونوں بیڈروم میں بیٹھے قہقہے لگاتے رہے اور شبانہ کچن میں ان کے لئے ویفر تیار کرتے ہوئے چپکے چپکے آنسو بہاتی رہی۔ پھر ظفر کا یہ معمول بن گیا۔ وہ کسی نہ کسی امریکی خاتون کو گھر میں لے آتا اور شبانہ سے اس کی خدمت کرواتا۔

چھٹیوں میں عامر تین دن کے لئے سان فرانسسکو سے شبانہ کے پاس آیا تو اس کی آنکھوں میں پڑے ہوئے حلقوں کو دیکھ کر بولا۔ "آپی۔ کیا تم بیمار رہی ہو؟"

شبانہ نے مسکراتے ہوئے عامر کے سر کے بالوں میں ہاتھ پھیرا اور بولی۔ "نہیں تو میں بیمار کیوں ہونے لگی؟ ظفر میرا اتنا خیال رکھتے ہیں پھر میں کیوں بیمار ہونے لگی؟"

ظفر کو عامر کا وہاں رہنا پسند نہیں تھا وہ اسے کئی بار کہہ چکا تھا کہ تمہیں وہیں رہ کر پڑھائی کرنی چاہیئے تھی۔ تمہاری پڑھائی بڑی مہنگی ہے۔ تم پر ڈالر خرچ ہو رہے ہیں۔ عامر خاموش رہا شبانہ بھی چپ رہی۔ وہ کوئی جواب نہیں دے سکتے تھے۔ عامر بیچارہ تو صرف تین دنوں کے لئے اپنی بہن کے پاس آیا تھا اور وہ بھی چھٹیوں میں۔ لیکن ظفر نے ایک بار مشروب والی حالت میں عامر کے سامنے بھی شبانہ کی بے عزتی کر دی۔

عامر کو بے حد صدمہ ہوا۔ اگلے روز شبانہ نے عامر سے کہا۔ "ظفر صاحب کبھی کبھی موڈ میں ہوں تو بہک جاتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ تم ان کی باتوں کو دل میں نہ لگانا۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔"

عامر واپس جانے لگا تو شبانہ اسے چھوڑنے انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر گئی۔ اس نے عامر کو ایک طرف لے جا کر کہا۔ "مجھ سے وعدہ کرو کہ جو کچھ تم نے یہاں دیکھا یا سنا ہے اس کا ذکر عقیل بھائی اور ابو جان سے نہیں کرو گے کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ ظفر صاحب مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھی بہک جاتے ہیں اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تم اس کی وجہ سے ابو جان کو پریشان کرو..."

عامر کا چہرہ فکر مند تھا۔ اس نے شبانہ سے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ عامر کا جہاز ٹیک آف کر گیا تو شبانہ نے آنکھیں بند کر کے اپنے پیار سے

بھائی کی سلامتی کی دعا مانگی اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔؟

وقت واشنگٹن میں بھی گزر رہا تھا اور وقت کلکتے میں بھی گزر رہا تھا۔ واشنگٹن میں شبانہ ایک شریف اور وفادار بیوی بن کر دکھ کے دن گزار رہی تھی اور کلکتے میں نجمی ایک طوائف کی حیثیت سے الم انگیز حالات سے گزر رہی تھی۔ خوشی اور سکھ نہ وفادار عورت کے دامن میں تھا اور نہ ہرجائی عورت کی قسمت میں تھا۔ دونوں مختلف ماحول میں اپنی اپنی قسم کے دکھ جھیل رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ شبانہ صبر شکر کر کے بیٹھی تھی جبکہ نجمی کے دل میں اپنے قاتلوں سے خونی انتقام لینے کا لاوا کھول رہا تھا۔

ابھی تک یہ لاوا نجمی کے سینے کے اندر ہی اندر ابل رہا تھا۔ اسے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل رہا تھا۔ اگرچہ نجمی نے وہاں سے فرار ہونے کے خیال کو ایک خاص مدت تک یعنی اپنے دشمنوں سے بھیانک انتقام لینے تک ملتوی کر دیا تھا پھر بھی وہ باہر نکلتی تو لکھی بائی کے آدمی پستول جیب میں چھپائے سائے کی طرح نجمی کے ارد گرد منڈلاتے رہتے تھے۔ لکھی بائی اس لئے بھی نجمی کے بارے میں محتاط تھی کہ بدمعاش موجمدار نے اسے بتا دیا تھا کہ نجمی پاکستان سے اغوا کر کے لائی گئی تھی اور وہ یہاں پاکستانی سفارت خانے میں پناہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتی ہے۔

نجمی لکھی بائی کے لئے لکشمی دیوی بن کر آئی تھی۔ وہ اب تک نجمی کی وجہ سے لاکھوں روپے کروڑ پتی سیٹھوں سے ہتھیا چکی تھی اور اب وہ اس کا سودا بھاری رقم کے عوض کسی راجہ سے کرنے کا خواب دیکھ رہی تھی۔

نجمی کو لکھی بائی دو ایک بار اپنی سوناگاچی والی بیٹھک میں بھی لے گئی۔ اب نجمی گانے بجانے اور مجرا کرنے میں طاق ہو گئی تھی۔ اگرچہ وہ اداکاری کر رہی تھی اور خود اپنے آپ سے الگ ہو کر اپنا مجرا دیکھتی اور گانا سنتی تھی۔ سوناگاچی والی بیٹھک میں کبھی کبھی موجمدار کے علاوہ روپا بدمعاش اس کا ساتھی ہریا، کالی بدمعاش اور ہرلال بھی وہاں آ جاتے تھے۔ یہی لوگ نجمی کی تباہی کے ذمہ دار تھے۔ ان ہی سے نجمی کو انتقام لینا تھا اور وہ ان سے انتقام لینے کی گھڑی کا انتظار کر رہی تھی۔

ایک روز نجمی لکھی بائی کی دوسری کوٹھی میں اپنے کمرے میں رات کے وقت اکیلی بیٹھی تھی کہ اچانک اسے اپنے پہلے محبوب ندیم کی یاد آ گئی۔ ندیم کا چہرہ اس کے سامنے تھا بھولا بھالا، خوبصورت، معصوم چہرہ، ندیم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ نجمی نے سوچا کیوں نہ وہ اسے ایک خط لکھ کر بتا دے کہ وہ کلکتے میں ہے۔ اپنے باپ کے بارے میں نجمی کو پاکستان میں ہی پتہ چل گیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے گھر سے فرار ہونے کے صدمے کی تاب نہ لا کر مر گیا ہے اور سوتیلی ماں اپنے بیٹے کو لے کر لاہور سے چلی گئی ہے۔

لاہور میں نجمی کے دور کے رشتے دار تھے جن کو خط لکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ یہ وہ رشتے دار تھے جو اپنے قریبی عزیزوں کی تباہی پر خوش ہوتے ہیں اور بغلیں بجاتے ہیں اور سر ہلا ہلا کر کہتے ہیں دیکھا ہم نے تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کا انجام یہی ہوگا۔

نجمی کا دل ندیم کو خط لکھنے کے لئے تڑپ اٹھا۔ اسے معلوم تھا کہ پاکستان ڈاک جاتی ہے۔ اس نے اسی وقت پیڈ نکال کر انگریزی میں ندیم کو خط لکھا اور لفافے میں بند کر دیا خط میں اس نے صرف اتنا لکھا۔ "ندیم۔ تم میرا خط پا کر ضرور حیران ہو گے۔ مگر میں زندہ ہوں اور کلکتے میں ہوں اگر کبھی کلکتے آنا ہو تو مجھے ضرور ملنا۔ نیچے اپنا پتہ لکھ رہی ہوں۔ تمہاری بدنصیب نجمی" لفافے پر نجمی نے ندیم کے گھر کا پتہ انگریزی اور اردو دونوں میں لکھ دیا۔

دوسرے روز وہ شاپنگ کرتے ایک اسٹور میں گئی۔ اسے معلوم تھا کہ اس اسٹور میں ڈاک کے ٹکٹ بھی مل جاتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ لکھی بائی کے مسلح غنڈے سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔ کاؤنٹر پر جا کر اس نے فیس کریم اور سرخ بندیا کا ایک پیکٹ خریدا پھر پرس میں سے لفافہ نکال کر کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے کی طرف کھسکاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"میرا ایک کام کر دینا بھائی۔ اس خط پر ٹکٹ لگا کر پوسٹ کر دو۔ یہ پاکستان جائے گا۔"

کاؤنٹر والا نجمی کو جانتا تھا۔ یہ بہاری نوجوان تھا اور نجمی کے ساتھ ہمیشہ خوش اخلاقی

سے پیش آتا تھا۔ اس نے لفافہ لے کر نیچے دراز میں رکھ لیا اور مسکرا کر بولا۔ "میں پوسٹ کر دوں گا چندا بائی۔ تم فکر مت کرو۔"

نجمی نے پرس میں سے سو کا نوٹ نکال کر نوجوان کو دیا اور بولی۔ "اس میں سے ٹکٹ کے پیسے کاٹ کر باقی تم رکھ لینا انکار نہ کرنا۔ یہ میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہی ہوں اور ہاں وہ ساڑھی تو دکھانا۔"

کاؤنٹر نوجوان نے سو کا نوٹ بھی دراز میں رکھ لیا اور خانے میں سے ساڑھی نکال کر نجمی کے آگے پھیلا دی۔ میسور کا کام ہوا ہے اس پر۔ یہ آپ کو خوب سجے گی۔

نجمی نے وہ ساڑھی بھی خرید لی اور واپس چل دی۔ کاؤنٹر والا نوجوان بڑا سچا نکلا۔ اس نے لفافے پر ٹکٹ چسپاں کئے اور دوپہر کی چھٹی کے وقت خود اسکوٹر پر بیٹھ کر ڈاک گھر گیا اور لفافہ پوسٹ کر دیا۔

ندیم شبانہ کے جانے کے بعد بالکل ہی اکیلا رہ گیا تھا۔ کالج میں اب اس کا دل نہیں لگتا تھا۔ نجمی کا خیال ہر وقت اس کے ذہن پر چھایا رہتا۔ وہ اپنے آپ کو اس کی بربادی کا ذمے دار سمجھتا تھا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ نجمی جہاں کہیں بھی ہے قید و بند کی زندگی گزار رہی ہوگی۔ ورنہ وہ ضرور واپس آ جاتی۔ فائنل امتحانات کا وقت آ گیا۔ ندیم نے دو پرچے ہی دیئے تھے کہ ایک روز گھر آیا تو اس کی ماں نے اسے ایک لفافہ دیا۔ "تمہارا خط آیا ہے ندیم۔"

لفافے پر انگریزی اور اردو میں اس کا پتہ لکھا تھا۔ ندیم نے غور سے دیکھا تو ٹکٹ انڈیا کا لگا تھا۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اپنے کمرے میں آ کر اس نے دروازہ بند کیا اور جلدی سے لفافہ پھاڑ کر خط نکالا خط پڑھتے ہی وہ پلنگ پر بیٹھ گیا اور خط کو آنکھوں سے لگا کر رونے لگا۔ اس نے کئی بار خط پڑھا۔ ہر بار اسے آنکھوں سے لگایا۔ نیچے نجمی نے اپنے آپ کو "بدنصیب نجمی" لکھا تھا۔ یہ لفظ ندیم کے دل میں تیر بن کر چبھ گیا تھا نجمی کلکتے کیسے پہنچ گئی؟ وہ وہاں یقیناً دکھی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ندیم کا دل نجمی سے ملنے اس کی مدد کرنے اور اسے واپس پاکستان لانے کو بے تاب ہو گیا۔ اس نے اسی

وقت فیصلہ کر لیا کہ وہ انڈیا جائے گا۔ پاسپورٹ اس کے پاس موجود تھا۔ مگر انڈیا کا ویزا لگنا مشکل تھا۔ اس لئے کہ ندیم کا کوئی رشتے دار یا جاننے والا بھارت میں نہیں تھا۔

ندیم نے ویزے کے لئے تگ و دو شروع کر دی۔ بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ جب تک بھارت میں اس کا کوئی رشتے دار یا دوست فیملی اسے خط لکھ کر نہیں بلائے گی اسے ویزا نہیں مل سکے گا۔ ندیم نے سوچا کہ وہ رات کے اندھیرے میں باڈر کراس کر جائے گا۔ لیکن یہ کام بڑا خطرناک تھا۔ ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد باڈر پر سیکورٹی بے حد سخت کر دی گئی تھی۔

ندیم اسی پریشانی میں تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ زائرین کا ایک گروہ کسی مقدس مقام کی زیارت کے لئے دلی جا رہا ہے۔ اس گروہ کے منتظم صاحب کو ندیم جانتا تھا۔ سیاہ بادلوں میں امید کی سنہری کرن چمکی۔ وہ پاسپورٹ لے کر بھاگم بھاگ منتظم صاحب کے پاس پہنچا اور کہا کہ مجھے بھی اس جماعت میں شامل کر لیجئے۔ میری بڑی حسرت ہے کہ دلی جا کر بزرگان دین کے مزار کی زیارت کروں۔ منتظم صاحب نے ندیم کا پاسپورٹ لے کر اس سے ایک فارم بھروا کر دستخط کروائے اور کہا۔ "تم پرسوں آ کر ملنا۔"

ندیم نے دو دن بڑی الجھن میں گزارے۔ نجمی سے ملاقات کرنے کا یہی ایک موقع تھا تیسرے دن جب وہ منتظم صاحب کے ڈیرے پر پہنچا تو اس کے پاسپورٹ پر دلی کا ویزا لگ چکا تھا۔ ندیم کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی اس نے گھر والوں کو بتا دیا کہ وہ زیارت کے لئے جماعت کے ساتھ دلی جا رہا ہے۔ ندیم نے دل میں یہ عزم کر رکھا تھا کہ وہ دلی پہنچ کر جماعت سے الگ ہو جائے گا اور ٹرین میں سوار ہو کر کلکتہ جائے گا اور نجمی سے مل کر اسے ساتھ لے کر واپس آ جائے گا یا اسے کلکتہ میں پاکستانی قونصلیٹ کی حفاظت میں پہنچا دے گا اور خود دلی واپس آ کر اپنی جماعت میں شامل ہو جائے گا۔ یہ ایک غیر قانونی بات تھی۔ قانونی طور پر ندیم کو دلی ہی میں رہنا تھا۔ لیکن ندیم ہر حالت میں نجمی کو بد نصیبی اور تباہی کے غار سے نکالنا چاہتا تھا۔ جس اقدام کا اس نے فیصلہ کر رکھا تھا اس کے نتائج کی سنگینی سے ندیم بے خبر تھا۔

زائرین کا یہ وفد ایک ہفتے کے لئے بھارت جا رہا تھا۔ ندیم نے ایک اٹیچی کیس میں اپنے کپڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھا اور وقت مقررہ پر گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر منتظم صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ دوسرے زائر حضرات پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دن کے دس بجے یہ قافلہ بھارت کی طرف روانہ ہو گیا۔

ندیم پہلی بار انڈیا جا رہا تھا۔ جب ٹرین انڈیا کی سرزمین میں داخل ہوئی تو ندیم کو یقین ہو گیا کہ اب اسے نجمی سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ دلی میں زائرین کو ایک درگاہ شریف کے قریب ہی کیمپوں میں ٹھہرایا گیا۔ تمام زائرین کے پاسپورٹ ضروری کاغذات منتظم صاحب نے اپنے پاس سنبھال کر رکھ لئے تھے۔ ندیم کا پاسپورٹ بھی ان ہی کے پاس تھا مگر ندیم کو پاسپورٹ کی ضرورت نہیں تھی اگرچہ قانونی طور پر دلی سے باہر نہیں جانا چاہیئے تھا مگر ندیم یہ غلطی کر بیٹھا۔ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے تیسرے دن وہ منہ اندھیرے درگاہ شریف سے نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر سیدھا ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گیا۔ کلکتہ جانے والی گاڑی کے متعلق اس نے کیمپ میں ہی معلومات حاصل کر لی تھیں۔ دلی ریلوے اسٹیشن سے اس نے کلکتہ تک کا تھرڈ کلاس کا ایک ٹکٹ خریدا اور پلیٹ فارم پر آ کر بے تابی سے ٹرین کا انتظار کرنے لگا۔

اس نے محسوس کیا کہ ایک کھدر کے کرتے پاجامے اور صدری والا ادھیڑ عمر آدمی ٹی اسٹال کے پاس کھڑا اسے دیکھ رہا ہے اس آدمی کو ندیم نے اس وقت بھی دیکھا تھا جب وہ کیمپ سے نکل کر سڑک پر آ کر ٹیکسی میں سوار ہو رہا تھا۔ ندیم کو پہلے کبھی اس قسم کے حالات سے واسطہ نہیں پڑا تھا چنانچہ اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ ٹھیک وقت پر ہوڑہ ایکسپریس آ کر پلیٹ فارم پر کھڑی ہو گئی کافی رش تھا ندیم ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر دوسرے مسافروں کے ساتھ بیٹھ گیا۔

وہ درمیان والی قطار میں بیٹھا تھا اس نے گردن گھما کر کھڑکی میں سے باہر پلیٹ فارم پر دیکھا اسے وہ مشکوک آدمی کہیں دکھائی نہ دیا جتنی دیر ٹرین کو وہاں رکنا تھا رکی رہی پھر انجن نے وسل دیا۔ گارڈ نے سیٹی بجائی اور ٹرین چل پڑی۔ غیر شعوری طور پر

ندیم کی آنکھیں ڈبے کے دروازے پر جمی تھیں اس نے اچانک اس کھدر پوش صدری والے مشکوک آدمی کو چلتی ٹرین میں اندر ڈبے میں چڑھتے دیکھا ندیم کا دل کچھ دیر کے لئے زور سے دھڑکا۔ کہیں سی آئی ڈی کا آدمی تو نہیں ہے؟ ٹرین دلی اسٹیشن کے یارڈ سے نکل کر غازی آباد کی طرف جاتے ہوئے رفتار پکڑ رہی تھی۔

ندیم کلکتے پہنچ گیا تھا۔

نجمی نے اپنے خط میں اسے پورا پتہ لکھ دیا تھا۔ یہ خط ندیم کے پاس تھا۔ اس خط پر لکھے ہوئے نجمی کے پتے کو ندیم نے زبانی یاد کر لیا تھا۔ اسٹیشن سے نکلتے ہی ندیم نے ایک خالی ٹیکسی دیکھی اور اس کی طرف بڑھا اس سے پہلے کہ وہ ٹیکسی تک پہنچتا ندیم کو محسوس ہوا کہ ایک آدمی اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ بات ندیم کے لیے کافی پریشان کن تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کلکتے شہر میں اس کا داخلہ غیر قانونی ہے۔ وہ ذاتیت کی ایک جماعت کے ساتھ آیا ہے اور اس کا ویزا صرف دلی تک کے لیے ہے۔ وہ قانونی طور پر دلی سے باہر نہیں جا سکتا لیکن وہ تو آیا ہی نجمی سے ملنے تھا اور نجمی کلکتے میں تھی۔ جو آدمی اس کے پیچھے لگا ہوا تھا اُسے ندیم نے پہلی بار کانپور کے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ ندیم چائے پینے کے لیے کانپور کے اسٹیشن پر اُترا تھا اور وہ ٹی اسٹال کے کاؤنٹر پر کھڑا چائے پی رہا تھا کہ اس کی نظر اس خاص آدمی پر پڑی۔ اس آدمی نے سر پہ گاندھی کیپ پہنی تھی اور کھدر کے کُرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ قد کاٹھ فوجیوں ایسا تھا مگر کندھے جھکے ہوئے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا تھا اور سگریٹ پی رہا تھا۔ جب ندیم کی نگاہ اس پر پڑی تو وہ اسے دیکھ رہا تھا۔ ندیم کو شک ہوا کہ یہ آدمی ضرور سیکریٹ سروس کا ہے اور اس کی نگرانی کر رہا ہے۔ لیکن اگلے دو چار اسٹیشنوں پر وہ ندیم کو پھر دکھائی نہ دیا اس لیے ندیم کو اطمینان ہو گیا کہ اس کا پیچھا نہیں کیا جا رہا۔ لیکن کلکتے پہنچ کر جب وہ ٹیکسی لینے کے لیے بڑھا اور ٹیکسی میں بیٹھنے لگا تو اسے وہی آدمی پھر دکھائی دیا

وہ فٹ پاتھ پر بڑے عاجزانہ انداز میں اس طرح کھڑا تھا جیسے کسی سواری کی تلاش میں ہو اگر ندیم نے اسے کانپور کے اسٹیشن پر اپنی طرف گھور کر تکتے ہوئے نہ دیکھا ہوتا تو وہ کوئی خیال نہ کرتا لیکن ایک تو ندیم غیر قانونی طور پر ایک دشمن ملک میں سفر کر رہا تھا دوسرے اس نے ایک مشکوک آدمی کو دوسری بار اپنے پیچھے لگے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ گھبرا گیا۔ یہ گھبراہٹ قدرتی امر تھا۔ وہ دشمن ملک کے اجنبی شہر میں تھا۔ جب وہ دلی سے ٹرین میں سوار ہوا تھا تو یہ احساس اس کے ذہن پر مسلط ہو گیا تھا کہ وہ کسی وقت بھی پکڑا جا سکتا ہے مگر نجمی کی محبت اسے آگے لیے جا رہی تھی ٹیکسی والے نے ہندوستانی میں پوچھا۔ "بابو کدھر کو جاؤ گے،" ندیم نے پتہ سمجھایا اور جلدی سے ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹیکسی آگے روانہ ہو گئی۔ ٹیکسی گنجان علاقے سے نکل کر کشادہ ..
سڑک پر آئی تو ندیم نے پیچھے سر گھما کر دیکھا..... پیچھے گاڑیاں چلی آ رہی تھیں۔ ندیم نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو تسلّی دی کہ خفیہ محکمے کا کوئی آدمی اس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ یہ شخص اس کا وہم تھا۔ ٹیکسی کشادہ سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی خضر پور جیٹی کے پچھلی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں دور تک سر بفلک عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک جانب دریائے ہنگلی بہہ رہا تھا ندیم پہلی بار ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو سفید دھوتی کرتوں میں ملبوس تھے ان کے رنگ گہرے سانولے اور جسم دُبلے پتلے تھے۔ یہ کلکتے کے بنگالی تھے۔ یہاں اس نے پہلی بار ناریل کے بے شمار درخت دیکھے۔ یہ درخت سڑک کے کنارے کنارے اُگے ہوئے تھے اور بنگلوں کے احاطوں میں بھی لہرا رہے تھے۔ اس نے رنگ برنگ خوبصورت ساڑھیوں میں ملبوس عورتیں بھی دیکھیں جو فٹ پاتھ پر چل رہی تھیں مگر اس کا دل نجمی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ نجمی، جو اس سے کراچی میں جدا ہو گئی تھی جس کی تلاش میں وہ جگہ جگہ مارا مارا پھر رہا تھا جس کی گمشدگی اس کے لیے ایک تکلیف دہ روح فرسا معمہ بنی ہوئی تھی اور جس کے لیے وہ اپنے آپ کو ذمے دار گردانتا تھا۔ نجمی کس حالت میں ہو گی؟ کیسی ہو گی؟ وہ کراچی سے کلکتے کیسے پہنچ گئی؟ کیا وہ جرائم پیشہ لوگوں کے کسی گروہ کے ہتھے چڑھ گئی ہے؟ ندیم نے اپنے دل میں طے کر رکھا تھا کہ وہ نجمی کو یہاں سے ہر حالت میں نکال کر پاکستان لے جائے گا۔ وہ پاکستانی سفارتخانے سے اس کے لیے مدد حاصل کر لے گا اور چاہے خود

پکڑا جائے مگر نجمی کو پاکستانی سفارتخانے ضرور پہنچا دے گا۔
ٹیکسی اس علاقے میں داخل ہو گئی جہاں نجمی رہتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کر دی اور بولا "صاحب ادھر آپ نے بولا تھا،" جگہ ایڈرس کے مطابق تھی۔ ندیم نے ٹیکسی والے کو رخصت کر دیا۔ سامنے ایک بنگلے کا گیٹ نظر آ رہا تھا۔ گیٹ کے اوپر نرسنگ سینٹر کا بوسیدہ بورڈ لگا تھا۔ نجمی نے اپنے خط میں اسی بورڈ کا لکھا تھا۔ ندیم کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ نجمی کا سامنا کیسے کرے گا۔ نجمی ظاہر ہے نارمل حالت میں نہیں ہو گی۔ خدا جانے وہ کن حالات میں یہاں پہنچی ہے اور اس کے ساتھ کیسا کیسا بہیمانہ سلوک ہوتا رہا ہے۔ ان تمام حالات کی ذمّہ داری ندیم پر عائد ہوتی تھی۔
ندیم دھڑکتے دل کے ساتھ بنگلے کے گیٹ کی طرف بڑھا۔ لکڑی کے پُرانے بنچ پر پُرانے چوکیدار بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ندیم نے اس کے پاس جا کر ہندوستانی میں کہا: "مجھے نجمی سے ملنا ہے" چوکیدار نے کہا "ادھر ٹھہرو میں اندر جا کر پتہ کرتا ہوں۔"
چوکیدار اندر چلا گیا۔ ندیم بنچ پر بیٹھ گیا ابھی اس نے ٹیک ہی لگائی تھی کہ ایک جیپ تیزی سے درختوں کے درمیان سے نکل کر اس کی طرف بڑھی۔ جیپ اس کے پاس آ کر رُکی اس میں سے پولیس کے چار مسلح آدمی چھلانگیں لگا کر نکلے اور ندیم کو گھیرے میں لے لیا۔ ندیم ایک دم سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب جو اس نے جیپ کی طرف دیکھا تو وہی کھدر پوش سی آئی ڈی کا آدمی اگلی سیٹ پر سے اُتر کر جیپ کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور ٹکٹکی باندھ کر ندیم کو دیکھنے لگا۔ پولیس کے آدمیوں میں ایک نوجوان ہندو بنگالی انسپکٹر بھی تھا۔ اس نے انگریزی میں ندیم سے پوچھا۔ "تم انگریزی جانتے ہو"؟ ندیم کے منہ سے بے اختیار نکل گیا "ہاں" انسپکٹر نے کہا "تم بنگالی نہیں ہو..... تم پنجابی ہو اور مسلمان ہو..... ہندوستان کے پنجاب میں کوئی مسلمان نہیں ہے تم کہاں سے آئے ہو؟"
ندیم کا ذہن منتشر ہونے لگا۔ چوکیدار نجمی کو بلانے گیا تھا۔ کوئی دم میں نجمی آنے والی تھی اور یہ لوگ اسے گرفتار کرنے کے منصوبے بنا چکے تھے۔ ندیم نے قدرے بوکھلاہٹ میں کہا، "میں پنجابی ضرور ہوں مگر میں مسلمان نہیں ہوں ہندو ہوں۔ ست پرکاش چڈھا میرا

نام ہے۔ میں یہاں اس ٹریننگ سنٹر میں ٹائپ کی مشینیں سپلائی کرتا ہوں۔" بنگالی انسپکٹر نے جیپ کے پاس کھڑے سی آئی ڈی کے آدمی کو دیکھا پھر ندیم کی طرف متوجہ ہو کر بولا "اس کا فیصلہ تھانے میں چل کر ہو گا... تمھیں ہمارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہو گا۔"

ندیم نے دیکھا کہ تینوں کانسٹیبل مسلح تھے اور بنگالی انسپکٹر نے ہولسٹر میں سے پستول نکال لیا تھا۔ ندیم نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور احتجاج کرتے ہوئے بولا "آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے میں ہندو بنگالی ہوں ست پرکاش چڈہ...... آخر آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں" اب سی آئی ڈی والا قریب آ گیا اس نے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پنجابی میں کہا "تم ہمارے قبضے میں آ چکے ہو۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ہتھیار ڈال دو۔"

اس کے ساتھ ہی سپاہیوں نے ندیم پر جیسے ایک دم سے حملہ کر دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور پولیس اسٹیشن کی طرف چل دیئے۔ ندیم کوئی ماہر اور تجربہ کار کمانڈو نہیں تھا وہ پولیس کے آگے بے بس ہو گیا سارے کے سارے مسلح تھے۔ ندیم نے حسرت و یاس کے عالم میں بنگلے کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں تھوڑی ہی دیر بعد اس کی محبوبہ نجمی آنے والی تھی وہ ابھی تک نہیں آئی تھی اور جیپ گھوم کر دوسری سڑک پر چڑھ گئی۔

ندیم کو لے کر تھانے کی گاڑی تھانے کی طرف روانہ ہو گئی۔ نجمی جب اپنے کمرے سے نکل کر بنگلے کے گیٹ پر آئی تو وہاں کوئی نہیں تھا اس کی پیاسی آنکھیں ندیم کو تلاش کر رہی تھیں مگر وہ اسے کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ چوکیدار بھی نجمی کے ساتھ ہی باہر آیا تھا اس نے نجمی کو بتایا کہ اس سے ملنے جو نوجوان آیا تھا وہ تھوڑی دیر پہلے گیٹ کے پاس ہی کھڑا تھا نجمی نے اس سے ایک بار پھر ندیم کا حلیہ پوچھا۔ چوکیدار نے جو حلیہ بتایا وہ ندیم ہی کا تھا۔ ویسے بھی وہ ندیم ہی ہو سکتا تھا نجمی نے ندیم کو خط لکھ کر پاکستان سے بلایا تھا مگر وہ کہاں غائب ہو گیا؟ وہ نجمی سے ملنے اتنی دور سے آیا تھا اسے ملے بغیر کیسے واپس جا سکتا تھا بنگلے کے سامنے والی کچی سڑک دور تک ویران تھی وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس سے نجمی ندیم کے بارے میں پوچھتی۔ اس نے چوکیدار سے کہا "بڑی سڑک تک جا کر دیکھو شاید

صاحب ادھر چلا گیا ہو۔" چوکیدار فوراً بڑی سڑک کی طرف دوڑا۔ نجمی کا دل بے چین تھا: ماغ میں طرح طرح کے پریشان کن خیالات ابھر رہے تھے۔ ندیم کہاں جا سکتا ہے کہیں اسے پولیس نے تو نہیں پکڑ لیا مگر وہ تو اپنے پاسپورٹ پر ویزا لگوا کر آیا ہو گا۔ اچانک نجمی کا دل ڈوبنے لگا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ندیم کو بھارت کا ویزا نہ ملا ہو اور وہ غیر قانونی طور پر انڈیا کا بارڈر کراس کر کے آ گیا ہو۔ سی آئی ڈی کے آدمی اس کے پیچھے لگ گئے ہوں اور یہاں پہنچ کر پولیس نے اسے گرفتار کر لیا ہو۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر ایسی بات ہوئی ہے تو پولیس اس کے پاس بھی تحقیقات کرنے آئے گی۔

لیکن پولیس اتنی احمق نہیں تھی۔ پولیس نے نجمی کے شارٹ ہینڈ ٹائپنگ اسکول والے اس بنگلے کو نوٹ کر لیا تھا اور خفیہ طور پر تحقیقات کرنا چاہتی تھی کہ مشتبہ پاکستانی یہاں کس سے ملنے آیا تھا۔ علاقے کا مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر جانتا تھا کہ اس بنگلے میں بدنام شہرت کی مالک لکھی بائی اڈہ چلاتی ہے۔ انسپکٹر کا لکھی بائی کے ہاں ماہانہ لگا ہوا تھا۔ ماہانہ اپنی جگہ لیکن منجریکر ایک حقیقت شناس پولیس انسپکٹر بھی تھا اور نیشنل سیکورٹی کا معاملہ تھا اسے اچھی طرح علم تھا کہ اگر اوپر افسروں کو علم ہو گیا کہ مشتبہ پاکستانی ملزم کا لکھی بائی کے ڈیرے سے کچھ تعلق یا رابطہ ہے تو بات نہ صرف یہ کہ منجریکر کے ہاتھ سے نکل جائے گی بلکہ اس کا پول بھی کھل جائے گا۔ جس وقت پولیس اسٹیشن کے ایک کمرے میں مرہٹہ انسپکٹر منجریکر یہ سب کچھ سوچ رہا تھا تو ندیم اس حالت میں سامنے اسٹول پر بیٹھا تھا کہ اس کے سارے کپڑے اتروا دیئے گئے تھے اور ایک آدمی نائیلون کی رسی ہاتھ میں لیے اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ انسپکٹر منجریکر سامنے کرسی پر بیٹھا تھا وہ فل وردی میں تھا اور ریوالور اس کی پیٹی کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ یہ حقیقت منجریکر کو معلوم ہو چکی تھی کہ ندیم مسلمان ہے۔ ویسے بھی ندیم نے انسپکٹر منجریکر سے کچھ نہیں چھپایا تھا اس نے نجمی کا نام نہیں لیا تھا اور کہا تھا کہ وہ لاہور کا رہنے والا ہے۔ زائرین کی ایک جماعت کے ساتھ دہلی آیا اور وہاں سے سیر کرنے کے لیے کلکتہ آ گیا تھا کیونکہ اس نے کلکتے کی بڑی تعریف سن رکھی تھی۔ مرہٹے انسپکٹر نے ندیم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا "تم اس بنگلے پر کس سے ملنے گئے تھے؟" ندیم نے جواب دیا "میں اس بنگلے پر کسی سے

ملنے نہیں گیا تھا۔ میں چونکہ اجنبی تھا۔ یہ سوچ کر اس کچی سڑک پر چل نکلا کہ وہ آگے کسی دوسری بڑی سڑک سے جا ملے گی مگر معلوم ہوا کہ آگے بنگلہ آگیا ہے اور سڑک بند ہو گئی ہے میں واپس جانے کی سوچ رہا تھا کہ آپ کے سپاہیوں نے مجھے دبوچ لیا۔ اور یہاں لے آئے" انسپکٹر منجریکر مسکرانے لگا "تم مجھے بہت شریف نوجوان لگتے ہو..... میں تمہارے بیان پر یقین کرتا ہوں... لیکن صرف ایک بات بتا دو کہ یہاں کلکتے میں تمہارے دوسرے ساتھی کون کون ہیں اور کہاں کہاں خفیہ سرگرمیوں میں مصروف ہیں"

ندیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جس بات کا اسے خدشہ تھا وہ درست ثابت ہو رہی تھی۔ ندیم کو پاکستانی جاسوس سمجھا جا رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کے کسی بیان کو درست تسلیم نہیں کیا جائے گا اور تشدد اور ناقابل برداشت اذیتوں کا دروازہ کھلنے والا تھا۔ ندیم نے بھارت میں ایسے بدقسمت نوجوانوں کے اندوہناک واقعات سن رکھے تھے جو باقاعدہ ویزا لے کر بھارت میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آئے اور بھارتی پولیس نے ذرا سے شبہے میں انھیں پکڑ کر بند کر دیا اور پھر ان کا کہیں نام و نشان بھی نہ ملا۔ اس نے کہا "انسپکٹر صاحب میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہاں میں کسی آدمی کو نہیں جانتا۔ میں تو پہلی بار بھارت آیا ہوں صرف کلکتہ دیکھنے کا شوق مجھے یہاں کھینچ لایا ہے ورنہ میں یہاں کبھی نہ آتا۔"

انسپکٹر منجریکر نے سانس بھرا..... ندیم کے پیچھے کھڑے ہٹے کٹے خفیہ پولیس والے ہندو کی طرف دیکھا اور جیب سے سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ خفیہ پولیس والے ہندو نے پلک جھپکتے میں نائیلون کی رسی ندیم کی گردن میں ڈال کر پھرتی سے ایسا بل دیا کہ ندیم کی آنکھیں باہر نکل آئیں اور حلق سے ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے کوئی بکرا ذبح کیا جا رہا ہو۔ انسپکٹر منجریکر نے ہندو سپاہی کو گالی دے کر کہا کہ "پاکستانی کی آواز کیوں پیدا ہو رہی ہے" ہندو سپاہی نے رسی کو دوسرا بل دے دیا اب ندیم کی آواز بالکل نہیں نکل رہی تھی مگر آنکھیں باہر کو مزید ابل پڑی تھیں اور چہرے کی رگیں سرخ ہو کر ایسے پھول گئیں کہ جیسے ابھی پھٹ پڑیں گی۔ انسپکٹر نے سگریٹ کا جلتا ہوا سرا ندیم کی گردن پر رکھ دیا۔ ندیم اچھل کر اسٹول سے نیچے گر پڑا۔ اب منجریکر نے ندیم کو ٹھڈوں سے مارنا شروع کر دیا اس کی گردن میں رسی

ویسے ہی پڑی تھی اور سپاہی اس کے پاس ہی فرش پر بیٹھ گیا تھا۔ ندیم کا جسم جیسے انگاروں پر تڑپ رہا تھا۔ انسپکٹر کے حکم پر ندیم کو دوسرے کمرے یعنی دوسرے عقوبت خانے میں لے جایا گیا۔ یہاں اسے لکڑی کے ایک شکنجے میں اس طرح کس دیا گیا کہ اس کے ہاتھوں اور پاؤں میں رسیاں بندھی تھیں اور رسیاں اسے دونوں طرف سے کھینچ رہی تھیں۔ ندیم کی چیخیں نکل گئیں۔ انسپکٹر منجریکر نے اشارہ کیا سپاہی نے لکڑی کے پہیے پر ہاتھ روک لیا۔ انسپکٹر ندیم کے منہ کے قریب کرسی لے آیا۔ اور سپاہی نے اس کے حکم پر پہیے کو پیچھے گھمایا۔ رسیاں ڈھیلی ہو گئیں۔ ندیم کے بازوؤں اور ٹانگوں کی کھنچی ہوئی ہڈیاں اپنی جگہ پر آ گئیں۔ انسپکٹر نے ندیم سے کہا "دوسروں کی خاطر تم کیوں تکلیف اٹھاتے ہو؟ مجھے صرف تم ان کے نام اور ٹھکانہ بتا دو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارا نام بیچ میں نہیں آئے گا۔ ہم تمہارا ذکر تک نہیں کریں گے۔ میں نہ صرف یہ کہ تمہیں آزاد کر دوں گا بلکہ اپنے آدمی کی حفاظت میں تمہیں دلی تمہاری پارٹی کے پاس پہنچا دوں گا۔"

ندیم کی ہڈی ہڈی دکھ رہی تھی اس کا جسم اکڑ گیا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ پاؤں بالکل نہیں ہلا سکتا تھا۔ اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "میں یہاں کسی کو نہیں جانتا... میں جاسوس نہیں ہوں..... میں بے گناہ ہوں۔" ندیم کی آواز ڈوبتی چلی گئی اور پھر وہ بے ہوش ہو گیا۔ انسپکٹر منجریکر نے دلی کے علاقے کے پولیس اسٹیشن فون کر کے تمام صورت حال معلوم کر لی تھی اسے بتایا گیا تھا کہ زائرین کی جماعت میں سے ندیم نام کا ایک نوجوان غائب ہے اور زائرین اپنے طور پر اسے تلاش کر رہے ہیں اور پریشان بھی ہیں۔ انسپکٹر منجریکر نے دلی پولیس ہیڈ کوارٹر میں خفیہ پولیس کے آئی جی سے رابطہ قائم کیا اور اسے بتایا کہ زائرین کی جماعت میں ایک پاکستانی جاسوس بھی آیا تھا جس کو ہم نے کلکتے میں گرفتار کر لیا ہے۔ جب تک ہمیں اس سے مفید معلومات حاصل نہیں ہو جاتیں ہم اسے کسی حالت میں بھی نہیں چھوڑ سکتے مگر زائرین کی پارٹی تین روز کے بعد واپس جانے والی ہے۔ آئی جی انٹیلیجنس نے مرہٹے انسپکٹر کو فون پر حکم دیا "پاکستانی جاسوس کو دلی پہنچایا جائے یہاں وہ جس کے پاس آیا تھا اس کو بھی گرفتار کر لو پاکستانی ایجنٹ سے پوچھ گچھ ہم کریں گے۔"

انسپکٹر منجر یکھرتے یس سر کہہ کر فون کر دیا۔ دوسرے روز شام کی گاڑی میں ندیم کو سیکورٹی کی پوری ایک گارڈ کی نگرانی میں دلی روانہ کر دیا گیا۔ ندیم پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ اسے بالکل ہوش نہیں تھا کہ اسے کہاں سے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ دلی انٹیلیجنس کے ہیڈ کوارٹر کی عمارت کا ایک تہہ خانہ ندیم کا انتظار کر رہا تھا یہاں صرف فرش پر ایک میلی کچیلی دری بچھی ہوئی تھی اور چھت کے ساتھ ایک بلب جل رہا تھا۔ ندیم کو یہاں پھینک دیا گیا۔ آئی جی انٹیلیجنس ملہوترا کے حکم پر ندیم کی تین دن تک دیکھ بھال کی گئی اسے اچھا کھانا اور طبّی امداد دی گئی۔ چوتھے روز جب ندیم اپنے ہوش و حواس میں واپس آچکا تھا تو ایک سکھ انسپکٹر عام کپڑوں میں تہہ خانے میں داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔ ندیم کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت سے پنجابی میں کہنے لگا" میں جانتا ہوں تم بے قصور ہو..... تمھیں خواہ مخواہ لوگوں نے اپنے جال میں پھنسا لیا ہے تمھاری تو شکل بتا رہی ہے کہ تم جاسوس نہیں ہو۔"

ندیم کی آنکھوں میں آنسو آگئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "سردار جی! ان لوگوں نے مجھ پر بڑا تشدد کیا ہے میں جاسوس نہیں ہوں میں تو دلی سے کلکتہ شہر دیکھنے چلا گیا تھا بس یہی میرا قصور ہے۔"

سکھ انسپکٹر بھاری بھرکم تھا اور اس نے نسواری رنگ کی پگڑی اور واسکٹ کے نیچے نیلے رنگ کی پتلون پہنی ہوئی تھی اس نے ندیم کو تسلّی دی اور کہا "مجھے تو تمھاری شکل دیکھتے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ تم جاسوس نہیں ہو تمھیں خواہ مخواہ پھنسا لیا گیا ہے تم سے پہلے بھی یہاں ایک پاکستانی نوجوان آیا تھا اس کو بھی عیّار لوگوں نے اپنے جال میں اُلجھا لیا تھا مگر ہم نے اُسے فوراً چھوڑ دیا۔ بلکہ اسے بارڈر کراس بھی کرا دیا تھا اس نے ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام اور ایڈریس بتا دیئے تھے مگر قسم ہے واہے گرو کی ہم نے کسی کو اس کا آج تک نام تک نہیں بتایا۔ میں تمھیں بھی اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔"

ندیم نے عاجزی سے کہا۔ "مگر سردار جی! میرا تو کسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں ہے مجھے کسی نے اپنے جال میں نہیں پھنسایا میں تو بالکل بے قصور"

سکھ انسپکٹر مسکراتا رہا اس نے ندیم کے شانے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور اٹھ کر چلا گیا۔ ندیم نے ٹھنڈا سانس بھرا اور سر جھکا لیا۔ وہ کس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اس نے اپنا سر خدا کے حضور جھکا دیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے دعا مانگنے لگا کہ اے خدا میرے گناہ معاف کر دے میں تم سے ہاتھ باندھ کر معافی کی بھیک مانگتا ہوں۔ ندیم دیر تک روتے روتے خدا کے حضور دعائیں مانگتا رہا۔ رات کو اسے بڑا مرغن کھانا دیا گیا۔ ندیم کا اسے ہاتھ لگانے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ آج اسے مرغن کھانا دیا جا رہا ہے اور کل خدا جانے اس کا کیا حال ہوگا اس نے کھانا کھا لیا اور چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے ماں باپ اور بہن کا خیال آگیا اس کی پارٹی واپس جانے والی ہو گی۔ جب وہ اس پارٹی کے ساتھ وطن واپس نہ پہنچا تو اس کے ماں باپ اور بہن کا جو حال ہوگا اس کا ندیم بخوبی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس کی چھٹی حس اسے بتا رہی تھی کہ وہ ایک ایسے دلدلی گڑھے میں گر گیا ہے کہ جہاں سے اس کا باہر نکلنا اب تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ پھر اسے نجمی کا خیال آگیا۔ نجمی کے ساتھ ندیم نے ظلم کیا تھا کہ اسے گھر سے بھگا کر کراچی لے گیا۔ نجمی نے صرف اس کی محبت میں آکر ایسا کیا تھا لیکن اگر ندیم اسے مجبور نہ کرتا تو وہ کبھی گھر سے باہر قدم نہ رکھتی۔ قدرت اب ندیم سے اس ظلم کا بدلہ لے رہی تھی۔ ندیم نے لیٹے لیٹے آنکھیں بند کر کے ہاتھ باندھ لیے اور ایک بار پھر کپکپاتے ہونٹوں اور آنسوؤں بھری پلکوں کے ساتھ خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگا۔

اس پر غنودگی طاری ہونے لگی تھی۔ تین دن کی دیکھ بھال اور اچھی خوراک نے اسے کافی حد تک صحت مند کر دیا تھا۔ اس نے اپنا آپ نیند کی آغوش میں ڈال دیا تھا۔ وہ بمشکل دو تین منٹ ہی سویا ہوگا کہ کسی نے اسے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ اس کے کانوں میں آواز آئی "چلو باؤ جی.... تم سے تمھارا باپ ملنے آیا ہے لاہور سے۔"

ندیم ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اس کے سامنے پھولی ہوئی مونچھوں والا ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ندیم سمجھ گیا کہ تشدد کا نیا مرحلہ شروع ہونے والا ہے۔ اس کا والد لاہور سے یہاں کیسے آسکتا تھا اس نے سر جھکا لیا۔ لمبے تڑنگے آدمی نے اسے بازو سے

پکڑ کر اٹھایا اور دروازے کی طرف دھکیل دیا پھر وہ اسے ساتھ والے تہہ خانے میں لے آیا۔ یہاں ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ دیوار کے ساتھ لوہے کی ایک کرسی لگی ہوئی تھی۔ فرش کے وسط میں لکڑی کا ایک اسٹول پڑا تھا اور اس کے اوپر چھت کے کنڈے کے ساتھ ایک رسّہ لٹک رہا تھا۔ ندیم کو یہ تہہ خانہ پھانسی گھر لگا وہ سہمی ہوئی نظروں سے رسّے کو تکنے لگا۔ مونچھوں والے آدمی نے کہا "یہاں اسٹول پر بیٹھ جاؤ ابھی تمھارا باپ آ کر تم سے ملتا ہے۔"

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ ندیم کا جسم ٹھنڈا ہوتے لگا تھا اس قسم کے حالات سے پہلی بار اس کا پالا پڑ رہا تھا۔ اس کا ذہن سنسنانے لگا۔ ہاتھ پیر جیسے سُن ہو گئے وہ فرش پر بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے دروازہ بند تھا۔ دروازہ کھلا اور اسے بھاری جوتوں کی آواز سنائی دی ندیم نے بے کسی کے عالم میں گردن آہستہ سے گھما کر پیچھے دیکھا۔ آگے آگے پولیس کے حوالدار کی وردی میں ملبوس ایک ناٹے قد کا ادھیڑ عمر آدمی تھا اور اس کے پیچھے دو آدمی تھے جو پاؤں سے ننگے تھے اور جن کے چہروں سے سنگدلی اور درندگی ٹپک رہی تھی۔ حوالدار لوہے کی کرسی دیوار سے ذرا آگے کھینچ کے اس پر بیٹھ گیا۔ دونوں جلاد اسٹول کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ندیم سے رہا نہ گیا۔ اس نے گڑگڑا کر کہا: "اچھا ہے مجھے ایک ہی بار پھانسی کیوں نہ دیدو۔۔۔۔ اس عذاب سے تو نجات مل جائے گی۔"

ادھیڑ عمر حوالدار کے ہاتھ میں بید تھا جس کو وہ آہستہ آہستہ اپنے گھٹنے پر مار رہا تھا۔ اس نے سپاٹ لہجے میں کہا "پھانسی تو ہم اس کو دیتے ہیں جو ہمارا دشمن ہو۔۔۔۔ ہم تمھیں اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ دشمن وہ ہیں جو تمھیں دولت کا لالچ دے کر یہاں لائے ہیں ہم تو صرف انھیں پکڑنا چاہتے ہیں۔" پھر وہ اٹھا ایک جلاد نے لوہے کی کرسی اٹھائی اور جہاں ندیم زمین پر بیٹھا تھا اس کے قریب لا کر رکھ دی۔ ادھیڑ عمر حوالدار اس پر بیٹھ گیا اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ندیم کو دیا اور بولا "لو سگریٹ پیو۔۔۔۔ ہم تمھیں کچھ نہیں کہنا چاہتے یہ رسّہ تو ہم نے ان لوگوں کے لیے لٹکا رکھا ہے جنھوں نے تمھیں دھوکا دے کر کلکتے بلایا تھا"
ندیم نے سگریٹ کا پیکٹ واپس کر دیا اور بے بسی سے کہنے لگا "میں آپ لوگوں کو کیسے یقین

دلاؤں کہ میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں یہاں بالکل اجنبی ہوں مجھے کسی نے یہاں نہیں بھیجا۔" آخری جملہ اس کے منہ میں ہی تھا کہ حوالدار نے ندیم کی کمر پر اتنے زور سے بید کی ضرب لگائی کہ اس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ فرش پر درد کی شدت کے مارے تڑپنے لگا۔ حوالدار اس پر بید برسانے لگا۔ ندیم نے اس کا بید پکڑ لیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا "میں جاسوس نہیں ہوں۔۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔۔۔۔ مجھے نہ مارو۔۔۔۔ مجھے نہ مارو۔۔۔۔"

حوالدار ایک مکروہ عفریت کی طرح اس کے سر پر کھڑا ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنی بید کھینچ لی اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کر کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا دونوں جلادوں نے ندیم کے دونوں پاؤں رسّے سے باندھے۔ دوسری طرف سے رسہ کھینچا اور ندیم چھت کے ساتھ الٹا لٹک گیا۔ یہ اذیت پندرہ بیس منٹ تک جاری رہی۔ ندیم کا سارا خون اس کی آنکھوں اور چہرے پر جمع ہو گیا۔ اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کے جسم کا سارا خون اس کی آنکھوں کے راستے بہنے والا ہے اسے اپنی بینائی غائب ہوتی محسوس ہو رہی تھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور خدا سے موت کی دعائیں مانگنے لگا۔ اب حوالدار کرسی سے اٹھا اور ندیم کی ٹانگوں پر بید کی ضربات لگانی شروع کر دیں۔ ندیم کے جسم میں روح جیسے پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ باہر نکلنے کو بیتاب تھی اسے حوالدار کی آواز سنائی دی۔

"اگر تم ہمیں اپنے ساتھیوں کے نام بتا دو تو ہم تمھیں ابھی نیچے اتار دیں گے۔ بتاؤ کون ہیں وہ لوگ؟ یہاں ان کا ٹھکانا کہاں ہے؟ تمھارا ڈیڈ سپاٹ کلکتہ میں کس جگہ پر ہے؟"

ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس کی گردن جیسے ٹوٹنے لگی تھی۔ ٹانگوں سے سارا خون نکل کر اس کے سر میں جمع ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اسے بید کی ضربوں کا زیادہ احساس نہیں ہو رہا تھا اس کے کانوں میں سیٹیاں بجنے لگی تھیں۔ اسے حوالدار کی آواز بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ ندیم کے بازو لٹکی ہوئی شاخوں کی طرح فرش کی جانب لٹک رہے تھے۔ حوالدار نے ہاتھ روک لیا اور بولا۔

"یہ اس طرح نہیں بولے گا۔ اسے دھرتی ماتا کی گود میں ڈال دو۔"

فوراً اسے کھول دیا گیا۔ ندیم کٹے ہوئے درخت کی طرح بے حس و حرکت فرش پر چت پڑ گیا۔

اسے اپنا جسم لکڑی کی طرح سخت اور برف کی طرح ٹھنڈا محسوس ہو رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف گھسیٹا اور ساتھ والی کوٹھڑی میں لے آئے۔ اس کوٹھڑی کے عین درمیان میں قبر کی طرح کا ایک گڑھا کھدا ہوا تھا جس کے اوپر لکڑی کا تختہ ڈال دیا گیا تھا۔ انھوں نے تختہ اٹھا کر ایک طرف کر دیا اور ندیم کو قبر میں گرا دیا۔ ندیم ایک لاش کی طرح قبر میں گر پڑا۔ اوپر سے فوراً تختہ لگا کر قبر کو بند کر دیا گیا۔ ندیم کی آنکھیں کھلی تھیں۔ قبر میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ جسم کا دوران خون نارمل ہوا تو ندیم نے محسوس کیا کہ قبر اتنی تنگ ہے کہ وہ اپنی ٹانگیں نہیں پھیلا سکتا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔

قبر میں حبس تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد ندیم کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ وہ منہ کھول کر ایسے تیز تیز سانس لینے لگا جیسے ہانپ گیا ہو۔ اب اس پر چیونٹیوں نے حملہ کر دیا۔ شاید اس قبر نما گڑھے میں چینی یا گڑ ڈالا ہوا تھا تاکہ اس پر چیونٹیاں آ جائیں۔ چیونٹیاں ندیم کی قمیض کے اندر پہنچ گئی تھیں اور اسے بری طرح کاٹ رہی تھیں۔ وہ انھیں ہاتھ سے ایک جگہ مارتا تو وہ دوسری جگہ اسے کاٹنے لگتیں۔ گڑھے میں بے شمار چیونٹیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے تھے۔ یہ عذاب ندیم کی برداشت سے باہر تھا۔ اس نے چیخ چیخ کر کہا "مجھے باہر نکالو۔ مجھے باہر نکالو۔"

مگر کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے گڑھے سے باہر نکالنے کے لیے نہیں ڈالا گیا تھا۔ پھر اسے قدموں کے باہر جانے کی آواز آئی اور کوٹھڑی میں سناٹا چھا گیا۔ چیونٹیوں اور کیڑے مکوڑوں کے ساتھ اس کی جنگ جاری تھی۔ چیونٹیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں۔ وہ انھیں مسلنے کی کوشش کرتا اور وہ نہ جانے کہاں سے نکلی چلی آ رہی تھیں۔

خدا جانے کتنی دیر کے بعد ندیم چیونٹیوں کی کافی تعداد کو کچلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اسے صرف اِکا دُکا چیونٹی ہی کاٹتی تھی مگر وہ ایک نئے عذاب میں مبتلا ہو چکا تھا۔ قبر نما گڑھے میں تختے کے ایک باریک سوراخ سے تازہ ہوا کی صرف اتنی مقدار اندر آ رہی تھی کہ ندیم کے پھیپھڑے دھونکنی کی طرح چل رہے تھے کوئی دو گھنٹے کے بعد تختہ اوپر سے ہٹا۔ پھر اسے گڑھے سے باہر نکال دیا گیا۔ ندیم زمین پر اوندھا پڑا ابھی تک ہانپ رہا تھا۔ اُسے اسی حالت میں چھوڑ کر

حوالدار اور دونوں جلاد کوٹھڑی کو تالا لگا کر چلے گئے۔ دلی انٹیلی جنس کے آئی جی ملہوترا نے اس دوران وزارتِ داخلہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ اس نے اس اجازت نامے کے حوالے سے بارڈر سیکورٹی فورس کے چیف کو ہدایت کر دی کہ زائرین کی جو پارٹی واپس پاکستان جا رہی ہے اس میں ایک آدمی کم ہے اور پارٹی سے اس بارے میں کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ کی جائے اور یہ ظاہر کیا جائے کہ جتنے آدمیوں کی نفری گئی تھی اتنے ہی آدمی واپس پاکستان جا رہے ہیں۔۔

دوسری طرف نجمی کی پریشانیوں میں اس وقت مزید اضافہ ہو گیا جب انسپکٹر منجریکر اس سے ملنے لکھی بائی کے خفیہ بنگلے پر آیا۔ نجمی یعنی چندا بھی وہاں موجود تھی۔ نجمی کا دل کہہ رہا تھا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے اس نے مرہٹہ انسپکٹر کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ وہ کسی راز کی بُو پا نے وہاں آیا ہے لکھی بائی نے معمول کے مطابق انسپکٹر منجریکر کی آؤ بھگت کی۔ اسے چائے اور رس گلے پیش کیے اور ادھر اُدھر کی باتیں شروع کر دیں۔ نجمی تخت پر لکھی بائی کے ساتھ بیٹھی چھالیہ کتر رہی تھی۔ یہ تو ہم آپ کو پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ نجمی اس ماحول سے مطابقت تو کسی صورت میں بھی نہیں کر سکتی تھی لیکن اس نے وقتی طور پر اپنے آپ کو لکھی بائی کی مذموم خواہشات کے حوالے کر دیا تھا اور دل میں یہ عزم لیے ہوئے تھی کہ وہ ان تمام مردوں سے عبرت ناک بدلہ لے گی جنھوں نے اسے اس حالت تک پہنچایا تھا۔ ان میں ڈھومل اور ہریا بدمعاش بھی تھے۔

موچھوں والا درندہ صفت بدمعاش موجمدار بھی تھا۔ خضر پور جیٹی کے گواٹھ والا روپا بدمعاش بھی تھا جس نے اسے لکھی بائی کے پاس فروخت کیا تھا اور اس کی عزت سے کھیلتا رہا تھا۔ نجمی کے اندر ہی اندر انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی۔ لاوا کھول رہا تھا۔ یہ آتش فشاں لاوا کسی مناسب موقع کے انتظار میں تھا۔ نجمی کو اب سب سے زیادہ پریشانی ندیم کی تھی جو کلکتہ پہنچنے کے بعد نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ وہ اس سے ملنے اس کے بنگلے تک آیا تھا مگر اس کے بعد خدا جانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا نجمی کو شک تھا کہ اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ان دنوں بھارتی حکومت نے یہ جھوٹا پروپیگنڈہ شروع کر رکھا تھا کہ ہمسایہ ملک سے تخریب کار آ کر بھارت میں دھماکے کر رہے ہیں اور ملک میں انتشار پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ انسپکٹر منجریکر کی زبان سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پولیس کو چوکس کر دیا گیا ہے اور ان پاکستانی تخریب کار جاسوسوں کو پکڑنے کیلئے ملٹری

انٹیلی جینس بھی حرکت میں آگئی ہے۔ انسپکٹر منجریکر پیالی میں چمچ ہلا رہا تھا لکھی بائی اس کے لیے پان لگا رہی تھی۔ نجمی نے چائے بنا کر لکھی بائی کو دی۔ انسپکٹر منجریکر نے چائے کا گھونٹ پی کر کہا۔

"بائی جی! تمھاری چندا چائے بنانے میں استاد ہو گئی ہے۔"

لکھی بائی نے مسکراتے ہوئے کہا "چندا تو اب کھانا بھی بڑا اچھا پکانے لگی ہے کبھی ہمارے ہاں کھانا کھایئے۔"

انسپکٹر منجریکر نے جیسے لکھی بائی کی بات بالکل نہیں سنی تھی وہ نجمی کو مسلسل گھور رہا تھا نجمی کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ کوئی نئی مصیبت آنے والی ہے وہ اپنا پیالہ ہاتھ میں تھامے خاموشی سے چائے پینے لگی۔ انسپکٹر منجریکر نے لکھی بائی سے کہا "لکھی بائی! میں اگر آج رات کے لیے تمھاری چندا کو اپنے ساتھ تھانے لے جاؤں تو تمھیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟"

نجمی کے ہاتھ میں پیالی کانپ گئی۔ لکھی بائی کا ہاتھ بھی پان لپیٹتے لپیٹتے وہیں رک گیا۔ اس نے خشمگیں نظروں سے پولیس انسپکٹر کی طرف دیکھا اور بولی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ چندا کا تھانے میں کیا کام؟ اور پھر اس ماہ کی رقم دوسری تاریخ کو ہی دے دی گئی تھی۔ پھر تم اسے تھانے کیوں لے جاؤ گے؟"

انسپکٹر منجریکر نے ہاتھ بش شرٹ کی جیب میں ڈالا اور ایک سرکاری حکم نامے کی نقل سامنے رکھی اور بولا "مجھے کچھ معلوم نہیں لکھی بائی۔ اسے پڑھ لو۔ یہ آئی جی پولیس کا حکم نامہ ہے انھوں نے چندا کو پولیس اسٹیشن بلایا ہے۔"

لکھی بائی کا تو پارہ چڑھ گیا۔ اس نے انسپکٹر کو سنانی شروع کر دیں کہ وہ ہر پولیس والے کو ماہانہ دیتی ہے پھر اسے کیوں تنگ کیا جاتا ہے۔ کیا اب دلی کے آئی جی صاحب کا بھی ماہانہ لگا دوں؟ چلو یونہی سہی، اس سے پوچھو وہ کیا لے گا؟ میں اس کا بھی بندوبست کر دوں گی۔ انسپکٹر منجریکر اٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے کی طرف جا کر اس نے آواز دی۔ چار مسلح پولیس کے سپاہی اندر آ گئے۔ منجریکر نے کہا "لکھی بائی میں مجبور ہوں۔ یہ ہمارے افسر کا حکم ہے۔ چندا کو میرے ساتھ چلنا ہو گا۔"

اس نے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ سپاہی نجمی کی طرف بڑھے نجمی کی آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے! اس کی نظریں مرہٹہ انسپکٹر منجریکر پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے موت کی فہرست میں انسپکٹر منجریکر کا نام بھی لکھ لیا۔ پولیس نجمی کو اپنے ساتھ باہر لے گئی۔

مرہٹہ انسپکٹر منجریکر نے نجمی کو تھانے میں لے جا کر اپنے کمرے میں بٹھا دیا بظاہر وہ اس کے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آیا اس نے نجمی کے لیے چائے منگوائی اور کہنے لگا "چندا بائی! آئی جی صاحب کے آرڈر کی وجہ سے میں مجبور تھا ورنہ تمھیں یہاں کبھی نہ لاتا۔"

نجمی نے منجریکر کی طرف تجسّس کی نظروں سے دیکھا اور پوچھا "کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے یہاں کس لیے بلایا گیا ہے؟"

انسپکٹر منجریکر نے کندھے سکیڑتے ہوئے کہا "یہ تو آئی جی صاحب ہی جانتے ہیں..... ویسے میرا خیال ہے کہ وہ کلکتے کی رقص و سرود کرنے والیوں کو ذاتی طور پہ کچھ ہدایات دینا چاہتے ہیں۔ کل سوناگاچی کی ایک بائی کو بلایا تھا۔"

نجمی کو انسپکٹر کی باتوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ معاملہ سوائے ندیم کے اور کسی کا نہیں ہو سکتا۔ ان لوگوں نے یقینی طور پر اسے گرفتار کر لیا ہے اسلئے اسے پوچھ گچھ کے لیے بلایا گیا ہے۔ آئی جی وغیرہ کا محض ڈھونگ ہے۔ نجمی خاموشی سے چائے پینے لگی۔ اس نے صرف اتنا پوچھا کہ مجھے یہاں کب تک رہنا ہو گا۔ انسپکٹر منجریکر بولا "بس آئی جی صاحب آتے ہی ہوں گے..... دو منٹ اسی کمرے میں تم سے کوئی بات کریں گے اور ہمارا آدمی تمھیں واپس چھوڑ آئے گا۔"

نجمی چپکی بیٹھی چائے پیتی رہی۔ انسپکٹر منجریکر اٹھ کر باہر نکل گیا۔ نجمی کا دل کسی آنے والے خطرے کو محسوس کر کے معمول کی رفتار سے کچھ زیادہ ہی دھڑکنے لگا تھا کسی لمحے اسے خیال آتا کہ یہ محض اس کا وہم ہے..... ممکن ہے ندیم کو ان لوگوں نے گرفتار نہ کیا ہو وہ خطرے

کی بُو پا کر خود ہی بنگلے کے گیٹ سے کسی طرف فرار ہو گیا ہو.... لیکن ایسی صورت حال اگر ہوتی تو ندیم کو دوسرے دن اس سے ملنے دوبارہ آنا چاہیئے تھا۔ اس کے ساتھ ہی نجمی کو خیال آیا کہ یہ بھی ممکن ہے کہ جو نوجوان اس سے ملنے آیا تھا وہ ندیم نہ ہو۔ اس سے ملتی جلتی شکل والا کوئی دوسرا نوجوان ہو.... اس خیال نے نجمی کے ذہنی تناؤ کو کسی قدر کم کر دیا اس نے اپنے پرس میں سے چھوٹا شیشہ نکال کر اپنے ہونٹوں پر لپ اسٹک کی مزید ہلکی سی تہہ جمائی وہ پرس بند کر رہی تھی کہ انسپکٹر منجریکر کمرے میں داخل ہوا اور آتے ہی بولا۔

"آؤ چندا آئی جی صاحب تمھیں بلا رہے ہیں۔"

چندا اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئی تیسرے پہر کا وقت تھا۔ دفتر خالی خالی سا تھا کہیں کہیں کسی کمرے کے باہر کوئی سپاہی کھڑا دکھائی دے جاتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر چندا کو لے کر برآمدوں سے گزر کر سیڑھیاں اتر کر ایک زمین دوز کمرے میں آ گیا۔ اسی کمرے میں زمین پر ناریل کی چٹائی بچھی تھی اور دیوار کے ساتھ دو کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ "تم کرسی پر بیٹھو آئی جی صاحب ابھی آتے ہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں میری جان انھیں صرف دو ایک ہی باتیں کرنی ہیں تم سے .... میرا خیال ہے کہ اوپر سے کوئی خاص ہدایت آئی ہے۔"

اتنا کہہ کر انسپکٹر کمرے سے چلا گیا۔ نجمی نے کمرے کا جائزہ لیا، ویران ویران سا کمرہ تھا۔ اندھیرے کی وجہ سے دیوار کے ساتھ لگی بریکٹ والا بلب روشن کر دیا گیا تھا۔ نجمی نے خاص بنگالی ریشمی ساڑھی پہن رکھی تھی جس کا بارڈر جامنی رنگ کا تھا ماتھے پر تلک بھی لگا رکھا تھا۔ کمرے میں اکیلی بیٹھے بیٹھے دس پندرہ منٹ گزر گئے تھے کہ اسے جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔ نجمی سمٹ کر بیٹھ گئی۔ یہ انسپکٹر منجریکر تھا اس نے ہاتھ میں خاکی رنگ کا ایک لفافہ تھام رکھا تھا۔ لفافہ اس نے نجمی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آئی جی صاحب کو ایک ضروری میٹنگ میں جانا پڑ گیا ہے انھوں نے تمھارے لیے یہ خط بھیجا ہے اس میں وہ تمام باتیں لکھی ہیں جو وہ تم سے کرنا چاہتے تھے۔" نجمی ابھی تک بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکی تھی اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اٹھنے لگے تھے۔ لفافہ بند تھا انسپکٹر منجریکر کرسی کھینچ کر بالکل اس کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

"کھول کر پڑھ لو..... بنگلہ میں لکھا ہے تم بنگلہ پڑھ لیتی ہو۔"

نجمی نے لفافے کو کھولا اس میں ایک سفید کاغذ تہہ کیے ہوئے تھا اس نے کاغذ باہر نکال کر کھولا تو اندر سے ایک تصویر نیچے اس کے دامن پر گر پڑی نجمی نے تصویر اٹھا کر دیکھی تو اس کا دل اچھل کر اس کے حلق کے قریب آ گیا۔ یہ ندیم کی تصویر تھی۔ انسپکٹر منجریکر نے یہ تصویر خاص طور پر تھانے میں اس وقت اتاری تھی جب ندیم کو پہلی بار وہاں لایا گیا تھا اور شدید تشدد کے بعد وہ بے ہوش ہو گیا تھا تصویر میں ندیم فرش پر بیہوش پڑا تھا۔ انسپکٹر نے اپنی نگاہیں نجمی کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں اس نے وہ بات نجمی کے چہرے پر پڑھ لی تھی جو وہ پڑھنا چاہتا تھا قدرتی طور پر ندیم کی بے ہوشی کی حالت میں لی گئی تصویر کو دیکھتے ہی نجمی کا اوپر کا سانس اوپر رہ گیا اور اس کے منہ سے حیرت اور درد کی ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس کے ساتھ ہی نجمی کو احساس ہو گیا کہ اس سے شدید غلطی ہو گئی ہے۔ انسپکٹر منجریکر نے سنجیدہ آواز میں پوچھا "چندا یہ آدمی تم سے کس سلسلے میں ملنے آیا تھا؟" نجمی ساری بات سمجھ گئی تھی اس سے ایک غلطی بھی ہو گئی تھی۔ اب لے دے کے اپنے آپ کا بچاؤ کرنا تھا، ندیم کا بچاؤ کرنا تھا۔ اس نے تصویر کو انسپکٹر کی گود میں پھینکتے ہوئے کہا۔

"مجھے کیا معلوم کہ یہ کون ہے میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا اگر یہ آیا بھی ہو گا تو میں ایک ناچنے گانے والی ہوں میرے بنگلے پر کوئی بھی اپنی جیب میں چاندی کے سکے ڈال کر آ سکتا ہے۔"

انسپکٹر نے ندیم کی تصویر کو نجمی کی آنکھوں کے سامنے کر دیا اب اس کی آواز میں کرختگی اور تحکم تھا۔

"چندا یہ مت بھولو کہ تم کہاں بیٹھی ہو۔ میں تمھیں یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس وقت تم پاکستانی جاسوسوں کے گروہ سے ساز باز رکھنے کے الزام کی زد میں ہو اور یہ کس قدر شدید اور خطرناک جرم ہے اس کا اندازہ شاید تمھیں نہیں ہے .... تمھارے حق میں یہی بہتر ہے کہ مجھے راز داری میں لیتے ہوئے میرے کان میں بتا دو کہ یہ آدمی تمھیں کس سلسلے میں ملنے آیا تھا اور اس کے دوسرے ساتھی شہر میں کہاں مقیم ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر تم نے صاف بیانی سے کام لیا تو میں تمھیں اس سنگین کیس میں سے ایسے باہر نکال لوں گا جیسے کوئی مکھن میں سے بال نکال لیتا ہے۔" نجمی اب کوئی چھوٹی موٹی قسم کی گھریلو عورت نہیں تھی وہ کئی پتن تیر چکی تھی۔ کئی گڑھوں کھڈوں اور دلدلوں میں گر کر ابھر چکی تھی اس پر اس قدر تشدد ہو چکا تھا کہ اس کا بدن اب اس تشدد

کا عادی ہو گیا تھا اور پولیس کا تشدد اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا اسے اگر کوئی خیال تھا تو صرف یہ کہ ندیم کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائے۔ اس نے انسپکٹر منجریکر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا "انسپکٹر تم مجھے بے وقوف بنا کر خواہ مخواہ اس کیس میں الجھانے کی کوشش مت کرو... میں تم ایسے کئی پولیس افسروں کو بھگت چکی ہوں۔ میں نے ایک بار تمھیں کہہ دیا ہے کہ میں اس آدمی کو بالکل نہیں جانتی۔"

انسپکٹر منجریکر بھی کوئی اناڑی پولیس آفیسر نہیں تھا وہ چندا کو بھی ایک عرصے سے جانتا تھا وہ جس علاقے میں لکھی بائی کے ساتھ رہتی تھی انسپکٹر اس علاقے کی ساری اونچ نیچ اور وہاں کے رہنے والوں اور والیوں کی نفسیات سے واقف تھا اس نے چندا کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پیار سے بولا "تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ تم نے جو کہا ہے میں اسے مان لیتا ہوں چلو چھٹی ہوئی بات ختم کرو میں تمھارے لیے چائے منگواتا ہوں۔" نجمی اٹھ کھڑی ہوئی۔
"شکریہ... میں بہت چائے پی چکی ہوں اب میں واپس جاؤں گی۔"

نجمی نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اس نے قدم بڑھایا ہی تھا کہ انسپکٹر منجریکر نے اتنے زور سے اُلٹے ہاتھ کا تھپڑ نجمی کے رخسار پر مارا کہ اس کی آواز سے کمرے کی فضا گونج اٹھی اور نجمی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور ناریل کی چٹائی پر جا گری۔ انسپکٹر منجریکر نے گالیوں اور ٹھوکروں کی بوچھاڑ کر دی۔ نجمی کے بال بکھر گئے پرس دور جا گرا وہ بوکھلا گئی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ انسپکٹر کے ٹھڈوں سے اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ انسپکٹر اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا کمرے کے کونے میں لے گیا اور اسے دیوار کے ساتھ دھکیلتے ہوئے گالی دے کر بولا "تم پاکستانی جاسوس ہو... تمھارا پاکستانی جاسوسوں سے گہرا رابطہ ہے۔ تم بھارت دیش کی دشمن ہو... ہمارے پاس ثبوت موجود ہیں جو تمھیں پھانسی کے تختے تک لے جا سکتے ہیں... تم اپنے آپ کو کیا سمجھتی ہو۔"

نجمی چہرہ ہاتھوں میں چھپائے بے اختیار رو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا مگر ابھی تک وہ ایک نازک عورت ضرور تھی۔ اس کے سینے میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی مگر نازک جسم ضربات کی چوٹوں سے درد بھی کر رہا تھا اور آنکھیں ذلت کے احساس سے اشکبار بھی تھیں۔ اس نے ساڑھی کے پلّو

سے اپنے آنسو پونچھے اور انسپکٹر کی طرف شعلہ بار آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا "تم جتنا چاہے مجھ پر ظلم کر سکتے ہو... لیکن جو بات مجھے معلوم نہیں وہ میں تمھیں کیسے بتا سکتی ہوں۔ میں عدالت میں بھی یہی کہوں گی کہ میں اس آدمی کو نہیں جانتی... نہیں جانتی۔"

انسپکٹر منجریکر نے نجمی کو ایک اور بھرپور تھپڑ رسید کیا۔ نجمی کی چیخ نکل گئی: "حرامزادی! عدالت میں لے جانے سے پہلے تمھیں پولیس کے ریمانڈ کا سامنا کرنا ہو گا اور تم خوب جانتی ہو کہ ریمانڈ کے نام سے بڑے بڑوں کا کلیجہ دہل جاتا ہے۔"

نجمی کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس ہندو مرہٹہ انسپکٹر کا چہرہ نوچ لے، اس کی گردن پھاڑ کر اس کا خون پی جائے، اس کے جسم کے پرزے اڑا دے مگر وہ ابھی مجبور تھی ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا جب وہ ایسا کر سکتی تھی۔ بہرحال نجمی نے اپنے دل میں اس ہندو مرہٹے انسپکٹر کا نام لکھ کر نیچے سرخ نشان لگا دیا تھا۔ جب وہ وقت آیا جس کا نجمی کو انتظار تھا تو وہ سب سے پہلے اس مرہٹے کو اپنے انتقام کا نشانہ بنائے گی۔ ایک بار نہیں کئی بار اس سے انتقام لے گی۔ عبرتناک اور رونگٹے کھڑے کر دینے والا انتقام... نجمی کے اندر ایک بھیانک خوفناک اور پتھر کے دل والی قاتلہ پروان چڑھ رہی تھی۔ باہر سے کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ انسپکٹر نے وہیں سے چلا کر پوچھا "کون ہے؟" باہر سے کانسٹیبل کی آواز آئی "سر ایک منٹ کے لیے تشریف لائیے"۔ انسپکٹر منجریکر اپنی وردی کو ٹھیک کرتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔ باہر کانسٹیبل مراری بھٹنا گر کھڑا تھا وہ انسپکٹر کو ایک طرف لے گیا اور بولا "سر لکھی بائی اپنے وکیل کو ساتھ لے کر آئی ہے میں نے اسے برآمدے میں بٹھا دیا ہے۔"

انسپکٹر منجریکر نے جیب سے کنگھی نکال کر اپنے بالوں میں پھیری اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ دروازے کو تالا لگا دے اور سیڑھیاں چڑھ کر اوپر برآمدے میں سے گزرنے لگا جب وہ اپنے آفس والے برآمدے میں آیا تو اس نے دیکھا کہ لکھی بائی سفید ساڑھی میں ملبوس بنچ پر بیٹھی ہے اس کا بنگالی وکیل ساتھ میں ایک فائیل لیے پاس ہی کھڑا ہے۔ انسپکٹر منجریکر کو آتے دیکھ کر لکھی بائی اٹھ کھڑی ہوئی اس کا چہرہ غصّے سے بھرا ہوا تھا۔ وکیل نے انگریزی میں کہا "انسپکٹر میں دویکا ناتھ ایڈووکیٹ ہوں آپ نے میری موکلہ چندا کو حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے میں اپنی موکلہ کی مختار کو ساتھ لایا ہوں۔ وہ آپ کے خلاف آپ کے تھانے میں مقدمہ درج کروانا چاہتی ہیں۔"

انسپکٹر منجر یکر نے غور سے وکیل کی طرف دیکھا، پھر آہستہ سے کہا "پلیز میرے ساتھ اندر تشریف لے آئیں، تم بھی لکھی بائی ..... " کمرے میں آنے کے بعد جب وکیل اور لکھی بائی کرسیوں پر بیٹھ گئے تو انسپکٹر نے اپنی کرسی سنبھالتے ہوئے کہا "مسٹر ایڈووکیٹ آپ کو معاملے کی سنگینی کا علم نہیں ہے۔"

اس پر لکھی بائی پھٹ پڑی "تم کون ہوتے ہو میری بچی کو بند کرنے والے .... آئی جی صاحب نے بلایا ہے تو چلو مجھے آئی جی صاحب کے پاس لے چلو .... میں خود ان سے پوچھتی ہوں کہ ہمارا کیا جرم ہے .... کیا ہم ٹیکس ادا نہیں کرتے؟ کیا ہم اپنے لائسنس کی فیس ہر بار سرکاری خزانے میں جمع نہیں کرواتے؟ کیا قصور کیا ہے میری بچی نے؟"

انسپکٹر منجر یکر نے ہاتھ کے اشارے سے لکھی بائی کو خاموش رہنے کے لیے کہا۔ بنگالی وکیل نے رومال سے اپنے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ صاف کرنے کے بعد کہا "انسپکٹر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میری موکلہ کو کس سیکشن کے تحت گرفتار کر کے لایا گیا ہے اور اسے یہ کیوں کہا گیا ہے کہ اسے آئی جی نے بلایا ہے .... کیا میں آئی جی صاحب کا سرکاری حکم نامہ دیکھ سکتا ہوں؟" انسپکٹر منجر یکر جو کچھ کر رہا تھا کلکتہ کے آئی جی پولیس کی ہدایت کے مطابق ہی کر رہا تھا کئی دنوں سے لکھی بائی کے بنگلے کی خفیہ پولیس نگرانی کر رہی تھی۔ انسپکٹر منجر یکر نے آئی جی پولیس کو اعتماد میں لینے کے بعد ہی یہ قدم اٹھایا تھا۔ معاملے کی نوعیت چونکہ سنگین تھی اور اس میں نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ملوث تھا اس لیے آئی جی پولیس نے انسپکٹر منجر یکر کو ہر قسم کا اختیار دے دیا۔

انسپکٹر منجر یکر نے وکیل کی طرف متوجہ ہو کر کہا "مسٹر ویکا ناتھ! آپ کو ابھی تک علم نہیں ہے کہ آپ جس موکلہ کی وکالت کرنے یہاں آئے ہیں وہ صرف ایک پاکستانی ایجنٹ ہی نہیں بلکہ اس کا بھارت میں مقیم پاکستانی جاسوسوں کے ایک ایسے گروہ سے تعلق ہے جو ایک عرصے سے یہاں ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ یہ معاملہ کس قدر سنگین ہے آپ اس کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور میں یہ بھی آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ چونکہ یہ نیشنل سیکورٹی اور بھارت کی سلامتی کا مسئلہ ہے اس لیے مجھے حکومت کی جانب سے پورے اختیارات حاصل ہیں اور میں آپ کو اور لکھی بائی کو بھی پاکستانی جاسوسہ کی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار کر سکتا ہوں۔"

بنگالی وکیل کے تو ہوش اڑ گئے اس کو پسینہ آ گیا۔ لکھی بائی بھی ایک دم جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ اصل معاملہ کیا ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا۔ پاکستانی جاسوسوں کا نام سن کر وہ کانپ گئی تھی۔ کسی بھی ملک میں یہ سب سے سنگین الزام ہوتا ہے اور اس الزام کے تحت پولیس کا محکمہ کوئی بھی قدم اٹھا سکتا ہے۔ لکھی بائی ایک تجربے کار نائیکہ ہی نہیں تھی بلکہ اس قسم کے قانونی نکتوں سے بھی بخوبی واقف تھی۔ وکیل نے تو اپنی فائیل میز پر سے اٹھا لی اور معذرت طلب لہجے میں بولا "آئی ایم سوری انسپکٹر! میری موکلہ نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی .... یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور ہے میں اس کیس سے دستبردار ہوتا ہوں لکھی بائی .... شکریہ انسپکٹر آپ نے مجھے ایک سنگین غلطی سے بچا لیا۔"

وکیل نے فائیل بغل میں دبائی اور گڈ بائی کہہ کر کمرے سے نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی لکھی بائی نے ہاتھ باندھ لیے اور عاجزی سے بولی "بیٹا اگر یہ بات تھی تو تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا؟ میں خود چندا کو تمھارے پاس لے آتی۔ ہم لاکھ بُرے سہی لیکن اپنے دیش پر آنچ آتے کبھی نہیں دیکھ سکتے لیکن کیا یہ سچ ہے کہ چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں سے ہے؟ کہیں ایسی بات تو نہیں ہے کہ کوئی پاکستانی جاسوس اس کا گانا سننے آ گیا ہو اور خفیہ والوں نے یہ سمجھ لیا ہو کہ چندا کا ان لوگوں سے کوئی خاص تعلق ہے؟ بیٹا! چندا مجھے ایسی لڑکی نہیں لگتی .... میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔" لکھی بائی کا دل نہیں مانتا تھا کہ چندا کا جاسوسوں سے کوئی تعلق یا رابطہ ہے۔ یہ اسے معلوم تھا کہ چندا اصل میں پاکستان کی رہنے والی ہے اور اسے وہیں سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان اور پھر وہاں سے بھارت لا کر فروخت کر دیا گیا تھا لیکن چندا ایک عرصے سے لکھی بائی کے پاس رہ رہی تھی اگر اس کا تعلق جاسوسوں کے کسی گروہ سے ہوتا تو یہ بات لکھی بائی سے چھپی نہ رہ سکتی تھی۔ چندا چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہتی تھی اور لکھی بائی ایک جہاندیدہ عورت تھی وہ آدمی کی چال سے اس کے دل کا حال معلوم کر لیتی تھی چنانچہ اب وہ عیاری اور چاپلوسی سے کام لے کر چندا کو کسی طرح اس سنگین الزام سے بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔

انسپکٹر منجر یکر نے لکھی بائی کو اعتماد میں لیتے ہوئے کہا "لکھی بائی! میں جانتا ہوں کہ تمھارا ان ملک دشمن عناصر سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن چندا کے ملوث ہونے کے بارے میں ہمیں کچھ ثبوت ملے

ہیں چنانچہ اب ہم چندا سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھ گچھ کر رہے ہیں جو بھارت میں باڈر پار سے آکر تخریب کاری کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں یہ بھی ممکن ہے کہ یہ لوگ یہاں ہمارے بڑے بڑے راشٹریہ کے لیڈروں کو ہلاک کرنے کے لیے ٹریننگ دے کر یہاں بھیجے گئے ہوں گے۔"

لکھی بائی الجھن میں پڑ گئی تھی۔ چندا سے اس کا خون کا کوئی رشتہ نہیں تھا وہ اس میں صرف اس لیے دلچسپی لے رہی تھی کہ ایک رجواڑے کے راجکمار نے چندا کے عوض لکھی بائی کو بھاری معاوضہ دینے کی پیشکش کی تھی۔ لکھی بائی کو کئی نئی لڑکیاں آسانی سے مل سکتی تھیں اور اس کے پاس کئی لڑکیاں موجود بھی تھیں مگر چندا ایسی حسین اور دلکش خدوخال کی لڑکی بڑی مشکل سے ملتی تھی لکھی بائی چندا کو آسانی سے ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتی تھی اس نے کہا، "لیکن بیٹا منجریکر تمھارے پاس کیا ثبوت ہے کیا تم مجھے نہیں بتاؤ گے؟"

انسپکٹر مسکرایا۔ کہنے لگا، "لکھی بائی میں تمھیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ ہم نے ایک پاکستانی جاسوس پکڑا ہے جس نے چندا بائی کا نام لیا ہے اور جو اس سے ملنے تمھارے دریائے ہگلی والے پرانے بنگلے پر آیا تھا۔"

لکھی بائی نے کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور بولی "ہے بھگوان! یہ میں کیا سن رہی ہوں ...... میری چندا کو یہ کیا ہوگیا۔ بیٹا میں پھر بھی کہوں گی کہ چندا بڑی بھولی ہے .... وہ کسی کے بہکاوے میں آگئی ہوگی۔ تم اسے میرے ساتھ کردو میں اس سے سب کچھ پوچھ لوں گی .... وہ مجھے بتا بھی دے گی اس نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں چھپائی۔" انسپکٹر منجریکر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "نہیں بائی جی! آئی ایم سوری .... میں چندا کو ابھی تمھارے ساتھ نہیں بھیج سکتا ہمیں اپنی کارروائی پوری کرنی ہے۔ یہ نیشنل سیکورٹی کا معاملہ ہے لیکن میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چندا نے ہمیں پاکستانی جاسوسوں کے نام اور ٹھکانے بتا دیئے تو میں اسے وعدہ معاف گواہ بنانے کی بھرپور کوشش کروں گا۔ اب تم جا سکتی ہو مجھے ایک ضروری میٹنگ میں جانا ہے۔"

یہ کہہ کر انسپکٹر منجریکر نے میز پر سے اپنی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور کمرے کی چق اٹھا کر باہر نکل گیا۔ لکھی بائی مایوسی کے عالم میں کچھ دیر وہیں گم سم ہو کر بیٹھی رہی۔ کئی لاکھ کی رقم اس کے ہاتھ سے یونہی جا رہی تھی اس سے بہتر تھا کہ وہ پچھلے ماہ ہی چندا کو راجکمار کے حوالے کرکے اس سے رقم وصول

کرلیتی اس کے بعد جو کچھ ہوتا راجکمار کی ذمہ داری ہوتی کم از کم وہ تو اپنی رقم وصول کرچکی ہوتی۔ اب بھی لکھی بائی اتنی آسانی سے یہ نقصان برداشت کرنے والی نہیں تھی روپیہ اس کا دیوی دیوتا تھا۔ روپے کی خاطر اس نے اپنی عزت کا سودا کیا تھا اور دوسروں کی عزتوں کے سودے کرتی رہی تھی۔ زندگی بھر اس نے روپے ہی کی پوجا کی تھی پھر وہ اتنا بڑا نقصان بھلا کیسے برداشت کرسکتی تھی اگرچہ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ جاسوسی کے سلسلے میں خود بھی نہ کہیں اُلجھ جائے۔ مگر لکھی بائی کی پہنچ اوپر بڑی دور دور تک تھی اس نے فیصلہ کرلیا کہ وہ چندا کو اس گڑھے سے نکالنے کی بھرپور کوشش ابھی سے شروع کردے گی۔

لکھی بائی امید و بیم کے عالم میں واپس اپنے بنگلے پر آگئی۔ وہاں کملا اور کرشنا موجود تھیں اور اس کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی۔ لکھی بائی نے چندا پر لگائے گئے جاسوسی کے الزام کے بارے میں کوئی بات نہ کی بس اتنا ہی کہا کہ پولیس اس سے زیادہ پیسے مانگ رہی ہے اس نے فوراً ہی اپنے کمرے میں جاکر اعلیٰ افسروں سے رابطہ قائم کرنا شروع کردیا۔ وہ بڑی عقلمندی سے بات کرتی معاملے کی سنگینی کو وہ خوب جانتی تھی جس اعلیٰ آفیسر یا وزیر سے اس نے بات کی یہی موقف اختیار کیا کہ چندا کو محض اس لیے پکڑا گیا ہے کہ میں پولیس کو خوش نہیں رکھتی۔ ہر اعلیٰ آفیسر نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی مدد کرے گا بعض بنگالی آفیسرز کو کیس کی نوعیت کا علم تھا وہ جانتے تھے کہ لکھی بائی کی مدد کرنا ان کے بس میں نہیں ہے لیکن وہ لکھی بائی کو ناراض بھی نہیں کرسکتے تھے چنانچہ انھوں نے بھی یہی وعدہ کیا کہ وہ اس کی خاطر اپنی جان لڑا دیں گے۔

دوسری طرف منجریکر نے آئی جی سے مشورہ کرنے کے بعد نجمی کو کلکتہ سنٹرل جیل کے خصوصی زنانہ وارڈ میں منتقل کردیا۔ نجمی پر اب تشدد نہیں کیا جاتا تھا اسے الگ کوٹھری میں رکھا گیا تھا اور اسے کھانے پینے کے لیے مناسب غذا دی جا رہی تھی اس حسن سلوک کی وجہ اصل میں یہ تھی کہ انسپکٹر منجریکر نے آئی جی سیکرٹ پولیس سے مل کر ایک خاص منصوبہ تیار کیا تھا منصوبہ یہ تھا کہ نجمی اور پاکستانی جاسوس ندیم کی اچانک ملاقات کروائی جائے پھر اس کا ردعمل دیکھا جائے اور جو کچھ وہ باتیں کریں اُن کو ٹیپ کرلیا جائے۔ قدرتی بات تھی کہ ان لوگوں کو ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا۔

اس منصوبے کے تحت سینٹرل جیل میں ندیم کے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا جانے لگا۔ ان معنوں

میں اسے مناسب غذا ملنا شروع ہوگئی تاکہ جب وہ نجمی سے ملے تو اس حالت میں ہو جس حالت میں وہ اسے ملاقات کرنے اُس کے بنگلے پر گیا تھا۔ ایک ہفتے بعد ندیم کو سیکورٹی گارڈ کی انتہائی سخت نگرانی میں دلی سے کلکتہ لاکر جیل کی ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ندیم یہی سمجھ رہا تھا کہ اس پر کلکتہ میں مقدمہ چلایا جا رہا ہے اب اسے اپنے ماں باپ اور بہن کا خیال زیادہ... ستانے لگا تھا۔ نجمی کا غم تو اس کی جان کو اس وقت سے لگا ہوا تھا جب سے وہ کراچی سے غائب ہوئی تھی۔ لیکن اب ہر وقت وہ یہ سوچ کر پریشان رہتا کہ اس کی جدائی میں اس کے ماں باپ کا کیا حال ہو رہا ہوگا پھر اسے خیال آتا کہ انھوں نے حکومت کو اس کے بھارت سے واپس نہ آنے کے بارے میں ضرور درخواست دی ہو گی شاید حکومت اس کو رہا کروانے کیلئے کوشش کرے۔

دوسری جانب نجمی زنانہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھی یہ سوچ رہی تھی کہ ندیم کی جو اسے تصویر دکھائی گئی تھی اس میں وہ بیہوش پڑا تھا۔ ان لوگوں نے اس پر بڑا تشدد کیا ہوگا۔ نجمی کا دل بار بار بھر آتا مگر وہ ندیم کے لیے کچھ نہ کر سکتی تھی وہ خود مصیبت میں پھنس چکی تھی۔ اسے زنانہ جیل میں آئے چار پانچ دن گزر چکے تھے۔ ایک روز صبح کے وقت انسپکٹر منجریکر پولیس کی بند گاڑی میں اپنی گارڈ کے ساتھ زنانہ جیل میں داخل ہوا۔ اس نے چندا کو ساتھ لیا اور یہ کہہ کر جیل کے اے کلاس والے وارڈ کی طرف چل پڑا کہ لکھی بائی اس سے ملاقات کرنے آئی ہے۔ اے کلاس وارڈ میں دو کوارٹر نما کمرے تھے۔ ایک کمرے میں پلنگ، میز کرسی وغیرہ لگی تھی۔ انسپکٹر منجریکر نے چندا کو کمرے میں بٹھایا اور بولا "میں لکھی بائی کو بھیجتا ہوں.... مگر ملاقات کا وقت زیادہ نہیں ہے۔"
نجمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ انسپکٹر منجریکر کی شکل تک دیکھنے کی روادار نہیں تھی۔ نجمی کے ساتھ کچھ روز سے کوئی تشدد نہیں کیا گیا تھا اور اسے خوراک بھی ٹھیک ٹھاک مل رہی تھی لیکن وہ قید میں تھی۔ ایک کوٹھڑی میں اسے مسلسل رکھا جا رہا تھا۔ اسے شام کے وقت ایک گونگی بہری عورت کے ساتھ کوٹھری سے باہر نکال کر تھوڑی دیر ٹہلنے کی اجازت تھی۔ گونگی بہری عورت کے ساتھ بات کرکے وہ اپنے دل کا تھوڑا سا بوجھ بھی ہلکا نہیں کر سکتی تھی۔

لکھی بائی سے ملاقات کا سن کر اسے خوشی ضرور ہوئی تھی کہ شاید اس نے نجمی کی ضمانت کا کوئی بندوبست کر لیا ہو۔ وہ پلنگ پر بیٹھی اس اے کلاس کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ یہ کمرہ جیل

کی کوٹھڑی سے بہت مختلف تھا یہاں ضرورت کی ہر شئے موجود تھی۔ باتھ روم بھی ساتھ ہی تھا چھت کے ساتھ پنکھا بھی لگا ہوا تھا مگر اس کمرے میں خفیہ مائیکروفون لگائے گئے تھے۔ اس کا نجمی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ ایک مائیکروفون باتھ روم میں چھپا دیا گیا تھا اور دو بڑے طاقتور مائیکروفون کمرے میں ایسی جگہ چھپائے گئے تھے کہ آدمی کمرے میں کہیں بھی کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر بات کرے اسے سنا جا سکتا تھا نجمی نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، بال درست کیے، پرس میں سے سامان نکال کر تھوڑا اپنے چہرے کو ٹھیک کیا اور کمرے میں واپس آکر پلنگ پر نیم دراز ہو گئی۔ اسے لکھی بائی کا انتظار تھا۔ وہ دل میں دعائیں مانگنے لگی کہ کاش لکھی بائی نے اس کی ضمانت کا انتظام کر دیا ہو۔ ویسے وہ دل میں حیران ضرور تھی کہ ابھی تک لکھی بائی نے اس کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا اور وہ اس سے ملاقات کرنے بھی نہیں آئی تھی پھر وہ یہ سوچ کر چپ ہو جاتی کہ چونکہ اس پر الزام بڑی سنگین نوعیت کا ہے اس لیے شاید لکھی بائی نے بھی اسے چھوڑ دیا ہو۔
دوسری طرف ندیم کو یہ کہہ کر وہاں لایا گیا تھا کہ وہاں ایک سرکاری افسر اس سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ندیم کو انسپکٹر منجریکر خود اس کمرے کے برآمدے تک لایا جس میں نجمی بیٹھی لکھی بائی کی راہ دیکھ رہی تھی منجریکر نے بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم اندر جاؤ.... میں تھوڑی دیر بعد آکر تمھیں لے جاؤں گا۔"

نجمی کو برآمدے میں کسی کے قدموں کی آواز آئی شاید لکھی بائی آگئی تھی مگر یہ زنانہ جوتوں کی چاپ نہیں تھی ہو سکتا ہے انسپکٹر منجریکر آیا ہو یہ سوچ کر نجمی پلنگ پر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ندیم بند دروازے کے آگے آکر رک گیا وہ سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اب اسے کس مصیبت میں الجھایا جا رہا ہے۔ کئی روز سے ندیم پر بھی تشدد کا سلسلہ منقطع تھا اور اسے بھی مناسب غذا فراہم کی جا رہی تھی اور وہ اس سہولت کو عارضی اور کسی آنے والے بڑے تشدد اور بھیانک اذیت کا پیش خیمہ سمجھ رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ سامنے نجمی پلنگ پر بیٹھی تھی ایک مدت کے بعد وہ نجمی کو دیکھ رہا تھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ دونوں ایک دوسرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے۔ دونوں پر جیسے سکتے کا عالم تھا۔ وقت بھی شاید رک گیا تھا۔ ایک دوسرے کے سامنے آکر دونوں ہی یہ بھول گئے کہ کہیں یہ کوئی سازش تو نہیں ہے، کہیں انھیں کسی جال

میں تو نہیں الجھایا جا رہا۔ ان کی آنکھیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ نظریں ایک دوسرے میں جذب ہو چکی تھیں۔ نجمی جیسے کسی غیر مرئی طاقت کے زیر اثر پلنگ سے اٹھی.... پھر اس کی گود سے نیچے گر پڑا اسے ارد گرد کا کوئی شعور نہیں تھا اس کا محبوب سامنے تھا اور بس یہی اس کے لیے کافی تھا۔ ندیم کے قدم بھی اپنے آپ نجمی کی طرف اٹھنے لگے بمشکل دو سیکنڈ کا وقت گزرا ہوگا۔ لیکن ان دونوں کو محسوس ہو رہا تھا جیسے انھیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے صدیاں گزر گئی ہیں۔ اور پھر دریا کے دونوں بچھڑے ہوئے کنارے ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے جیسے ہزار ہا برس سے بچھڑے ہوئے ستاروں کا ملاپ ہو رہا تھا، جیسے ایک دوسرے کے ملاپ کی پیاسی ندیاں سنگلاخ ویرانوں اور تپتے صحراؤں کے طویل سفر کے بعد ایک سنگم پر ایک دوسرے سے آن ملی ہوں۔ دونوں ایک دوسرے سے مل گئے تھے، دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے دونوں کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ نہ اوپر آسمان تھا نہ نیچے زمین تھی، نہ کوئی خلاء تھا نہ کوئی فضا تھی۔ انسپکٹر منجریکر کے ساتھ انٹیلی جینس کا ایک اور آفیسر بھی تھا دونوں بند روشندان کے سوراخ میں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ وہ یہی دیکھنا چاہتے تھے۔

ندیم نے نجمی کو پلنگ پر سہارا دیکر بٹھایا۔ وہ کیا کہے؟ کیا بولے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نجمی کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو بہہ رہے تھے۔ ندیم نے نجمی کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا "مجھے معاف کر دو نجمی.... میں تمھارا گنہگار ہوں۔"

ایک عرصے کے بعد نجمی نے ندیم کی آواز سنی تھی وہ اپنے تمام زخم بھول گئی تھی۔ ندیم کی شیریں آواز اس کے محبوب کی آواز تھی۔ اس نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور اس کی طرف آنسوؤں بھری پلکیں اٹھا کر بولی "ندیم تم کہاں تھے"، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ندیم کے بھی آنسو نکل پڑے۔ جب ذرا دل کا غبار ہلکا ہوا تو اچانک نجمی کو خیال آیا کہ کہیں یہ کوئی چال نہ ہو۔ آخر ان دونوں کی ملاقات کس لیے کرائی جا رہی ہے۔ ندیم کچھ کہنے لگا تھا کہ نجمی نے اس کے ہونٹوں پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ مگر اب بولنے یا نہ بولنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ انڈین انٹیلی جینس والوں کو جو معلوم کرنا تھا، وہ معلوم کر چکے تھے۔ وہ ان دونوں کا پہلا ردّ عمل دیکھنا چاہتے تھے ان کی باتوں کے بارے میں انہیں بھی معلوم تھا کہ وہ محتاط ہو جائیں گے وہ تو ان دونوں کو ایجنٹ سمجھ رہے تھے اور ایجنٹ آہٹ پا

کر یا سازش کی بو سونگھ کر بہت چوکنے ہو جاتے ہیں۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "تمھیں پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کے الزام میں پکڑا گیا ہے۔ تم مجھے ملنے آئے تھے؟"

"ہاں"، ندیم نے بھی سرگوشی میں جواب دیا "میں تم سے ملنے لاہور سے آیا تھا۔ صرف تم سے ملنے مجھے تمھارا خط ملا تو میں بہت رویا بہت خوش بھی ہوا پھر زائرین کی ایک پارٹی کے ساتھ دلی پہنچا اور وہاں سے بھاگ کر کلکتہ آ گیا یہاں تمھارے مکان کے باہر پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا اور ابھی تک پولیس کی حراست میں ہوں۔"

نجمی نے ایک بار پھر ندیم کے ہونٹوں پر اپنی انگلی رکھ دی اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا وہ جانتی تھی کہ ان کو نہ صرف دیکھا جا رہا ہوگا بلکہ ان کی باتیں بھی ٹیپ ہو رہی ہوں گی۔ مگر وہ گفتگو کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔ نجمی نے کہا "تم نے پولیس کو کیوں نہیں بتا دیا کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے۔ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔ تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔"

چونکہ ان کی محبت اور تعلقات کا راز فاش ہو چکا تھا اس لیے نجمی نے سوچا کہ اب وہ یہی موقف اختیار کرے گی اسے پاکستان سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان لایا گیا وہاں اس کی شادی ایک ایسے بدکار انسان سے کر دی گئی جس نے اسے کلکتے کے ایک بدمعاش موجمدار کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ وہ ندیم سے محبت کرتی تھی ندیم بھی اس سے پیار کرتا تھا اس نے ندیم کو خط لکھ کر اپنا ایڈریس دیا اور وہ اس سے ملنے بغیر ویزے کے کلکتے آ گیا۔ اس نے ندیم کو بھی یہی تلقین کی کہ جو سچی بات ہے وہ ہمیں بیان کر دینی چاہیئے۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ چوم لیا اور بولا "میں اب غلط بیانی سے کام نہیں لوں گا.... میرا جاسوسی سے کوئی تعلق نہیں ہے.... میں تم سے پیار کرتا ہوں اور یہی پیار مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔"

یہ باتیں انسپکٹر منجریکر اور انڈین انٹیلی جینس کا دوسرا آفیسر بھی کانوں سے ہیڈ فون لگائے سن رہے تھے۔ نجمی اور ندیم کی باتیں ایک دوسرے کمرے میں ٹیپ پر ریکارڈ بھی ہو رہی تھیں۔ انسپکٹر منجریکر نے کانوں سے ہیڈ فون اتار کر نیچے رکھا، آہستہ سے اٹھا اور چھت پر سے دبے پاؤں گزر کر دوسری جانب کی سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔

ندیم اور نجمی ایک دوسرے کے قریب بیٹھے گزری محبتوں کے حسین اور درد بھرے دکھی لمحات کی

یادوں میں گم تھے کہ دروازہ کھلا اور انسپکٹر منجریکر اندر داخل ہوا اس نے ندیم کی طرف متوجہ ہو کر کہا "تمہارے ڈرامے کا وقت ختم ہو گیا ہے میرے ساتھ چلو۔"

نجمی خالی خالی نظروں سے ندیم کو تک رہی تھی۔ انسپکٹر منجریکر ندیم کو ساتھ لے کر باہر نکل گیا۔ برآمدے سے گزر کر وہ رُک گیا اور اس نے ندیم کو اپنی گارڈ کے سپاہیوں کے حوالے کر کے کہا "تم اسے لے کر گاڑی میں بیٹھو میں آرہا ہوں۔" نجمی پلنگ پر سر جھکائے بیٹھی ندیم سے ملاقات کے سنہری لمحوں میں گم تھی کہ انسپکٹر منجریکر اس کے پاس آکر رک گیا نجمی نے اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ انسپکٹر منجریکر نے اچانک نجمی کو ایک تھپڑ مارا اور کہا "پولیس تمہاری ان باتوں میں آنے والی نہیں ہم جانتے ہیں تم دونوں ڈرامہ کر رہے تھے... لیکن یہ ثابت ہو گیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو جانتے ہو اور ندیم تم ہی سے ملنے یہاں آیا تھا۔" نجمی پلنگ پر گری خون آشام نظروں سے اس مرہٹے انسپکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

— — — — —

نجمی اور ندیم سے پولیس نے الگ الگ پوچھ گچھ شروع کر دی۔ دونوں نے ایک ہی موقف اختیار کیا جو ایک حقیقت بھی تھی۔ نجمی نے پولیس کو یہ بات ضرور بتا دی کہ اسے چند سال پہلے لاہور سے اغوا کر کے مشرقی پاکستان پہنچا یا گیا اور پھر موجمدار نامی ایک بنگالی بدمعاش نے اسے کلکتے لا کر خضر پور جیٹی کے روپا نامی بردہ فروش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ پولیس نے ان سب کو تھانے بلا کر تحقیقات کی تو انھوں نے نجمی کے بیان کی تصدیق کر دی ندیم کے بیان پر پولیس کو یقین نہیں آرہا تھا انٹیلی جنیس کو شبہ تھا کہ ندیم کا تعلق پاکستانی ایجنٹوں کے گروہ سے ہے وہ نجمی سے محبت ضرور کرتا ہو گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ نجمی کو ندیم کی بھارت دشمن سرگرمیوں کا علم نہ ہو لیکن ندیم کے بارے میں اس شبہے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا کہ وہ محض اپنی محبوبہ سے ملنے کلکتے آیا تھا۔ کوئی بھی پڑھا لکھا نوجوان جو ویزا پاسپورٹ کی قانونی پابندیوں سے واقف ہو ایسا خطرناک قدم نہیں اُٹھا سکتا سوائے اس کے کہ وہ کسی اہم ترین اور سنگین مشن پر وہاں آیا ہوا ہو۔ کلکتے میں ہی انٹیلی جنیس کے افسروں کی ایک میٹنگ ہوئی جس میں ندیم اور نجمی کے سلسلے میں تمام تحقیقات اور رپورٹوں اور دونوں کے بیانات کا پوری تفصیل سے جائزہ لیا گیا دو گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد اسی میٹنگ میں یہی فیصلہ کیا گیا کہ فی الحال چندا کو رہا کر کے لکھی بائی کے پاس بھیج دیا جائے اور اس کی مکمل نگرانی کی جائے۔ لکھی نے ایک اہم کام یہ کیا تھا کہ سال بھر پہلے چندا کو کسی نہ کسی طریقے پر افسروں سے مل ملا کر بھارتی شہریت دلا دی تھی۔ اور اس کا شناختی کارڈ بھی بنوا دیا تھا۔ پولیس اب یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ نجمی کو واپس پاکستان دھکیل دیا جائے۔ پولیس کو ابھی تک اس بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا کہ چندا یعنی نجمی کے پاس کسی نازک محکمے کے خفیہ راز نہیں ہیں ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا

کیا گیا کہ ندیم کو دلی جیل میں ہی رکھا جائے اور اس سے مزید پوچھ گچھ کی جائے۔ پولیس ندیم کو کسی حال میں رہا کرنے اور واپس پاکستان بھیجنے پر تیار نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی کئی ایسے لوگوں کو پولیس نے پکڑ کر دلی، امرتسر اور لدھیانہ کی جیلوں میں ڈال رکھا تھا جو باقاعدہ پاسپورٹ پر اپنے عزیزوں سے ملنے آئے تھے مگر ان پر جاسوسی کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا تھا۔ ایسے لوگوں کا وہاں کوئی والی وارث نہیں تھا۔ کوئی مسلمان وکیل بھی ان کی ضمانت کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ ان پر جیل میں بے پناہ تشدد کیا جاتا ان سے بھنگیوں ایسے کام لیے جاتے۔ دن میں ایک وقت دو سوکھی روٹیاں دی جاتیں۔ یہ لوگ کئی کئی سال سے بھارتی جیلوں میں پڑے سڑ رہے تھے۔

ندیم کو بھی تھانے سے دلی سینٹرل جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔

لاہور میں ندیم کے والدین انتہائی تشویش میں مبتلا تھے۔ انھوں نے زائرین کی جماعت کے منتظم اعلیٰ سے پوچھا تو اس نے کہا کہ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ ندیم کہاں اور کیسے گم ہو گیا۔ ”ایسا لگتا ہے کہ وہ یا تو اپنے طور پر دلی سے باہر کسی دوسرے شہر میں نکل گیا اور پولیس نے اسے پکڑ لیا مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمیں پولیس نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا یا ہم سے ندیم کی گمشدگی پر کوئی پوچھ گچھ بھی نہیں کی گئی .... باڈر پر بھی اس بات پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا کہ ہماری پارٹی کا ایک آدمی کم کیوں ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھارتی پولیس نے اسے جاسوسی کے الزام میں پکڑا ہے اور بھارتی پولیس کے ایماء پر ہی ہم سے باڈر پر کوئی پوچھ گچھ نہیں کی۔“

ندیم کے والدین نے حکومت سے فریاد کی حکومت کی طرف سے بھارتی سفارتخانے کو لکھا گیا، احتجاج کیا گیا مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا بھارتی سفارتخانے سے بھی یہی جواب ملا کہ اس بارے میں سفارت خانہ بھارتی وزارت خارجہ سے خط و کتابت کر رہا ہے۔ ماں باپ اور بہن رو پیٹ کر اس امید پر صبر کر کے بیٹھ رہے کہ اگر خدا کو منظور ہوا تو ان کا بیٹا اور بھائی ایک نہ ایک روز ان سے آن ملے گا۔ ندیم کو بھی اپنے ماں باپ کی یاد بہت ستاتی تھی مگر اسے یقین ہو گیا تھا کہ بھارتی حکومت اب اسے رہا نہیں کرے گی، اس پر کبھی مقدمہ بھی نہیں چلایا جائے گا۔ جیل میں پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ بھارت کی جیلوں میں ایسے کئی بے گناہ مسلمان نوجوان برس ہا برس سے پڑے ہیں جن پر جاسوسی کا الزام لگا کر قید میں ڈال دیا گیا ہے اور ان کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔ ندیم کو اپنا بھیانک انجام اپنے سامنے نظر آ رہا تھا مگر وہ اس انجام کے لیے تیار نہیں تھا۔ پولیس اسے جس قدر اذیت دے سکتی تھی دیتی رہی ندیم کے جسم پر جگہ جگہ دہکتے سگرٹوں کے جلنے ہوئے نشان تھے، اسے کئی کئی گھنٹے الٹا لٹکائے رکھا، اس کے سینے پر برف کی سل باندھی گئی تھی، اسے مرغن غذائیں کھلا کر ساری رات اور پھر دن بھر جگا کر رکھا گیا، اس کے پیٹ میں پمپ سے زبردستی پانی بھرا گیا اور اس کا پیٹ کئی بار پھٹتے پھٹتے رہ گیا۔ اس کے ناخنوں میں سوئیاں چبھوئی گئیں، اس کی ٹانگوں اور بازوؤں کو لکڑی کے شکنجوں میں جکڑ کر اس حد تک کھینچا گیا کہ اس کی ہڈیوں کے جوڑ الگ ہوتے ہوتے رہ گئے ندیم نے تمام اذیتوں کو برداشت کر لیا سارا تشدد سہہ لیا لیکن اس نے ایک بار بھی اس الزام کو تسلیم نہ کیا کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے۔ اگرچہ پولیس کو ندیم سے کوئی بھی معلومات حاصل نہ ہو سکی تھی لیکن پولیس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ندیم کو رہا نہیں کیا جائے گا چنانچہ اسے غیر معینہ مدت کے لیے دلی کی سینٹرل جیل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا۔ اب اس پر تشدد نہیں کیا جاتا تھا مگر اس کے ساتھ عام قیدیوں سے بھی بدتر سلوک کیا جاتا اسے گالیاں دی جاتیں۔ ذرا ذرا سی بات پر وارڈن اور سپاہی اسے زدوکوب کرنا شروع کر دیتے۔ ان تمام باتوں نے ایک تو ندیم کو سخت جان بنا دیا دوسرے اس کے دل میں خوف اور اندیشوں کو دور کر کے اس میں سنگ دلی اور جرأت پیدا کر دی یہ سنگ دلی ظلم و تشدد کے خلاف تھی۔ اب ہر وقت اس کے دل میں ایک ہی خیال جاگزیں رہتا کہ اسے دلی کی سینٹرل جیل سے کسی نہ کسی طرح فرار ہونا ہے اور فرار ہو کر باڈر کراس کر کے اپنے وطن پاکستان پہنچنا ہے۔ کیونکہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ انڈین پولیس اور جیل کے حکام اسے بیس سال بعد بھی آزاد نہ کریں گے۔

کبھی کبھی وہ نجمی کو یاد کر کے اداس ہو جاتا۔ یہ سوچ کر اس کے ضمیر پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا کہ نجمی کو اس حال تک پہنچانے میں اسی کا ہاتھ ہے۔ نجمی نے اسے اپنی نجی زندگی کے بارے میں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک بنگالی عورت کے ہاں ملازم ہے جس کا نام نکھی بالی ہے اور جس نے ٹائپ وغیرہ کا ایک ادارہ کھول رکھا ہے۔ نجمی نے اپنی حقیقی زندگی اور گناہ آلود شب و روز کو ندیم پر ظاہر نہیں کیا تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

شبانہ کی طرف ہم ذرا بعد میں جائیں گے اس وقت وہ واشنگٹن میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک

پُراذیت زندگی بسر کر رہی ہے اس کا خاوند احساس کمتری کا شکار ہے اور شبانہ کے ساتھ اس نے شادی صرف اسی غرض سے کی تھی کہ شبانہ اس سے نفرت کرتی تھی اور اس نے اس کی دو ایک بار بے عزتی بھی کی تھی۔ اب وہ گن گن کر شبانہ سے بدلے لے رہا تھا اور شبانہ شدید ذہنی اذیت کا شکار تھی مگر اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی عزت کو سینے سے لگائے اپنے ظالم شوہر ظفر کی تمام زیادتیوں کو برداشت کر رہی تھی۔ ابھی تک اس کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ بھی تھی کہ شبانہ کا باپ اپنے داماد کا مقروض تھا اور لاہور والی کوٹھی ''کینال لاج'' بھی ظفر نے خرید کر اپنے نام کروالی تھی۔

شبانہ کو ہم تھوڑی دیر کے لیے اس کے حال پر چھوڑ کر ندیم اور نجمی کی طرف آتے ہیں۔ نجمی کو کلکتہ پولیس نے رہا کر دیا تھا۔ انسپکٹر منجریکر نے چندا کو لکھی بائی کے حوالے کرتے ہوئے خاص طور پر اسے ایک طرف لے جا کر کہا تھا ''چندا تمھارے پاس ہی رہے گی .... پولیس کی طرف سے یہ تمھیں حکم ہے کہ چندا تمھیں چھوڑ کر اور کسی کے پاس نہیں جائے گی جب تک تمھیں کوئی دوسرا حکم نہیں ملتا چندا تمھارے پاس ہی رہے گی اس کا ذکر تم چندا سے نہیں کرو گی۔''

لکھی بائی سر پیٹ کر رہ گئی۔ چندا کے واپس آنے کی اسے خوشی بھی تھی کہ اس کا دھندا چلتا رہے گا مگر دھندا تو وہ چلاتی ہی رہتی تھی وہ تو چندا کو راجکمار کے پاس فروخت کر کے لاکھوں روپے کمانا چاہتی تھی لیکن پولیس کے احکامات کے آگے وہ مجبور ہو گئی۔ اب لازمی طور پر کچھ عرصے کے لیے ہی سہی مگر اسے نجمی کو اپنے پاس ہی رکھنا تھا اور وہ اس کا کہیں بھی سودا کر کے مال اکٹھا نہیں کر سکتی تھی۔۔ لکھی بائی نے اتنا ضرور کیا کہ نجمی کو چھوٹے چھوٹے ناچ گانے سے الگ کر لیا اور اس کی صحت کا خاص خیال رکھنا شروع کر دیا تاکہ سال دو سال بعد جب پولیس اسے اجازت دے تو نجمی کا حسن برقرار ہو اور وہ راجواڑے کے راجکمار سے منہ مانگا انعام یا دام حاصل کر سکے۔ راجکمار کو سال ڈیڑھ سال کے لیے ٹالنے کا فن لکھی بائی خوب جانتی تھی۔ سیکرٹ سروس کے آدمی باقاعدہ نجمی کی نگرانی پر لگا دیئے گئے تھے وہ جس بنگلے میں بھی ہوتی خفیہ پولیس والے اس بنگلے کی نگرانی کرتے۔ نجمی شہر میں جہاں جاتی اس کا پیچھا کیا جاتا، اسے نگاہ میں رکھا جاتا اور خفیہ پولیس کے آدمی ہر روز انسپکٹر منجریکر کو فل رپورٹ دیتے۔ انسپکٹر منجریکر اب بھی ہفتے میں ایک بار شام کو لکھی بائی کے ویران بنگلے میں نجمی کا گانا سننے جاتے

میں آ کر نجمی کا گانا سنتا تھا۔ نجمی کے ساتھ بظاہر اس مرہٹے پولیس انسپکٹر کا سلوک ایسا ہی تھا جیسے نجمی کے بارے میں اس کے دل میں اب کوئی شکوک و شبہات نہیں ہیں لیکن نجمی اس سے ندیم کے بارے میں نہیں پوچھ سکتی تھی اسے کچھ علم نہیں تھا کہ ندیم کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ اتنا اسے احساس تھا کہ پولیس نے اسے ہرگز ہرگز رہا نہیں کیا ہوگا اور وہ بھارت کے کسی نہ کسی شہر کی جیل میں ہی ہوگا۔ نجمی بادل نخواستہ انسپکٹر منجریکر کے آگے گاتی اور ناچتی تھی اسے اس ہندو انسپکٹر سے شدید نفرت تھی۔ اس کے لگائے گئے زخموں کے نشان نجمی کے دل پر ابھی تک تازہ تھے۔ نجمی کے دل پر ان تمام زخموں کے نشان بھی تازہ تھے جو لوگوں نے اسے لگائے تھے۔ وہ لوگ بھی نجمی کے سامنے تھے جنھوں نے اس پر بہیمانہ تشدد کیا تھا اور اس کے ساتھ زندگی کی تھی وہ ایک ایک کو اس وحشت ناک اور عبرتناک طریقے سے قتل کرنا چاہتی تھی کہ وہ سسک سسک کر مریں۔ لیکن ابھی تک نجمی کو موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک یہ بات بھی واضح نہیں تھی کہ یہ موقع کس قسم کا ہوگا؟ اس کی نوعیت کیا ہوگی؟

دوسری طرف ندیم جیل سے فرار ہونے کی ترکیبوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ اسے دلی کی جیل میں آئے ایک مہینہ ہو گیا تھا۔ خوراک اسے واجبی سی ملتی تھی۔ صبح کو چائے کا ایک مگ سوکھی روٹی کے ساتھ اور رات کو کبھی کچھ مل جاتا اور کبھی اسے بھوکے ہی سونا پڑتا تھا۔ اب اسے اتنی اجازت تھی کہ وہ کوٹھڑی سے نکل کر جیل کے احاطے میں دوسرے قیدیوں کے ساتھ دن میں ایک بار ورزش کرتا اور ایک آدھ سگریٹ کسی سے لے کر پی لیتا تھا۔ اس دوران بھی پہرے دار اس کے قریب ہی منڈلاتے رہتے تھے۔ اسے دوسرے قیدیوں کے ساتھ زیادہ گھل مل کر باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس کی کوٹھڑی کے ورانڈے کے باہر جو سکھ سپاہی پہرہ دیتا تھا اس سے باتوں ہی باتوں میں ندیم نے یہ معلوم کر لیا تھا کہ رائفل کی گولی اس کا سیفٹی کیچ کھینچ کر کس طریقے سے چلائی جاتی ہے۔ اس کا لباس بھی قیدیوں جیسا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ گزر چکا تھا نومبر شروع ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی سردی بھی شروع ہو گئی تھی۔ رات کو ندیم میلا کچیلا کمبل اوڑھ کر پھٹے ہوئے کمبل پر پڑ کر سو جاتا اسے مچھر اور کھٹمل بھی بہت پریشان کرتے مگر وہ آہستہ آہستہ ان تکلیفوں کا عادی بن گیا تھا۔ دن کے وقت جب اسے ورزش کے لیے احاطے میں لایا جاتا تو وہ کنکھیوں سے جیل کی دیوار کا بار بار جائزہ لیتا یہ دیوار کچی تھی مگر کافی اونچی تھی۔

اور سیڑھی کے بغیر اس کو پھاندنا ناممکن تھا۔ ندیم نے دیوار کو پھاندنے کے سلسلے میں بہت غور و فکر کیا اسے کوئی رستہ نظر نہ آیا کوئی ترکیب سجھائی نہ دی وہ دوسرے طریقوں پر غور کرنے لگا کوئی دوسرا طریقہ بھی اس کے ذہن میں نہیں آ رہا تھا اسے سوائے ورزش کے اوقات کے باقی کسی وقت بھی اپنی تنگ و تاریک کوٹھری سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی۔ یہ پھانسی کی کوٹھری تھی اور اس کے آگے ایک چھوٹا سا ورانڈہ تھا جس کے دونوں جانب لوہے کے سلاخ دار دروازے لگے تھے جیل میں زیادہ تر سکھ قیدی تھے جو دن بھر شور مچاتے رہتے تھے کچھ ہندو مسلمان قیدی بھی تھے جو مختلف جرائم کی پاداش میں ملی ہوئی سزائیں کاٹ رہے تھے۔ نومبر کا مہینہ بھی گزر گیا۔ دسمبر میں دلی میں کڑاکے کی سردی پڑنے لگی اب ندیم کو دن کے وقت تھوڑی دیر کے لیے دھوپ میں بھی لایا جانے لگا۔ صورت شناسائی تو سبھی قیدیوں سے رہی لیکن فقیریا نامی دلی کے ایک مسلمان قیدی سے ندیم کی اکثر گفتگو ہوا کرتی۔ ایسا لگتا تھا کہ پولیس والے ندیم کو بھول گئے ہیں اور یا پھر اسے ہمیشہ کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا ہے کہ ایک روز یہیں مر کھپ جائے گا جس طرح کہ ندیم کو ایک قیدی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ جو نام نہاد پاکستانی جاسوس مر جاتا ہے اسے وہیں گڑھا کھود کر دبا دیا جاتا ہے اور پھر لوگ اس کا نام بھی بھول جاتے ہیں۔ شاید اس وجہ سے اب ندیم کی جیل کے اندر کڑی نگرانی نہیں ہوتی تھی۔

دلی کا فقیریا نام کا قیدی جوان آدمی تھا جسم دبلا پتلا تھا اس کا تعلق دلی کے ایک جرائم پیشہ گروہ سے تھا اس نے دشمنی میں آ کر ایک آدمی کا خون کیا تھا اور جیل میں دس برس کی قید کاٹ رہا تھا۔ اسے جیل میں آئے سات برس گزر چکے تھے وہ بڑا ہنس مکھ تھا اور قیدیوں سے لے کر جیل کے پہریداروں اور سپاہیوں تک سے ہلکا پھلکا مذاق کر لیا کرتا تھا۔ جیل کے اندر تقریباً سبھی قیدیوں کو معلوم تھا کہ ندیم پاکستانی جاسوس ہے اور دوسرے پاکستانی جاسوسوں کی طرح غیر معینہ مدت کے لیے بغیر مقدمہ چلے جیل میں بند ہے۔ اس جیل میں ندیم کے سوا کوئی دوسرا پاکستانی جاسوس نہیں تھا۔ فقیریئے نے ایک روز ندیم سے بڑا فضول سا مذاق کیا۔ ندیم کو غصہ تو بہت آیا مگر وہ خاموش رہا۔ یہاں اسے دن میں چھوٹی موٹی مشقت بھی کرنی پڑتی تھی۔ چونکہ وہ پڑھا لکھا تھا اس لیے اس سے رجسٹروں پر لکیریں ڈالنے اور پھٹی ہوئی فائلوں کی مرمت اور رجسٹروں کی جلد بندی کا کام لیا جاتا تھا۔ ان رجسٹروں میں

قیدیوں کے نام اور پتے اور مقدمات کی نوعیت اور جرائم وغیرہ کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ ندیم کو ان رجسٹروں کے مندرجات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ فقیریا ندیم سے ہر بار مذاق کرتا۔ ایک بار ندیم نے اسے ڈانٹ دیا اس پر فقیریا لڑائی پر آمادہ ہو گیا۔ قیدیوں نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ اس واقعے کے تین دن بعد ندیم اپنی کوٹھری کے سامنے والے احاطے میں دھوپ میں زمین پر بیٹھا لکیریں کھینچ رہا تھا کہ کوئی شے تھپ سے اس کے پاس آن گری۔ ندیم نے دیکھا یہ ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی ایک انڈے کے برابر اس کا سائز تھا۔ ندیم نے گردن اٹھا کر جدھر سے پوٹلی آئی تھی ادھر دیکھا کچھ فاصلے پر فقیریا زمین پر آلتی پالتی مارے دھوپ میں بیٹھا سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ پوٹلی کو کھول کر دیکھو۔ ندیم نے پوٹلی کو کھولا تو اس میں سے کاغذ میں لپٹا ہوا کھوئے کا پیڑا نکلا۔ ندیم نے ایک بار پھر فقیریئے کی جانب دیکھا اس نے ہاتھ منہ کی جانب لے جا کر اشارہ کیا کہ اسے کھا جاؤ اور مسکرانے لگا۔ اگرچہ ندیم کی فقیریئے کے ساتھ تناتنی تھی مگر ندیم کو اتنا ضرور احساس تھا کہ فقیریا دل کا برا نہیں ہے اور صاف گو انسان ہے۔ ندیم نے پیڑا کھا لیا بے حد مزیدار، میٹھا اور لذیذ پیڑا تھا۔ ندیم نے ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر فقیریئے کا شکریہ ادا کیا۔ فقیریئے نے مسکراتے ہوئے منہ دوسری طرف کر لیا۔

اس کے بعد ندیم اور فقیریئے کی دوستی ہو گئی۔ اب وہ آپس میں بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ ندیم کو فقیریئے سے بلکہ وہاں کسی سے بھی کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ سب کو معلوم تھا کہ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے جس کا اعتراف ندیم نے کبھی نہیں کیا۔ فقیریئے کو بھی ندیم نے یہی بتایا کہ وہ بے گناہ ہے۔ لاہور کے ایک کالج میں پڑھتا تھا، ایک لڑکی سے اسے محبت ہو گئی جس کو بردہ فروش اغوا کر کے مشرقی پاکستان لے گئے اور وہاں سے اسے کلکتے پہنچا دیا گیا۔ کلکتے سے اس کی محبوبہ نے کسی طرح اسے خط لکھ کر اپنا پتہ بتایا اور وہ زائرین کی ایک جماعت میں شامل ہو کر دلی پہنچا اور وہاں سے فرار ہو کر کلکتے پہنچ گیا مگر خفیہ پولیس اس کا پیچھا کر رہی تھی اور اسے کلکتے میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے بعد اس پر بے پناہ تشدد کیا گیا۔ اذیتیں دی گئیں کہ وہ پاکستانی جاسوس ہونے کا اعتراف کر لے اور انہیں اپنے دوسرے جاسوس ساتھیوں کے نام بتا دے لیکن اسے تو کچھ بھی معلوم نہ تھا وہ تو بھارت میں اجنبی تھا۔ وہ کسی کا نام کیا بتاتا؟ اور اب اسے بغیر مقدمہ

چلائے جیل میں سڑنے کے لیے ڈال دیا گیا ہے۔ فقیریا بڑے غور سے ندیم کا بیان سن رہا تھا۔ ندیم نے فقیریئے سے ہر موضوع پر بات کی مگر اس پر یہ کبھی بھی ظاہر نہ کیا کہ وہ جیل سے فرار ہونا چاہتا ہے اور اس کے لیے سوچ بچار کرتا رہتا ہے۔ ندیم کو یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں فقیریا سرکاری آدمی نہ ہو۔ جیل میں ایسے لوگ بھی قیدیوں کی شکل میں چھوڑ دیئے جاتے ہیں جو قیدیوں کے دلوں کے راز معلوم کر کے انھیں جیل کے حکام کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ندیم نے اسی لیے فقیریئے سے ابھی تک اپنے فرار کے بارے میں ذکر تک نہیں کیا تھا وہ اپنے طور پر فرار کے طریقوں پر غور کرتا رہتا تھا۔ کوئی ترکیب اس کے ذہن میں نہیں آ رہی تھی۔ دو ایک بار اسے خیال بھی آیا کہ فقیریئے کو اپنا ہم راز بنا لے۔ یہ شخص اتنی دیر سے جیل میں قید ہے اور پھر دلی کا رہنے والا ہے وہ ندیم کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ سوچ کر ندیم نے ہمیشہ اس خیال کو اپنے دل سے نکال دیا کہ فقیریا کہیں پولیس کا آدمی نہ ہو۔ دسمبر کا مہینہ بھی گزر گیا جنوری شروع ہو گیا اس دوران ندیم کی نگاہ ایک ٹرک کا جائزہ لیتی رہی تھی یہ ٹرک جیل والوں کا نہیں تھا شاید باہر سے کرائے پر حاصل کیا گیا تھا یہ ٹرک جمعرات اور پیر کے دن دوپہر کے وقت جیل کے احاطے میں آ کر دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا تھا اس ٹرک میں جیل کے قیدیوں کے میلے کپڑے، چادریں اور جیل کے آفس کے میز پوش وغیرہ دھلنے کے لیے لے جائے جاتے تھے۔ آتی دفعہ ٹرک میں سبزیاں، پیاز وغیرہ لدے ہوتے تھے جنھیں جیل کے احاطے میں ہی قیدی ٹوکروں میں بھر کر رسوئی (باورچی خانہ) کی طرف پہنچا دیتے تھے اگرچہ اسی ٹرک میں سوار ہو کر فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا لیکن ندیم کو محسوس ہوا کہ سوائے اس ٹرک کے دوسری کوئی شئے اسے جیل سے باہر نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے اسی لائن پر سوچنا شروع کر دیا۔ کالج کے زمانے میں اس نے قیدیوں کے فرار کی بہت سی کہانیاں رسالوں، کتابوں میں پڑھی تھیں وہ سب ایک ایک کر کے اسے یاد آ رہی تھیں جیل کی دیوار اتنی اونچی تھی کہ ندیم اسے کبھی نہیں پھاند سکتا تھا۔ یہ بہت بڑی جیل تھی اور اس میں سیکورٹی کا بھی بہت سخت انتظام تھا چھ واچ ٹاور تھے جہاں سرچ لائٹیں نصب تھیں۔ ظاہر ہے خطرے کے وقت چیخ چیخ کر شور مچانے والے الارم بھی لگے ہوں گے۔۔۔ واچ ٹاور پر ہر وقت مسلح سپاہی موجود رہتے تھے۔ دن کے وقت بھی اور رات کے وقت بھی۔ جیل کے دو آہنی دروازے تھے ایک دروازہ احاطے میں تھا دوسرا احاطے میں سے گزرنے کے بعد آتا تھا

دونوں آہنی دروازے بلند قامت تھے ان پر مسلح سپاہی بندوق لیے ہر وقت موجود رہتا تھا یہی وجہ تھی کہ ندیم نے دیوار پھاندنے یا ان دروازوں میں سے کسی طرح اپنی ظاہری شکل میں گزرنے کا خیال دل سے نکال دیا تھا لے دے کے صرف اس ٹرک پر اس کی ساری امیدیں مرکوز ہو گئی تھیں۔ یہ ٹرک ہفتے میں دو بار آتا تھا اور احاطے میں کوئی ایک گھنٹہ کھڑا رہتا تھا۔ پہلے اس میں لدی ہوئی ترکاریاں وغیرہ اتاری جاتیں اور پھر جیل کے مختلف کمروں سے میلے کچیلے کپڑوں کے گٹھڑ لا کر ٹرک میں بھر دیئے جاتے اس کام میں کبھی گھنٹہ اور کبھی ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا۔ اس دوران ٹرک کا سکھ ڈرائیور وہاں موجود نہیں رہتا تھا۔ وہ شاید جیل کی کینٹین میں چائے وغیرہ پینے یا کھانا کھانے چلا جاتا تھا۔ ٹرک کا کلینر کوئی نہیں تھا ٹرک اوپر سے کھلا تھا صرف ڈرائیور کی سیٹ والا حصہ ڈھکا ہوا تھا سب سے اہم سوال یہ تھا کہ ندیم اس ٹرک تک کس طرح پہنچے کیونکہ جس وقت ٹرک احاطے میں داخل ہوتا تھا ندیم اپنی کوٹھری والے برآمدے سے نکل کر دیوار کے ساتھ دھوپ میں بیٹھا سگریٹ بیڑی پی رہا ہوتا تھا۔ اس وقت دھوپ اس کی کوٹھری والے احاطے کی دیوار کے ساتھ بھری ہوتی تھی اور ندیم وہاں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا ہوتا تھا۔ جلد سازی وغیرہ کا کام وہ بارہ بجے تک ختم کر دیتا تھا اس کے بعد دھوپ میں آ کر بیٹھ جاتا پہریدار بھی اس وقت کھانا وغیرہ کھانے چلا جاتا اس وقت وہاں اس کی جگہ پر کوئی دوسرا پہریدار نہیں ہوتا تھا اصل میں ندیم کے امن پسند رویئے اور حسن اخلاق کے باعث اسے جیل کے اندر اب کافی چھوٹ دیدی گئی تھی۔ وہ بھی جان بوجھ کر باتوں باتوں میں قیدیوں یا پہریدار سپاہیوں سے یہی کہا کرتا کہ اب تو ساری زندگی اس جگہ گزارنی ہے اب تو مجھے جیل کے ماحول سے بڑا لگاؤ ہو گیا ہے یہ جگہ چھوڑ کر جانے کو دل ہی نہیں کرتا وغیرہ اس کے یہ خیالات بہرحال جیل کے وارڈنوں اور سپرنٹنڈنٹ تک پہنچ جاتے تھے لہذا اسے تھوڑی سی آزادی دیدی گئی تھی اب اپنے کوٹے کا کام ختم کرنے کے بعد اسے اجازت تھی کہ وہ احاطے میں چہل قدمی کر سکتا تھا۔ وہ کچھ دیر فقیریئے کے پاس بھی دھوپ میں بیٹھ کر گپ شپ لڑاتا اس نے فقیریئے کو بھی یہی تاثر دیا تھا کہ جیل میں اس کا جی لگ گیا ہے اب پاکستان جانے کا خیال بھی اس نے دل سے نکال دیا ہے ایک روز فقیریئے نے چڑ کر کہا ،،تم کیسے پاکستانی ہو کہ شہ کی جیل سے دل لگا بیٹھے مجھے تمہارے پاکستانی ہونے پر شک ہے ،،

ندیم نے سر کو نفی کے انداز میں جھٹکتے ہوئے کہا "جب ساری زندگی اسی جیل میں ہی گزارنی ہے تو پھر یہی بہتر نہیں ہے کہ یہاں جی لگا لیا جائے؟" فقیریئے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔
"یہ کہو نا پھر..... یہ تو نہ کہو کہ تمھارا دل یہاں لگ گیا ہے اور پاکستان کا خیال ہی نہیں آتا میرے یار اپنا وطن اپنا ہوتا ہے۔ میں پاکستان کبھی نہیں گیا لیکن مجھے اس ملک سے عقیدت ہے۔"

ندیم خاموشی سے فقیریئے کی گفتگو سنتا رہا۔ وہ فقیریئے کو اپنا ہم خیال نہیں بنانا چاہتا تھا۔ ابھی تک اسے اس پر اعتماد نہیں تھا۔ ندیم نے اپنی ساری توجہ جیل میں آنے والے ٹرک کی آمدورفت کے اوقات وہاں کھڑے رہنے کے دورانیے اور سکھ ڈرائیور کی نقل و حرکت پر مرکوز کر دی۔ جنوری کا مہینہ بھی گزر گیا۔ ندیم کو اس دوران ٹرک اور اس کے ڈرائیور کی نقل و حرکت کے اوقات زبانی حفظ ہو گئے۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ جیل میں اس کی کسی نے خبر تک نہیں لی تھی۔ پولیس نے اسے ایک بار بھی مزید پوچھ گچھ کے لیے نہیں بلایا تھا۔ یہ بات ندیم کے حق میں اچھی ہی تھی۔ اسے پورے اطمینان سے اپنے فرار کے منصوبے پر غور کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ ندیم نے دیکھا کہ ہر ہفتے ٹرک سے سبزیاں اتارنے والے قیدی بدل دیئے جاتے ہیں۔ جب ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لاد دیئے جاتے ہیں تو کم از کم پندرہ منٹ تک ٹرک احاطے میں اکیلا کھڑا رہتا ہے سکھ ڈرائیور اس کے پندرہ بیس منٹ کے بعد آتا ہے۔ ٹرک کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہوتا ہے اور ٹرک کو بیک کر کے جیل کے احاطے والے آہنی دروازے کی طرف لے جاتا ہے۔ پہریدار کو کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر کوئی پرچی تھماتا ہے۔ پہریدار ٹرک کے پیچھے آ کر رسمی طور پر میلے کپڑوں کے گٹھڑوں پر ایک اڑتی ہوئی نظر ڈالتا ہے اور ٹرک کو باہر جانے کی اجازت مل جاتی ہے۔ ندیم نے اس بات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ کیا کسی طرح سے اس کی ڈیوٹی ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لادنے والوں میں نہیں لگ سکتی۔ بہت جلد اس نے معلوم کر لیا کہ یہ ڈیوٹی صرف ایسے قیدیوں کی لگائی جاتی ہے جو سال بھر کی یا زیادہ سے زیادہ دو سال کی سزا کاٹ رہے ہیں لمبی سزائیں کاٹنے والوں کو ٹرک کے نزدیک بھی نہیں آنے دیا جاتا۔ اس کے باوجود فقیریا سگریٹ پیتا ٹرک کی جانب نکل جاتا تھا اور سبزیوں کے ٹوکرے اتارنے والوں سے ہنس ہنس کر مذاق کی باتیں کیا کرتا تھا۔ ندیم کافی سوچ بچار کے بعد اسی نتیجے پر پہنچا کہ ٹرک میں سوار ہونے کا صرف ایک ہی موقع ہو سکتا ہے یعنی جب ٹرک میں میلے کپڑوں کے گٹھڑ لد چکے ہوتے ہیں اور پندرہ بیس منٹ کے لیے

ٹرک کے آس پاس کوئی نہیں ہوتا۔ سکھ ڈرائیور بھی کہیں کینٹین میں میٹھا چائے وغیرہ پی رہا ہوتا ہے۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ اس وقفے کے دوران ٹرک تک کس طرح جائے۔ اگر وہ ٹرک میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ جہاں ٹرک احاطے کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے وہاں سامنے جیل کی بیرکیں ہیں اور وہاں دوسرے قیدی مشقت وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ پہریدار بھی ادھر اُدھر چل پھر رہے ہوتے ہیں۔ بیلدار بھی ہوتے ہوں گے۔ ندیم کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے اور اگر وہ ایک بار پکڑا گیا تو پھر اس پر بہت سختی کی جائے گی۔ ممکن ہے اسے کوٹھڑی میں دن بھر بند رکھا جائے یہ ایک بہت بڑا مرحلہ تھا مگر ندیم نے اس مرحلے میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کا عزم کر رکھا تھا۔

اس کے دل میں کئی بار خیال آیا کہ اس سلسلے میں فقیریئے کو وہ اپنا ہم راز بنا لے۔ فقیریا وہاں جیل کے پہریداروں میں بھی بڑا مقبول تھا۔ وہ آزادی سے جیل کے اندر چل پھر لیتا تھا۔ فقیریا ندیم کی کچھ نہ کچھ مدد کر سکتا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ اسے کوئی مفید مشورہ ہی دیدے۔ کوئی نئی راہ سمجھا دے لیکن ندیم فرار کے راز کو اس پر ظاہر کرتے ہوئے ہچکچا رہا تھا۔ اسی کشمکش میں جنوری کا آدھا مہینہ بھی گزر گیا۔ اب ندیم کی طبیعت بے چین ہونے لگی۔ اسے خدشہ تھا کہ کہیں ٹرک کے اوقات نہ تبدیل کر دیئے جائیں۔ اگرچہ ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا لیکن ندیم کو وہم ہونے لگا تھا۔ اگر فرض کر لیا کہ ٹرک دن کی بجائے شام کو آنے لگتا ہے تو پھر ندیم کے وہاں سے فرار ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ سورج غروب ہوتے ہی اسے کوٹھڑی میں بند کر دیا جاتا تھا۔ ایسا تو وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جیل میں دھنا دھن گولیاں چلاتا فلم کے ہیرو کی طرح جیل سے فرار ہو جائے۔ یوں اس کے جسم کو چھلنی کر دیا جاتا۔ وہاں تو کوئی پہریدار ایسا نہیں تھا جس کے کاندھے سے بندوق نہ لگی ہوئی ہو اور فقیریئے نے اسے بتایا تھا کہ ان کی بندوقیں ہر وقت بھری رہتی ہیں۔ فقیریئے نے کہا تھا "ایک بار عمر قید کے ایک سکھ قیدی نے پستول دکھا کر وارڈن کو آگے لگا لیا۔ مگر وارڈن اسے جل دے کر ایک طرف ہو گیا اور سپاہیوں نے فائرنگ کر کے سکھ قیدی کی دونوں ٹانگوں کو اس بری طرح سے چھلنی کر دیا کہ ہسپتال میں اس کی دونوں ٹانگوں کو کاٹ دینا پڑا۔"

یہ تمام باتیں ندیم کے پیش نظر تھیں۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں فقیریا سے دلی شہر کا ضرورت کے مطابق حدود اربعہ بھی معلوم کر لیا تھا۔ کیونکہ اگر وہ جیل سے فرار ہو کر باہر جاتا ہے تو اسے کوئی

ایسا راستہ اختیار کرنا چاہیئے تھا جو اسے جیل سے دور کسی محفوظ علاقے میں پہنچا دے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ انجانے پن میں کسی ایسی سڑک پر چل دے جو آگے جا کر کسی فوجی علاقے میں یا کسی پولیس اسٹیشن کے احاطے میں جا نکلے۔ ایک دن وہ فقیریئے سے پوچھ رہا تھا کہ وہاں سے ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہے اور کس طرف ہے تو فقیریئے نے معنی خیز نگاہوں سے ندیم کی طرف دیکھا اور بولا:-

"کیا بات ہے استاد تم یہاں سے فرار ہونے کے بارے میں تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

ندیم نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "بالکل نہیں یہاں سے بھلا کوئی فرار ہو سکتا ہے"۔

فقیریئے نے کہا۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔ آدمی کے اندر حوصلہ ہونا چاہیئے فرار ہونے کے ایک لاکھ طریقے ہیں۔"

ندیم نے بظاہر مذاق کے انداز میں پوچھا" چلو تم کوئی ایک بتا دو۔"

فقیریا سنجیدہ ہو گیا اس وقت ان کے قریب کوئی جمعدار یا حوالدار بھی نہیں تھا کہنے لگا" اپنے خدا کی قسم کھا کر کہو کیا تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو۔؟"

ندیم ابھی تک اسے اپنا ہاتھ نہیں پکڑا رہا تھا۔ نہ اس کا ہاتھ پکڑ رہا تھا اسے فقیریئے پر اعتماد نہیں تھا کہنے لگا۔" فقیریئے یہ بتاؤ کہ کون ایسا قیدی ہے جو جیل میں ہی رہنا پسند کرتا ہے۔ اور جیل سے بھاگنا نہیں چاہتا۔"

فقیریا بولا" مثلاً میں ہوں میری مثال لے لو میں جیل میں ہی رہ کر اپنی سزا پوری کرنا چاہتا ہوں۔ تم پوچھو گے میں کیوں نہیں جیل سے فرار ہونا چاہتا جبکہ مجھے یہاں سے فرار ہونے کے کئی راستے معلوم ہیں تو میں کہوں گا کہ میں اس لیے فرار نہیں ہونا چاہتا کہ میں اسی شہر دلی کا جدی پشتی رہنے والا ہوں میرے ماں باپ بہن بھائی رشتہ دار اور سبھی اس شہر میں آباد ہیں آج میں یہاں سے فرار ہوتا ہوں اور شام کو پولیس میرے ماں باپ یا بہن بھائیوں کو پکڑ کر تھانے لے جائے گی۔ ان پر تشدد کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ میں کہاں جا سکتا ہوں کس کے پاس چھپ سکتا ہوں یا پھر پولیس ان سے سیدھے سبھاؤ پوچھے گی کہ فقیریا تمھارے پاس کہیں چھپا ہوا ہے اسے پیدا کرو۔ میں اپنے رشتہ داروں اور اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کسی کے پاس بھی نہیں ہوں گا مگر پولیس انھیں مار مار کر بے حال کر دے گی۔ میں بدمعاشی میں پٹ چکا ہوں ہماری سفارش کرنے والا بھی کوئی

نہیں ہے یوں میں جیل سے بھاگ کر اپنے ماں باپ کے پاس بھی نہیں جا سکتا۔ مجھے ظاہر ہے بھارت کے شہروں میں دربدری کرنی ہو گی۔ پولیس سے چھپتے پھرنا ہوگا۔ تو میرے بھائی تم سے کہوں گا کہ اگر میں یہاں سے بھاگ کر بھی اپنے ماں باپ بہن بھائیوں کی شکل نہیں دیکھ سکتا۔ بلکہ الٹا میری وجہ سے انھیں شدید تکلیف پہنچ سکتی ہے تو پھر جیل سے بھاگنے کا کیا فائدہ ہوا اس سے بہتر ہے کہ چپکے سے اپنی سزا کاٹوں اور اچھے چال چلن کی وجہ سے جو تھوڑی بہت رعایت ملتی ہے حاصل کروں اور ٹھنڈے ٹھنڈے اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ جاؤں ٹھیک ہے نا۔ مگر تمھیں جیل سے فرار ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ملک تمھارا ملک نہیں ہے تمھیں یہاں سے کسی دوسرے ملک میں جانا ہے جہاں پر یہاں کی پولیس، یہاں کا قانون تمھارا پیچھا نہیں کر سکتا۔ اگر تم اپنی باقی زندگی یہاں کی جیل میں پڑے سڑنا چاہتے ہو تو میں سمجھتا ہوں کہ تم بزدل ہو، یہاں سے فرار ہونا تمھارا فرض ہے۔ اب بتاؤ تم کیا چاہتے ہو؟"

ندیم سوچ میں پڑ گیا کیا وہ فقیریئے سے صاف صاف کہہ دے کہ وہ دو ماہ سے فرار کا منصوبہ بنا رہا ہے کہیں وہ مخبری تو نہیں کر دے گا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ فقیریئے نے خود ہی مطلع صاف کر دیا۔ کہنے لگا" میرے بھائی تم مسلمان ہو پاکستان کے رہنے والے ہو جس سے ہمیں بھی محبت ہے ایک بات میری دل پر نقش کر لو۔ فقیریا مرنا گوارا کر لے گا مگر تیرا راز کسی کو نہیں بتائے گا۔ تم پوچھو گے کیوں؟ اس لیے کہ فقیریا نے تجھے اپنا دوست کہہ دیا ہے اور ہم چاہے جتنے برے ہوں دوست کو دھوکا نہیں دیتے۔"

اب ندیم کے پاس کوئی دلیل باقی نہ تھی۔ اس نے فقیریئے کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا اور بولا۔

"فقیریئے بھائی! اب میں تم سے کچھ نہیں چھپا سکتا۔ میں واقعی یہاں سے تنگ آ چکا ہوں اور بھاگ جانا چاہتا ہوں مگر جب دیکھتا ہوں کہ یہاں سے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے تو صبر شکر کر کے بیٹھ جاتا ہوں۔"

فقیریئے نے جیب سے دو سگریٹ نکال کر دونوں کو منہ میں دبا کر ایک ساتھ سلگایا ایک سگریٹ اپنے منہ میں رہنے دیا اور دوسرا ندیم کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک لمبا کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد

دائیں بائیں دیکھ کر تسلی کرلی کہ ان کی باتیں کوئی نہیں سن رہا۔" ندیم بھائی! تم ابھی بچے ہو میری عمر ان ہی جھمیلوں میں گزری ہے اور گزر جائے گی۔ اگر تم فرار ہونا چاہتے ہو تو راستہ میں بتا دیتا ہوں۔"

ندیم اس کا منہ تکنے لگا۔ فقیریئے نے اس یقین کے ساتھ یہ بات کہی تھی جیسے سامنے جیل کا گیٹ کھلا ہوا ہے اور وہ ندیم کو اشارہ کرے کہ جاؤ بھاگ جاؤ۔ ندیم نے اب اسے ٹرک کے بارے میں بتا دیا۔ فقیریا مسکرایا استاد اس کا مطلب یہ ہے کہ تم دیر سے فرار کے منصوبے تیار کر رہے ہو۔ نہیں میرے بھائی ٹرک والے کام میں جان کا خطرہ ہے اور تم پکڑے بھی جاؤ گے اس لیے کہ ٹرک جب جیل کے دوسرے گیٹ سے نکل کر باہر جاتا ہے تو اسے روک دیا جاتا ہے اور سپرنٹنڈنٹ کی نگرانی میں ٹرک کے پیچھے لدی ہوئی میلے کپڑوں کی گٹھڑیوں پر کھولتا ہوا گرم پانی ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اگر کوئی قیدی پہرے داروں کو رشوت وغیرہ دے کر ان گٹھڑیوں میں چھپ کر فرار ہونے کی کوشش کرے تو گرم پانی کی وجہ سے اس کا پتہ چل جائے۔" ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی وہ اس منصوبے پر عمل نہیں کر سکا تھا۔ اس نے فقیریئے سے پوچھا "تم مجھے کونسا طریقہ بتا سکتے ہو؟" فقیریئے نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا "ایک ایسا طریقہ کہ تم پانچ منٹ سے بھی کم وقت میں جیل کی چار دیواری سے باہر ہو گے۔"

* * * * *

فقیریا سگریٹ کا کش لگا کر بولا "ابھی بہت ٹائم ہو گیا ہے۔ ہمارا زیادہ دیر یہاں ٹھہر کر باتیں کرنا ٹھیک نہیں ہے دوسروں کو شک پڑ سکتا ہے۔ تم اب کوٹھڑی میں جاؤ۔ میں تمھیں یہاں سے فرار کی ترکیب کل دوپہر کو بتاؤں گا۔" فقیریا یہ کہہ کر اٹھا اور بہادر شاہ ظفر کا شعر گنگناتا اپنی بیرک کی طرف چلا گیا۔ ندیم بھی اٹھ کر اپنی کوٹھڑی میں آ گیا۔ رات کو دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ وہ یہی سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ فقیریئے کو اس کے دل کا حال معلوم ہو گیا ہے لیکن وہ وارڈن کو تو نہیں بتا دے گا کہ یہ پاکستانی جاسوس یہاں سے فرار ہونے کی تیاریاں کر رہا ہے اس طرح سے ندیم پر سختی آ سکتی تھی۔ اسے ایک ماہ کے لیے قید تنہائی میں بھی ڈالا جا سکتا تھا۔ خدا خدا کر کے رات گزر گئی دن نکل آیا۔ ندیم نے جلد سازی کا کام شروع کر دیا۔ دوپہر تک اس نے اپنے کوٹے کا سارا کام ختم کر دیا۔ کوٹھڑی میں ہی ابلی ہوئی بد ذائقہ سبزی کے ساتھ دو سوکھی ہوئی روٹیاں کھائیں اور معمول کے مطابق جمعدار اسے احاطے میں لے گیا جہاں گرم گرم دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر دھوپ میں بیٹھ گیا۔ اس کے جوڑ جوڑ کو دھوپ کی گرمائش پہنچی تو اسے بے حد سکون ملا۔ اس کی نظریں فقیریئے کو تلاش کر رہی تھیں۔ اس کو ایک طرف سے ہنسی ٹھٹھے کی آواز سنائی دی۔ فقیریا ہر ایک سے ہنسی مذاق کرتا فقرے چست کرتا احاطے کی دھوپ میں نکل آیا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ ندیم کے پاس بھی آ گیا۔ دور ہی سے اسے سلام کیا اور حال چال پوچھا اور بولا۔

"کیوں میاں آج کتنی جلدیں باندھیں ارے یار میرے تو باہر جا کر جلد سازی کی دکان کھول سکتا ہوں یہ لے اسی خوشی میں سگریٹ کا کش لگا۔" فقیریا اسی بہانے ندیم کے قریب آ گیا۔ اس نے اپنا

جلتا ہوا سگریٹ ندیم کی طرف بڑھایا اور اس کے قریب ہی دھوپ میں ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا۔ اس کی نگاہیں سامنے جیل کی دیوار کی جانب تھیں۔ آہستہ سے بولا "تم ضرور سوچ رہے ہو گے کہ کہیں زنجیر بیٹے نے وارڈن کو تو نہیں بتا دیا۔ یا کتنا جاسوس بھاگنے والا ہے۔"

فقیریا ہنس دیا "تم پوچھو گے مجھے کیسے پتہ چلا؟ میں کہوں گا کہ سب ہی ایسا سوچتے ہیں؟ لیکن بھائی فقیریا مرد کا بچہ ہے۔ حق اور انصاف کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہے۔ وہ تم سے غداری کیسے کرے گا۔ اب سن میں تمھیں یہاں سے بھاگنے کی ترکیب بتاتا ہوں۔ میری ملاقات ہر جمعے کو آتی ہے۔ ماتا پتا اور بھائی بہن تو مہینے میں ایک بار ہی آتے ہیں مگر میرا یار راجو ہر جمعے کو مجھ سے ملنے کو آتا ہے۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ وہ تمھاری مدد کرے گا۔" ندیم اس کا منہ تک رہا تھا۔ پھر دیوار کی طرف منہ کر کے بولا "وہ میری کیا مدد کرے گا فقیریئے؟ وہ تو جیل سے باہر ہے۔ میں جیل کے اندر ہوں۔" فقیریا بولا "میری بات خاموشی سے سنتے جاؤ۔ یہاں جہاں تمھاری کوٹھری ہے اس کے عقب میں بھی ایک احاطہ ہے اس احاطے کی دیوار کے ساتھ املی کا ایک بڑا درخت ہے۔ اس درخت کی شاخیں جیل کی دیوار کے بالکل اوپر آئی ہوئی ہیں۔ پہلے ان شاخوں کو ہر مہینے کاٹ دیا جاتا تھا مگر اب دو مہینے گزر گئے ہیں ان شاخوں کو نہیں کاٹا گیا۔ تمھارا کام یہ ہے کہ اس درخت پر رات کے اندھیرے میں چڑھ کر جیل کی دیوار پر آ کر دوسری طرف کود جاؤ۔ دوسری طرف میرا یار راجو موجود ہو گا۔ باقی وہ خود سنبھال لے گا۔"

ندیم کو ہنسی آ گئی۔ فقیریئے نے اس ہنسی کو پسند نہیں کیا تھا۔ ندیم نے فوراً معذرت کرتے ہوئے کہا "فقیریا بھائی معاف کرنا مجھے اس لیے ہنسی آ گئی تھی کہ یہ تو بگلے کی آنکھ پہ موم لگا کر اسے پکڑنے والی ترکیب ہے بھلا میں رات کے اندھیرے میں اپنی کوٹھری سے نکل کر دروازے کا تالا کھول کر املی کے درخت کے پاس کیسے پہنچوں گا؟ کیا سارے پہریدار اور جمعدار سو رہے ہوں گے۔؟"

فقیریئے نے کہا "ہاں سو رہے ہوں گے بلکہ بے ہوش ہوں گے۔ سنو یہ سب جمعدار اور پہریدار اور سپاہی نشہ کرتے ہیں؟ انھوں نے مجھے اتنی آزادی کیوں دے رکھی ہے؟ صرف اس لیے کہ میں ان کا نشہ پورا کرتا ہوں۔ میں انھیں یہاں آدھی سے بھی کم قیمت پر چرس، کوکین اور شراب ولایتی سپلائی کرتا ہوں۔ یہ مال باہر سے میرا یار راجو لا کر دیتا ہے۔ میں چرس سے بھرے

ہوئے سگریٹ ان لوگوں کو دیتا ہوں۔ باہر ایک سگریٹ کی قیمت ایک روپیہ ہے جبکہ میں انھیں یہاں چار آنے میں سپلائی کرتا ہوں اور میری چرس بھی خالص ہوتی ہے۔ صرف اس لیے کہ یہاں میں قید کے باقی دن پورے کر سکوں اور میری رپورٹ بھی اچھی جائے اور مجھے چھوٹ مل جائے۔ اس جمعہ کو میرا یار راجو ملاقات کے لیے آئے گا تو میں اسے ساری بات سمجھا دوں گا ساری اسکیم بنا دوں گا اور اس سے اگلی دفعہ تین ایسے سگریٹ لانے کو کہوں گا جن میں کچھ ملا ہوا ہو گا۔ صرف تین سگریٹ ہی کافی ہوں گے۔ ایک سگریٹ تمھارے وارڈ کا جمعدار لے گا۔ دوسرا احاطے میں رات کو املی کے درخت کے قریب پہرہ دینے والا لے گا تیسرا سگریٹ میں تمھارے وارڈ کے سامنے جو سپاہی پہرہ دیتا ہے اس کو دے دوں گا۔ یہ لوگ ضرور رات کو چرس والے سگریٹ پی کر پہرہ دیتے ہیں۔ اگر چرس نہ پیئیں تو یہ ایک جگہ جم کر بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ چرس کا سگریٹ پی کر وحشت ہو جاتے ہیں اور پھر اسٹول پہ بیٹھے ٹکٹکی باندھے جیل کی اندھیری دیوار کو تکتے رہتے ہیں۔

ندیم نے کہا... "لیکن میری کوٹھری کا تالا کون کھولے گا؟ فقیریا سگریٹ کو دور پھینکتے ہوئے ادھر اُدھر تکنے لگا۔ پھر آہستہ سے بولا "یہ کام میں کروں گا۔ کیونکہ میں ہی ان جمعداروں کو رات کے وقت نشے والے سگریٹ دیا کرتا ہوں۔ دن کے وقت یہ سگریٹ اپنے پاس رکھتے ہوئے گھبراتے ہیں کیونکہ انھیں پکڑے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ میں جب رات کے وقت تمھارے جمعدار کو سگریٹ دینے آؤں گا تو اسے کسی بہانے تمھاری کوٹھری والے برآمدے میں لے آؤں گا اور اس وقت تک اسے اس برآمدے میں ہی رکھوں گا جب تک کہ وہ سگریٹ کے چار پانچ کش نہیں لگا لیتا۔ چار پانچ کش ہی جو ین والے سگریٹ کے بہت ہوتے ہیں۔ زیادہ کش لگانے سے انسان کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے اس کے بعد میں جو کروں گا تم خود ہی دیکھ لو گے۔"

ندیم کو فقیریئے کا بھی بہت خیال تھا۔ اس نے کہا "فقیریئے بھائی ایسا نہ ہو کہ بعد میں تم پر کوئی مصیبت پڑ جائے۔"

فقیریا بولا "اول تو یہ تینوں جمعدار رات بھر بیہوش رہیں گے بلکہ صبح کو بھی بیہوش ہی ہوں گے جب یہاں تمھارے جیل توڑ کر بھاگنے کا شور مچے گا تو ثبوت بیہوش جمعدار وہیں پڑا ہو گا سب

کو معلوم ہو جائے گا کہ جمعداروں نے رات کو نشہ زیادہ کر لیا اور بے ہوش ہو گئے اور پاکستانی جاسوس کو فرار کا موقع مل گیا۔ اس میں میرے پھنسنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر وارڈرن سے لیکر حوالداروں تک سب مجھ سے شراب اور چرس لے کر پیتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ اگر مجھ پہ ہاتھ ڈالا تو میں عدالت میں صاف بتا دوں گا کہ جمعدار کیا مجھ سے تو وارڈن بھی چرس لے کر پیتے ہیں۔ تم میری بات چھوڑو۔ پرسوں جمعہ ہے راجو میرا یار آ رہا ہے۔ میں سب کام پکا کر دوں گا۔ تم اب صرف ایسا کرنا کہ اس دوران مجھ سے احاطے میں زیادہ بات چیت مت کرنا۔ میں بھی تمھارے پاس کم آیا کروں گا اب میں جاتا ہوں۔"

فقیریا اپنے چمکیلے سیاہ بالوں میں کنگھی کی طرح انگلیاں پھیرتا دوسری طرف چل دیا۔ دن گزرتے چلے گئے۔ جمعہ کا دن بھی آ گیا۔ ہفتے کی دوپہر کو فقیریا دھوپ سینکنے احاطے میں آیا تو کچھ دیر ادھر اُدھر منڈلانے اور قیدیوں اور جمعداروں سے چہلیں کرنے کے بعد ندیم کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ بیٹھتے ہی بولا "سب کام ٹھیک ہو گیا ہے تم آج رات یہاں سے فرار ہو رہے ہو۔" یہ سننا تھا کہ ندیم کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے اس کا دل کچھ زیادہ ہی زور سے دھڑکنے لگا وہ فقیریئے سے کہنا چاہتا تھا کہ تاریخ کچھ آگے نہیں ڈال سکتے؟ مگر اس کی زبان سے یہ الفاظ نہ نکل سکے۔ فقیریا کہہ رہا تھا "خاص تین سگریٹ میری جیب میں الگ پڑے ہیں ان میں میرے یار راجو نے بڑے حساب کتاب سے کچھ ملایا ہے اس نے ملاقات کے وقت کہا تھا کہ اس کا تیسرا کش کوئی مائی کا لعل ہی کھینچ سکتا ہے۔ میں نے اس سے پورا پروگرام طے کر لیا ہے بس تمھارے وارڈ میں رات کے ٹھیک دس بجے سگریٹ لے کر آؤں گا۔ جمعدار کو سگریٹ سپلائی کرنے کا میرا ٹائم یہی ہے۔ میں تمھارے وارڈ والے جمعدار سپاہی کو آج رات باہر آنے کا موقعہ نہیں دوں گا وہ تمھاری کوٹھڑی کے داہنے والے برآمدے میں ہی ہو گا اور میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔

اس کے بعد کا کام میرا ہے تم جب کوٹھڑی سے نکلو گے تو میں تمھارے ساتھ نہیں ہوں گا کوٹھڑی کے عقبی احاطے میں اندھیرا نہیں ہوتا سامنے دیوار والا بلب روشن ہوتا ہے مگر تم گھبرانا بالکل نہیں کیونکہ احاطے اور بیرک کے سامنے والے دونوں پہریدار اپنی اپنی جگہ پر بے ہوش پڑے ہوں گے تم جتنی جلدی ہو سکے املی کے درخت پر چڑھ کر اس کی شاخوں کو پکڑ کر جیل کی دیوار پر اُتر جانا ٹھیک

اس جگہ جیل کی دیوار کے دوسری جانب کھائی کی جھاڑیوں میں ایک شخص تمھارے انتظار میں چھپ کر بیٹھا ہو گا۔ وہ تمھیں اپنے ساتھ لے کر جائے گا۔ آگے کیا کرنا ہے؟ یہ تم اسے بتا دینا۔ وہ ہر طرح سے تمھاری مدد کرے گا۔ آدمی بدمعاش اور چھُرے باز ہے مگر یہ اس کا پیشہ ہے۔ دل کا بڑا نیک ہے میں نے اسے تمھارا حلیہ بھی بتا دیا ہے اس کا حلیہ تمھیں اندھیرے میں کیا معلوم ہو گا۔ بہرحال تم سے وہ صرف اتنا پوچھے گا۔ لاہور سے آئے ہو؟ تم اس کے جواب میں کہنا نہیں میں چاندنی چوک سے آ رہا ہوں بس یہی تمھاری اور راجو یعنی میرے یار کی شناخت ہو گی مگر میں تم سے ایک بات کا وعدہ ضرور لینا چاہوں گا اور وہ یہ کہ اگر بدقسمتی سے یہ پروگرام غلط ہو جائے اور کسی غلطی یا اتفاق سے پکڑے جاؤ تو کسی کے آگے میرا یا میرے یار کا نام مت لینا۔ اس کی وجہ تم نہ پوچھو۔ بس مجھے یقین دلا دو کہ تم مر جاؤ گے مگر میرا نام زبان پہ نہیں لاؤ گے۔ ندیم کے دل میں فقیریئے کا بے حد احترام پیدا ہو گیا تھا اس نے کہا "فقیریئے بھائی تمھیں یقین دلانے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ میں تمھارے ہی الفاظ دہراتے ہوئے کہوں گا کہ میں مر جاؤں گا مگر تم لوگوں کا نام میری زبان پہ نہیں آئے گا۔"

فقیریا کان میں انگلی ڈال کر ہلانے لگا۔ ندیم نے کہا "تم میرے لیے جو کچھ کر رہے ہو۔ جتنا بڑا خطرہ مول لے رہے ہو۔ تمھارا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس بھی الفاظ نہیں ہیں۔" فقیریئے نے کسی قدر جذباتی ہو کر کہا "میں جو کچھ کر رہا ہوں۔ وہ اس لیے کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی اچھا کام نہیں کیا۔"

فقیریئے کی آواز بھرا گئی۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور صرف اتنا کہہ کر چل دیا کہ آج رات دس بجے تیار رہنا۔ ندیم وہیں دھوپ میں بیٹھا اپنی پنڈلیوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگا۔ اس کے دل میں ایک ہیجان سا بپا تھا۔ جیسے سمندر کی شوریدہ سر لہریں چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر شور مچا رہی ہیں کہیں وہ پکڑا نہ جائے۔ کہیں مارا نہ جائے۔ کہیں اس کے جیل کی دیوار پر اُترتے ہی واچ ٹاور کی لائیٹس روشن نہ ہو جائیں۔ خطرے کے بھونپو نہ چیخنے لگیں۔ فائرنگ نہ شروع ہو جائے۔ طرح طرح کے وسوسے اس کے دل میں سر اٹھانے لگے تھے۔ وہ اٹھ کر دھوپ میں ٹہلنے لگا۔ ایکبار اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ فقیریا کو جا کر منع کر دے کہ وہ رات کو اس کے وارڈ میں نشہ آور

ایسی آوازیں رات کے سناٹے میں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ندیم کو ایسے تمباکو کی بو محسوس ہوئی جس میں عجیب سی بُو ملی ہوئی تھی یہ کچھ کچھ چرس کی بُو سے ملتی جلتی تھی اس کے بعد گہری خاموشی طاری ہو گئی اس خاموشی سے ندیم کے دل میں ہول سے اٹھنے لگے یہ ایسی خاموشی تھی کہ جو بم پھٹنے سے آدھے سیکنڈ پہلے کی خاموشی ہوتی ہے۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا پھر وہ آہستہ سے کمبل پرے کر کے اٹھا اور دبے پاؤں سلاخوں کی طرف بڑھا ابھی وہ سلاخوں سے دور ہی تھا کہ اچانک کوٹھڑی کے سامنے فقیریئے کی شکل نمودار ہوئی اس کے ہاتھ میں چابیوں کا چھلّا تھا اور وہ جلدی جلدی تالے میں چابیاں آزما رہا تھا۔ آخر ایک چابی لگ گئی فقیریئے نے تالا کھول کر کنڈی ایک طرف ہٹائی اور دروازہ کھول دیا ندیم باہر نکل آیا سخت سردی تھی ندیم نے جیل کا بھورے رنگ کا پوری آستینوں والا بوسیدہ سوئٹر پہن رکھا تھا باقی کپڑے جیل کی وردی اور پاؤں میں چپل تھی۔ فقیریئے نے اس کے کان میں کہا "پیچھے مڑ کر مت دیکھنا جس طرح کہا ہے اسی طرح کرنا۔ اللہ کے حوالے۔"

ندیم دبے پاؤں چلتا برآمدے سے نکل کر عقبی احاطے کی طرف گھوم گیا اس کے جاتے ہی فقیریئے نے جیب سے رومال نکال کر تالے کو رگڑ کر اس پر لگے اپنی انگلیوں کے نشان صاف کیے اور تالے کو نیچے فرش پر رکھ دیا پھر اسی رومال سے دروازے کی سلاخوں کو اچھی طرح سے صاف کیا اور برآمدے سے نکل گیا۔ پہریدار برآمدے میں اسٹول کے پاس ہی فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ اسپیشل سگریٹ اس کے پاس ہی پڑا تھا۔ فقیریئے نے سگریٹ بجھا کر اپنی جیب میں رکھ لیا اسی جیب سے دوسرے دونوں پہریداروں کے بجھے ہوئے آدھے آدھے سگریٹ بھی بجھنے کے بعد اس کی جیب میں پڑے تھے۔ فقیریا ان سگریٹوں کے ثبوت بے ہوش پہریداروں کے پاس نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اگرچہ جیل کے آدمیوں کو صرف فقیریا ہی چرس والے سگریٹ سپلائی نہیں کرتا تھا یہ لوگ باہر سے بھی منشیات منگوا لیا کرتے تھے تاہم فقیریا خاص طور پر ان سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے وہاں نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔

ندیم جب احاطے کی دیوار کی طرف بڑھا تو اس کو دیوار کے ساتھ جلتے بلب کی کمزور روشنی میں دوسرا پہریدار بھی بے ہوش پڑا دکھائی دیا۔ غیر شعوری طور پر وہ جھک کر چلنے لگا۔ املی کا درخت

اب اس کے سامنے تھا اگرچہ پہریدار بے ہوش پڑا تھا پھر بھی اُسے جیل کی مغربی دیوار کے واچ ٹاور سے دیکھا جا سکتا تھا عقب سے آتی ہوئی گولی اسکا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھی۔ ندیم کی رفتار میں تیزی آگئی وہ بھاگ کر درخت کے پیچھے آگیا۔ درخت کے تنے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر وہ اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ تنا کھردرا تھا اور کہیں کہیں سے ٹوٹی ہوئی شاخ کا کٹا ہوا حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔ ندیم کو اوپر چڑھنے میں دشواری پیش آرہی تھی مگر یہ اس کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا اس نے چپل اتار کر اپنے پاجامے میں اڑس لی تھی۔ آخر وہ درخت کی اوپر والی کٹی ہوئی شاخ کے ٹنڈ کو پکڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ایک جھکولا سا دیا اور درخت کی پہلی شاخ کے ساتھ اپنی ٹانگیں پھنسا دیں اس جدوجہد میں اسے پانچ سات منٹ لگ گئے۔ ایک شاخ میں سے دوسری شاخ پر ہوتا ہوا وہ درخت کی اس شاخ پر آگیا جو جیل کی دیوار کے اوپر لٹک رہی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں درخت کی شاخ ٹوٹ نہ جائے بڑی احتیاط سے اس نے شاخ کو نیچے جھکانا شروع کیا اور پھر خدا کا نام لے کر اس کے ساتھ خود بھی نیچے لٹک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اوپر درخت کی ٹہنی کو پکڑ رکھا تھا اور اس کے پاؤں جیل کی دیوار سے کوئی تین فٹ اونچے تھے۔ ندیم نے آہستہ سے درخت کی ٹہنی کو چھوڑ دیا۔ وہ دیوار کے اوپر گرتے ہی بیٹھ گیا۔ جیل کی دیوار دو تین فٹ چوڑی تھی اور اسے اوپر سے گول کر دیا گیا تھا۔ ندیم نے دیوار کی دوسری طرف دیکھا نیچے ایک کھائی تھی جس میں گھنی جھاڑیاں رات کی تاریکی میں ایسے نظر آرہی تھیں جیسے کالے کالے ہاتھی کالے کمبل اوڑھے بیٹھے ہوئے ہوں۔ یقیناً انہی جھاڑیوں میں فقیریئے کا دوست راجو چھپا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید وہ اسے دیکھ بھی رہا تھا۔ دیوار کافی بلند تھی لیکن ندیم کے پاس سوچنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ اس نے بے دھڑک جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔ جھاڑیوں میں گرتے ہی کسی نے اسے تھام لیا اور سہارا دے کر اٹھایا اور پھر گھسیٹتا ہوا ایک طرف اندھیرے میں لے گیا اور سرگوشی میں پوچھا "لاہور سے آئے ہو؟" ندیم نے ہانپتے ہوئے جواب دیا "نہیں میں چاندنی چوک سے آرہا ہوں۔" اس آدمی نے سرگوشی میں کہا "میں راجو ہوں فقیریئے کا یار... تمھیں چوٹ تو نہیں لگی؟" ندیم جھاڑیوں پر دائیں رخ گرا تھا۔ ہڈی وغیرہ بچ گئی تھی مگر گردن پر جھاڑیوں کی شاخیں کانٹوں کی طرح لگی تھیں ندیم نے کہا "نہیں"

راجو نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا کھائی کی سامنے والی ڈھلان کی طرف بڑھا یہاں اگرچہ اندھیرا تھا مگر جنوری کی سخت سرد اندھیری رات میں آسمان چمکیلے ستاروں سے بھرا ہوا تھا اور اس کی پھیکی پھیکی روشنی میں جھاڑیوں کے خاکے سے نظر آ رہے تھے۔ کھائی کی ڈھلان چڑھ کر وہ دوسری طرف کچے راستے پر نکل آئے۔ راجو نے دھیمی آواز میں کہا "میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ .... رُکنا بالکل نہیں۔"

وہ کچے راستے کو چھوڑ کر درختوں کے ایک ذخیرے میں گھس گیا۔ یہاں کافی اندھیرا تھا مگر ندیم کی آنکھیں اب اندھیرے کی عادی ہو گئی تھیں۔ درختوں میں کافی دور تک وہ تقریباً بھاگتے چلے گئے۔ درختوں کا سلسلہ ختم ہوا تو سامنے ایک کھلا میدان آ گیا جس کے دوسرے کنارے پر دُور کچھ مکانوں کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ جیل کی جانب سے گھنٹے کی آواز سنائی دی۔ رات کے ساڑھے دس بج گئے تھے۔ گھنٹے کی آواز پر ندیم کا دل زور سے دھڑک اٹھا اسے یوں لگا جیسے جیل میں خطرے کا الارم چیخ اٹھا ہو مگر یہ اس کا وہم اور خوف تھا۔ جیل میں ابھی تک کسی کو اس کے فرار کا علم نہیں ہوا تھا۔

وہ دونوں میدان کے درمیان میں سے ہو کر گزرنے کی بجائے میدان کے کنارے کنارے ہو کر چل رہے تھے۔ راجو خاموش تھا۔ اندھیرے میں چلتے چلتے ندیم نے اس کا جائزہ لیا وہ فقیریئے ہی کی طرح درمیانے قد اور چھریرے بدن کا آدمی تھا اس نے سوئٹر کے ساتھ اپنے سر پہ اونی ٹوپی جما رکھی تھی وہ تیز تیز چل رہا تھا اور زیادہ عمر کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میدان کے کنارے خدا جانے کس قسم کے درخت تھے کہ ان کی شاخیں کافی اوپر جا کر تنوں سے نکلتی تھیں آگے ایک گندا نالہ آ گیا اس پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا پُل تھا۔ راجو نے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا ندیم اس کے پیچھے پیچھے چلتا گندے نالے کے پل پر سے گزر گیا دوسری طرف ڈھلان تھی اور گھاس شبنم کی وجہ سے گیلی تھی۔ ندیم کے پاؤں اور پائنچے شبنم میں بھیگ گئے تھے۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ آخر وہ کب تک پیدل چلتے رہیں گے انہیں تو اس مقام سے جتنی جلدی ہو سکے نکل جانا چاہیئے تھا مگر وہ خاموش رہا۔ جہاں سے وہ اندھیرے میں گزر رہے تھے وہ چھوٹا سا کچا راستہ تھا جس پر درخت نہیں تھے۔ کچھ فاصلے پر کسی آبادی کی روشنیاں جھلملاتی نظر آنے لگی تھیں۔ رات

بڑی سرد تھی لیکن ندیم کو پسینہ آنے لگا تھا۔ اس کے کپڑے ابھی تک جیل کے ہی تھے۔ ندیم کو ٹرک کے گزرنے کی آواز سنائی دی۔ شاید اس بستی کے پیچھے کوئی سڑک تھی۔ بستی قریب آ رہی تھی۔ کچا راستہ ختم ہوا تو ایک درخت کے پیچھے ندیم کو اندھیرے میں ایک چھوٹی سی گاڑی کھڑی دکھائی دی۔ ادھر سے ایک انسانی سایہ ان کی طرف لپکا۔

"راجو" اس سائے نے قریب آ کر کہا "کام ہو گیا ہے؟" "ہاں" راجو نے کہا "کپڑے لاؤ۔" وہ انسانی سایہ گاڑی کی طرف تیزی سے بڑھا۔ راجو نے ندیم کا بازو پکڑ کر روکا اور بولا "یہاں تم کپڑے بدل لو۔" اس کا ساتھی گاڑی میں سے کپڑے لے آیا۔ یہ پاجامہ، قمیض، سوئٹر اور ایک کوٹ کے ساتھ کرمچ کا جوتا تھا۔ ندیم نے تیزی سے جیل کے کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہن لیے اور جیل سے بھی نجات حاصل کر لی۔ راجو نے ساتھی سے کہا "اسے اٹھا لو" جیل کے کپڑے ایک چادر میں لپیٹ کر لفافے میں ڈال لیے گئے۔ گاڑی پرانی سی تھی اور اس کی نشستیں پھٹی ہوئی تھیں۔ راجو نے ندیم سے کہا "پچھلی سیٹ پر لیٹ جاؤ چپکے سے۔" ندیم نے ایسے ہی کیا۔ گاڑی کا انجن چیخ اٹھا۔ ندیم کا دل ایک بار پھر زور سے دھڑکنے لگا۔ گاڑی کسی نامعلوم منزل کی طرف چل پڑی، وہ کچے راستے پر دھچکوں کے ساتھ چلتی رہی۔ ندیم سمٹ کر پچھلی سیٹ پر پڑا رہا۔ گاڑی کچے راستے سے نکل کر پکی سڑک پر آ گئی اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے گاڑی میں زیادہ ٹھنڈ نہیں تھی۔ گاڑی جب سڑک پر لگے کسی کھمبے کے قریب سے گزرتی تو ایک پل کے لیے گاڑی کے اندر روشنی ہو جاتی اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ ندیم نے آنکھیں بند کر لیں اور خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ کامیابی کے ساتھ اپنی جان سلامت لے کر کافروں کی جیل سے نکل آیا تھا اس کا دل فقیریئے کے لیے محبت بھرے جذبات سے لبریز تھا۔ اگر فقیریا اس کی مدد نہ کرتا تو ندیم کے لیے دلّی کی جیل سے فرار ہونا ناممکن تھا۔ گاڑی سڑک پر پوری رفتار سے بھاگی جا رہی تھی۔ ایک ٹرک تیزی سے گزر گیا پھر ایک دو گاڑیاں بھی نکل گئیں معلوم ہونے لگا کہ گاڑی کسی مضافاتی بستی سے گزر رہی ہے۔ ندیم کو باہر سے کسی آدمی کی کسی کو پکارنے کی آواز بھی سنائی دی تھی۔ یہ آوازیں دور ہوتی گئی تھیں۔ اب کھمبے کی روشنیاں گاڑی پر پل بھر کے لیے نہیں چمک رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ گاڑی ایک بار پھر کسی غیر آباد علاقے [illegible]

چلی جا رہی ہے۔ ندیم کے لیے دلی ایک اجنبی شہر تھا۔ زائرین کے ساتھ وہ آیا تھا تو صرف بستی نظام الدینؒ تک ہی پھرتا رہا تھا پھر وہاں سے بھاگا تو ٹیکسی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن تک گیا تھا مگر اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ کافی بڑا شہر ہے۔ راجو اپنے ساتھی کے پاس اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس نے پہلی بار پیچھے گردن گھما کر کہا "تم اب بے تنک اٹھ کر بیٹھ جاؤ۔" ندیم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اس نے شیشے میں سے باہر دیکھا علاقہ واقعی غیر آباد تھا۔ دائیں جانب دور کسی سڑک اور آبادی کی روشنیاں کہیں کہیں جھلملا رہی تھیں۔ سڑک کی بائیں جانب گھپ اندھیرا تھا۔ گاڑی کی رفتار کافی تیز تھی۔ یہ سڑک کوئی.... ہائی وے لگتی تھی کیونکہ کافی کشادہ اور ہموار سڑک تھی۔ ایک جگہ پل پر گاڑی چڑھی تو راجو نے اپنے ساتھی سے گاڑی کی رفتار کم کرنے کے لیے کہا۔ گاڑی پل کے ایک طرف رک گئی اور راجو دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ یہاں پل کے کنارے خشک جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں یہ کسی خشک ندی یا نالے کا پل تھا۔ راجو نے ندیم کے جیل والے کپڑوں کی گٹھڑی خشک جھاڑیوں میں رکھی اور جیب سے ماچس نکال کر جھاڑیوں کو آگ لگا دی چپلیں دلدل میں چھپا دیں پھر جلدی سے گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا اور گاڑی ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ ندیم کو کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ لوگ اسے کہاں لے جا رہے ہیں لیکن اتنا اسے ضرور معلوم تھا کہ وہ اسے کسی خفیہ اور محفوظ مقام پر چھپانے کے لیے لے جا رہے ہیں کیونکہ سب سے پہلے ندیم کا کسی خفیہ مقام پر چھپے رہنا ضروری تھا اس کے فرار کا علم ہو جانے کے بعد شہر میں مشتبہ اڈوں پر ضرور چھاپے پڑتے اور پولیس اس کی تلاش میں لازمی طور پر سرگرم ہونے والی تھی۔ ندیم کو نجمی کا خیال آ گیا۔ پولیس نجمی کے پاس بھی ضرور جائے گی کہ شاید میں جیل سے بھاگ کر اسی کے پاس گیا ہوں گا۔

گاڑی سڑک سے ہٹ کر ایک کچے راستے پر مڑ گئی پھر ادھر اُدھر سے گھومتی مڑتی چکر کھاتی ایک جگہ رک گئی۔ ندیم نے کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے کے ساتھ منہ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر اسے سوائے درختوں کے کچھ نظر نہ آیا۔ راجو اور اس کا ساتھی ڈرائیور باہر نکل آئے۔ راجو نے ندیم کو بھی باہر آنے کے لیے کہا۔ یہاں ایک جھکی ہوئی چھت والا شیڈ بنا ہوا تھا جس کے عقب میں ایک مکان نظر آیا۔ مکان کے آگے ایک صحن تھا جہاں ایک بھینس بندھی تھی اندھیرے میں ندیم کو اس کی آنکھیں ٹارچ کی طرح چمکتی نظر آئیں۔ مکان کا دروازہ کھڑکیاں سب بند تھیں۔

باہر کوئی روشنی بھی نہیں ہو رہی تھی۔ راجو نے دروازے پر جا کر آہستہ سے دستک دے کر کہا۔ "میں ہوں راجو.... دروازہ کھولو۔" ندیم اس کے پیچھے تھا۔ راجو کا دوسرا ساتھی پیچھے گاڑی کے پاس ہی تھا۔ دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور ایک زنانہ آواز آئی "دروازہ کھلا ہے۔" راجو نے ندیم کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ مکان کی ڈیوڑھی کی فضا باہر جنوری کی سرد رات کے مقابلے میں گرم تھی۔ یہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ راجو نے غصے میں کہا "بتی تو جلا دی ہوتی۔" اس نے جیب سے چابی نکال کر بیٹھک کا تالا کھولا اور دروازے کا ایک پٹ کھول کر اندر گیا۔ ٹک کی آواز کے ساتھ بیٹھک کی بتی روشن ہو گئی۔ ندیم بیٹھک میں آ گیا یہاں دیوار کے ساتھ پرانی وضع کا پلنگ بچھا تھا۔ جس پر پھولدار چادر بچھی تھی اور نسواری رنگ کی بڑی رضائی تہہ کر کے رکھی ہوئی تھی۔ دیواروں پر بھارتی فلم ایکٹرسوں کی فریم کی ہوئی تصویریں لگی ہوئی تھیں، فرش پر صف بچھی تھی، کونے میں ایک گول تپائی پر پیتل کے گلدان میں کاغذی پھول سج رہے تھے۔ کارنس کے اوپر راجو ہی کی ایک چوکور تصویر شیشے میں جڑی ہوئی دیوار سے ٹنگی تھی۔ راجو کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور ندیم سے بولا "تم یہاں آرام کرو باقی کوئی فکر نہ کرنا.... تم فقیریئے کے نہیں میرے بھی بھائی ہو..... تم لیٹ جاؤ میں تمھارے لیے روٹی لاتا ہوں۔" ندیم نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ "اسے بھوک بالکل نہیں ہے صرف پیاس لگ رہی ہے۔" راجو جلدی سے باہر نکل گیا۔ ندیم پاؤں اوپر اٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گیا اور رضائی کھول کر اپنے اردگرد لپیٹ لی۔ اسے یہاں بے حد سکون کا احساس ہو رہا تھا۔ راجو پیتل کے جگ میں پانی بھر کر لے آیا اس نے ندیم کو پانی دیا اور بولا "یہاں تمھاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکے گا۔ غسل خانہ ڈیوڑھی میں ساتھ ہی ہے اب تم آرام کرو صبح بات کریں گے.... دروازہ اندر سے بند کر لینا۔" یہ کہہ کر راجو باہر نکل گیا۔ ندیم نے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ ندیم نے بیٹھک کا جائزہ لیا اس کی کھڑکیاں بند تھیں اور ان پر پھولدار پردے گرے ہوئے تھے۔ صرف روشندان کھلا تھا۔ ندیم نے کوٹ اتار کر کرسی پر رکھا اور بتی بجھا کر لحاف میں گھس گیا اس نے آنکھیں بند کر لیں اور آنکھوں میں جو تارے سے چمکنے لگے تو ان تاروں میں سے نجمی کا اداس چہرہ ابھر آیا اور اس نے ندیم سے کہا "ندیم کیا مجھ سے ملنے نہیں آؤ گے؟ میں بڑی اداس ہوں۔"

- - ٭ - -

دلی میں راجو پٹے باز کے مکان پر ندیم کو ایک دن اور ایک رات گزر گئی تھی ۔ آدھی رات تو وہ جیل سے فرار ہو کر آیا تھا ۔ اس سے اگلا دن اور اگلی رات بھی گزر گئی ۔ اس دوران راجو صرف ایک بار شام کو اس سے تھوڑی دیر کو ملنے آیا اور اسے یہ کہہ کر چلا گیا کہ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور اسے یہاں سے کسی دوسری جگہ منتقل کیا جائے گا ۔ ندیم دن رات اس چھوٹی سی بیٹھک میں بسر کرتا ۔ کھانے کی چنگیر ایک عورت بیٹھک کا دروازہ ذرا سا کھول کر پکڑا دیتی تھی ۔ ندیم کو اس کا صرف ہاتھ ہی نظر آتا تھا ۔ دوسری رات بھی جب گزر گئی اور دن کافی نکل آیا تو دروازے پر خاص دستک ہوئی ۔ یہ راجو تھا ۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی ۔ اس کے ہاتھ میں دلی کا ایک ہندی میں چھپا ہوا اخبار تھا ۔ اس اخبار میں ندیم کی ایک تصویر چھپی تھی جس میں اس نے جیل کے کپڑے پہن رکھے تھے ۔ راجو ہندی پڑھ لکھ سکتا تھا ۔ اس نے ندیم کو بتایا کہ جیل سے اس کے فرار کی خبر تصویر کے ساتھ چھپ گئی ہے اور پولیس کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جو کوئی اس مفرور پاکستانی کو گرفتار کروانے میں مدد دے گا یا اس کے خفیہ ٹھکانے کی اطلاع دے گا اسے دس ہزار روپے انعام دیا جائے گا ۔ راجو چارپائی پر بیٹھ گیا ۔ پھر ندیم کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ” پہلی بات تو یہ ہے کہ تم داڑھی مونچھ بڑھا لو ۔ تاکہ تمہارا حلیہ کسی قدر بدل جائے ۔ سر کے بالوں کے لمبے پٹے رکھ لو ۔ لباس بھی درویشوں ایسا پہن لو ۔ یہ جگہ اگرچہ شہر سے دور ہے اور میں خود یہاں سال میں ایک آدھ بار ہی پھیرا مارتا ہوں ۔ پھر بھی خطرہ ہے کہ پولیس میرا پیچھا کرتے یہاں تک نہ چلی آئے کیونکہ میں بہر حال اچھی شہرت کا مالک نہیں ہوں ۔ میرے یار فقیر بیٹے نے تمہیں ضرور بتا دیا ہو گا میں یہاں راجو پٹے باز عرف چھرے مار مشہور ہوں تین بار جیل

بھی کاٹ چکا ہوں ۔ ابھی تک پولیس میرے دلی والے اڈے پر نہیں آئی لیکن وہ ضرور آئے گی چھاپہ نہیں مارے گی بلکہ اپنے خفیہ آدمی میرے پیچھے لگا دے گی ۔ تم آج کا دن یہاں گزارو ۔ رات کے پچھلے پہر میں تمہیں یہاں سے لے چلوں گا ۔“ ندیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا ” کیا میرے لیے یہ بہتر نہیں کہ میں یہاں سے کلکتے بھاگ جاؤں “ احمد خاں ذرا سا مسکرایا پھر کہنے لگا ” تم واقعی اناڑی ہو ۔ فقیر بیٹے نے تمہارے بارے یہی کہا تھا کہ پہلی بار اس قسم کی بک بک میں پھنسا ہے اس نے مجھے تمہاری کلکتے والی عورت کی کہانی بھی سنا دی تھی جس کے عشق میں تم پاکستان سے چل کر یہاں آئے تھے تمہارا کیا خیال ہے کہ پولیس تمہاری اس کلکتے والی کے پاس نہیں گئی ہو گی ؟ میاں بھائی وہاں تو ہر طرف خفیہ پولیس والے پھیل گئے ہوں گے ۔ تم وہاں گئے نہیں اور پکڑے گئے ۔ میری طرف سے بے شک آج ہی چلے جاؤ ۔“

ندیم نے خاموش ہو کر سر جھکا لیا راجو ٹھیک کہہ رہا تھا ۔ راجو چارپائی سے اٹھا ۔ اخبار تہہ کر کے جیب میں رکھا اور بولا ” مجھے معلوم نہیں جیل میں میرے یار فقیر بیٹے پر کیا گزر رہی ہو گی ۔ ممکن ہے شک کی بنا پر اسے بھی دھر لیا گیا ہو ۔ کیونکہ جیل والوں کو وہ بھی چرس سپلائی کرتا ہے اور پہریدار زیادہ چرس یا اسپیشل سگریٹ پینے سے ہی بے ہوش ہوئے تھے ۔ بہر حال میں رات کو دو بجے کے بعد آؤں گا ۔ بس تم یہاں سے باہر مت نکلنا ۔ یہاں تمہیں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے ۔ یہ میری ایک دوست کا گھر ہے ۔ میں نے اس سے خفیہ شادی کر رکھی ہے ۔“

اور راجو ندیم کو آنکھ مار کر جھومتا ہوا باہر نکل گیا ۔ بیٹھک کی کارنس پر ایک چھوٹا سا ٹائم پیس پڑا تھا ۔ اس تنہائی میں ندیم کا یہی ایک ساتھی تھا جو اسے ہر لمحے کا احساس دلاتا رہتا تھا ۔ دوپہر کو پھر خاص دستک ہوئی ۔ یہ راجو کی نہیں بلکہ کھانے کی دستک تھی ۔ ندیم نے جلدی سے اٹھ کر کنڈی اتار دی ۔ وہ خود دروازہ نہیں کھولتا تھا ۔ دوسری طرف سے راجو کی ” بیوی “ نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور چنگیر آگے بڑھا دی ۔ ندیم نے چنگیر پکڑ لی اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی ۔ پانی کی صراحی اور گلاس بیٹھک میں موجود ہی تھے ۔ کھانا کھانے کے بعد ندیم موٹا کمبل اوڑھ کر سو گیا ۔ وہ دیر تک سویا رہا ۔ جب آنکھ کھلی تو روشندان میں دن کی روشنی بہت پھیکی پڑ چکی تھی ۔ اس نے ٹائم پیس کی طرف دیکھا سہ پہر کے ساڑھے چار بج رہے تھے ۔ سونے سے اس کے اعصاب کو کافی سکون ملا تھا ۔ جیل کا گھاس پھوس

کھانے کے بعد اسے دو روز سے گھر کا کھانا مل رہا تھا جس کے باعث اس کی کھوئی ہوئی طاقت کافی حد تک بحال ہو گئی تھی۔ پانچ بجے پُراسرار نسوانی آواز نے اسے چائے کی گرما گرم پیالی پکڑا دی۔ رات کا کھانا بھی مزیدار تھا اور اس پُراسرار خاتون نے کوفتے پکائے تھے۔ ندیم یہ سوچے بغیر کہ اسے رات دو بجے تک جاگنا ہے سارے کے سارے کوفتے کھا گیا۔ جوان لڑکا تھا بھوک خوب لگی تھی ویسے بھی ایک عرصے کے بعد اسے گھر کا کھانا ملا تھا۔ بیٹھک میں کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ اندر ریڈیو تک نہیں تھا۔ راجو نے ندیم کو ہدایت کر رکھی تھی کہ وہ ٹھیک نو بجے رات بتی بجھا دیا کرے۔ نو بجے بتی بجھانے کے بعد ندیم چارپائی یا پلنگ پر دونوں موٹے کمبل اوڑھ کر ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا وہ سگریٹ پینے لگا۔ ٹائم پیس اس کے پاس ہی کارنس پر رکھا ہوا تھا۔ کارنس کے نیچے پلنگ بچھا تھا۔ اب مرغن غذا نے اپنا اثر دکھانا شروع کیا اور ندیم اونگھنے لگا۔ اسے نیند آنے لگی تھی۔ وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیا خبر وہ نیند میں بے ہوش پڑا رہے اور راجو دستک دیتا رہ جائے۔ وہ زیادہ زور سے بھی دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتا تھا۔ ندیم آواز دے کر چائے بھی نہیں منگوا سکتا تھا۔ کیا خبر خاتون خانہ بھی سو گئی ہو۔ اس نے نیند کے خلاف جنگ شروع کر دی۔ اس جنگ میں وہ بار بار پہلے سے زیادہ اونگھنے لگا۔ جونہی اس کا سر اونگھتے ہوئے ڈھلکتا وہ جلدی سے سر کو جھٹک کر آنکھیں کھول دیتا اسی طرح اونگھتے جاگتے وقت گزرتا گیا۔ ایک بار اس نے ٹائم پیس کو غور سے دیکھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ دو بجنے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ندیم کو بڑا اطمینان ہوا کہ آخر اس نے نیند پر فتح پا لی تھی۔ جونہی اس نے اطمینان کا سانس لیا نیند کی ایک گہری لہر نے اس کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ وہیں پلنگ پر گردن ڈھلکا کر خواب خرگوش میں کھو گیا۔ ایک تو جوانی کی نیند تھی۔ دوسرے اس نے جیل اور تھانوں میں بہت رتجگا کیا تھا۔ بہت اذیتیں برداشت کی تھیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ٹھیک دو بجے رات جب راجو نے دروازے پر اپنی مخصوص دستک دی تو ندیم کی آنکھ کھل گئی شاید اس کی چھٹی حس نے اسے بیدار کر دیا تھا کیونکہ یہ خیال اس کے حواس پر سوار تھا کہ اُسے رات کے دو بجے تک جاگتے رہنا ہے۔ ندیم جلدی سے کمبل پرے ہٹا کر پلنگ سے اٹھا اور دروازے کے ساتھ منہ لگا کر بولا "کون؟" دوسری طرف سے راجو نے کہا "میں ہوں۔" ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ راجو اپنے ساتھ کچھ کپڑے لایا تھا۔ آتے ہی بولا "انھیں پہن لو۔ تمھیں ابھی میرے ساتھ چلنا ہے۔" کپڑوں میں ایک کھدر کا کھلا

کرتا، کھلی موہری کا پاجامہ، ایک گرم سویٹر، گرم واسکٹ اور ایک کمبل تھا۔ ندیم نے جلدی سے یہ لباس پہن لیا۔ راجو کہنے لگا "تمھاری داڑھی کا خط وہاں جا کر ہو جائے گا اچھا کیا تم نے شیو نہیں کی۔ اب ہم یہاں سے الگ الگ باہر نکلیں گے۔ پہلے میں جاؤں گا۔ تم ایسا کرنا کہ مکان کے دروازے سے نکلتے ہی بائیں جانب ہو جانا آگے احاطے کا عقبی دروازہ ہے یہ دروازہ کھلا ہو گا۔ اس دروازے سے نکلو گے تو سامنے نیم کا پیڑ آئے گا۔ اس کے آگے ذرا سی ڈھلان ہو گی۔ اور گندی نالی بہہ رہی ہو گی۔ اس نالی کو پار کرو گے تو آگے ایک کچی پگ ڈنڈی آ جائے گی جس کی ایک جانب گودام کی دیوار ہو گی تم اس دیوار کے ساتھ دائیں طرف چلتے جانا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا لکڑی کا پل آئے گا وہاں سے میں تمھارے ساتھ ہو جاؤں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

راجو اٹھا اور بیٹھک سے نکل گیا ندیم پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس کا دل معمول کی رفتار سے ذرا زیادہ ہی دھڑکنے لگا تھا۔ اس قسم کے خطرناک حالات سے پہلے اسے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اسے اس وقت بھی نجمی کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہو گی۔ کہیں پولیس اُسے تنگ تو نہیں کر رہی ہو گی۔ ندیم اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کے جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے جسم کو کمبل میں اچھی طرح سے لپیٹا اور دروازہ کھول کر دبے پاؤں چلتا ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اس نے یہیں سے احتیاط شروع کر دی تھی۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا دروازہ بھی بند تھا۔ ندیم نے ڈیوڑھی کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر دیکھا۔ سرد ہوا اس کی پیشانی سے لگی اسے جھرجھری سی آ گئی۔ دلی کی یہ رات بڑی سرد تھی۔ باہر اندر کی نسبت گھپ اندھیرا تھا۔ تاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں درختوں وغیرہ کے خاکے ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ جیسا راجو نے اسے کہا تھا اس نے ویسے ہی کیا۔ بیٹھک سے نکلتے ہی وہ بائیں جانب ہو گیا۔ آگے مکان کا پچھلا صحن تھا۔ یہاں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ احاطے کا لکڑی کا چھوٹا سا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ ندیم اس دروازے سے نکلا تو سامنے اندھیرے میں ایک بہت بڑا گنجان درخت نظر آیا۔ یہی نیم کا درخت ہو سکتا تھا۔ وہ درخت کے نیچے سے خاموشی سے گزرتا ہوا آگے گیا تو آگے معمولی سی ڈھلان تھی جس کے درمیان ایک نالی بہہ رہی تھی۔ نالی میں پانی رات کے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ وہ نالی پار کر کے دوسری طرف گیا تو اسے ایک کچی پگڈنڈی مل گئی جو مشرق سے مغرب کی طرف جاتی تھی۔ دور اسے کسی عمارت کی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ندیم پگڈنڈی پر اس طرف چلا جدھر ایک

اونچی دیوار پابند ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی جانب چلی گئی تھی یہی گودام کی دیوار تھی۔ ندیم دیوار کے سائے میں بالکل ساتھ لگ کر آگے چل پڑا۔ تھوڑی دور چلا ہو گا کہ اسے اندھیرے اور ستاروں کی پھیکی روشنی میں ایک ہیولا سا دکھائی دیا۔ راجو نے اسے اسی جگہ ملنے کو کہا تھا۔ ندیم ہیولا کی ایک جانب ہو کر دیوار کے ساتھ لگ کر رک گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دائیں بائیں دیکھنے لگا اسے اپنے پیچھے کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ ندیم نے تیزی سے پلٹ کر دیکھا۔ یہ راجو تھا۔ اس نے سر پر اونی ٹوپی جمائی ہوئی تھی۔ قریب آتے ہی سرگوشی میں بولا "پانچ قدم کا فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔" دونوں ایک چھوٹے سے غیر ہموار میدان میں سے گزر کر ایک سڑک پر آ گئے۔ یہاں سڑک کی دونوں جانب اونچے اونچے درخت رات کے اندھیرے اور ٹھٹھرتی ہوئی خاموشی میں ساکت کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک درخت کے نیچے کار پہلے سے موجود تھی۔ راجو اس کار میں جا کر بیٹھ گیا۔ ندیم قریب آیا تو دیکھا کہ یہ وہی کار تھی جو اسے جیل سے فرار کروا کر لائی تھی ڈرائیور بھی اسی رات والا تھا۔ گاڑی کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ ندیم پچھلی سیٹ پر راجو کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ سڑک پر روانہ ہو گئی۔ سڑک کا ایک موڑ آیا۔ گاڑی دائیں جانب گھوم گئی۔ رات کے تین بجے تھے۔ سخت سردی پڑ رہی تھی چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی گئی تھیں صرف سائیڈ کی بتیاں روشن تھیں۔ ندیم کے لیے یہ اجنبی علاقے تھے۔ وہ یہاں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ دلی شہر کے بارے میں اس نے بہت کچھ سنا تھا کہ وہاں مغلیہ سلطنت کی بہت سی پرانی عمارتیں ہیں مگر ابھی تک اسے ایسی کوئی عمارت نہیں دکھائی دی تھی۔ اس سڑک کے دونوں جانب بھی بڑے بڑے درخت تھے۔ سڑک دور تک خالی تھی ایک جگہ گاڑی موڑ کاٹ کر ایک کچے راستے پر چل پڑی۔ وہ ایک ٹیلے کے قریب سے گزرے اندھیرے میں ندیم کو اس ٹیلے کے اوپر ایک گنبد کا خاکہ سا نظر آیا۔ شاید یہ کسی پرانی عمارت کا کھنڈر تھا۔ راجو خاموش تھا۔ دونوں میں سے کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ گاڑی ٹیلے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ایک درخت کے نیچے آ کر رک گئی۔ راجو نے کھڑکی کا شیشہ اتار دیا اور ندیم سے کہا "وہ سامنے تم ایک کوارٹر دیکھ رہے ہو۔ اس کے باہر کوئی روشنی نہیں ہے۔ میں پہلے وہاں جاؤں گا میرے جانے کے پانچ منٹ بعد تم گاڑی سے نکل کر کوارٹر کی طرف چلے آنا۔ میں تمھیں کوارٹر کے دروازے کے اندر ملوں گا۔ دروازہ کھلا

ہو گا۔" راجو دروازہ کھول کر نکلا اور اندھیرے میں گرم چادر کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹتے ہوئے کوارٹر کی طرف روانہ ہوا۔ پانچ منٹ تک ندیم گاڑی کے اندر ہی بیٹھا رہا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور بھی خاموش بے حس و حرکت بیٹھا تھا۔ انھیں سگریٹ پینے کی سخت ممانعت تھی۔ ندیم آنکھیں گھوسنے اندھیرے میں کوارٹر کے ابھرے ہوئے خاکے کو دیکھ رہا تھا۔ اگلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے اندھیرے میں اپنی کلائی پر جھک کر ٹائم دیکھا اور بولا "اب تم جاؤ۔" ندیم نے دروازہ کھولا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔ اندھیرے میں کمبل میں لپٹا لپٹا یا اسی طرح چلدیا۔ کوارٹر کے قریب پہنچ کر اسے برآمدہ دکھائی دیا۔ برآمدے میں اندھیرا تھا۔ سامنے ہی دروازہ تھا۔ ندیم نے اسے آہستہ سے دبایا۔ دروازہ اندر کو کھل گیا۔ اندر بھی اندھیرا تھا۔ راجو کی آواز آئی "بائیں جانب ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔" اب ندیم کو اندھیرے میں راجو کا ہیولا نظر آنے لگا۔ راجو نے آگے بڑھ کر دروازے کی اندر سے کنڈی لگا دی اور بولا "میرے ساتھ آ جاؤ۔"

یہ کمرہ پرانے بارکوں ایسا تھا وہ ایک اور دروازے میں سے گزر گئے۔ دوسری طرف ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس میں خدا جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ راجو کوٹھری میں آتے ہی ندیم کی طرف متوجہ ہو کر بولا "یہ جگہ کونسی ہے؟ یہاں کیا ہوتا ہے؟ اس سے تمھیں کوئی سروکار نہیں ہو گا۔ اس کوٹھری کے نیچے ہمارا ایک خفیہ تہہ خانہ ہے اگر تم عام حالات میں ہم سے ملتے تو تمھیں اس تہہ خانے کے بارے کبھی علم نہیں ہو سکتا تھا لیکن اب حالات دوسرے ہیں اور تم فقیر بیٹے کے دوست ہو اور فقیر بیٹے کے لیے تو میری جان بھی حاضر ہے۔" اتنا کہہ کر راجو نے ایک جگہ سے لکڑی کے پھٹوں کو ایک طرف ہٹایا اور فرش پر بیٹھ کر ایک جگہ سے تختے کو اوپر اٹھایا یہاں سے ایک زینہ نیچے تہہ خانے میں جاتا تھا۔ تہہ خانہ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا مگر ندیم کو محسوس ہوا کہ ایک طرف سے تازہ ہوا اندر داخل ہو رہی ہے۔ راجو نے جیب سے موم بتی نکال کر جلائی۔ موم بتی کی روشنی میں ندیم نے تہہ خانے کا جائزہ لیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران سا ہوا کہ وہاں فرش پر دری بچھی تھی اور دری پر تکیے بھی پڑے تھے۔ کونے میں لکڑی کی چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ ساتھ ہی اگالدان پڑا تھا۔ راجو نے موم بتی میز پر جما دی اور ندیم کے پاس ہی دری پر بیٹھ گیا۔ یہاں زیادہ سردی نہیں تھی۔ ندیم نے کمبل کندھوں سے اتار کر نیچے کر لیا۔ راجو بولا "یہ ہماری ایک خاص خفیہ جگہ ہے یہاں ہم کیا کرتے

ہیں اور کس لیے کبھی کبھی یہاں آتے ہیں؟ یہ کبھی پوچھنا بھی نہیں اور جب یہاں سے چلے جاؤ تو کسی سے اس تہہ خانے کا ذکر بھی نہ کرنا۔"

ندیم نے کہا "خان جی! میں محسن کش نہیں ہوں کہ جو میرے ساتھ اتنا ایثار کرے میں اس کا نام پولیس کے آگے زبان پر لاؤں۔ مر جاؤں گا مگر آپ لوگوں میں سے کسی کا نام تک نہیں لوں گا۔" راجو نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر دو سگریٹ نکال کر منہ میں دبائے انھیں سلگایا۔ ایک سگریٹ ندیم کو دیا۔ دوسرے سگریٹ کا خود کش لگایا اور دھواں نکالتے ہوئے بولا "اب میاں بھائی یہ بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتے ہو؟ اگر تم بارڈر کراس کر کے واپس پاکستان جانا چاہتے ہو تو اس کا بندوبست بھی ہو سکتا ہے لیکن میں تمہیں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ کلکتے جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ وہاں تم ضرور پکڑے جاؤ گے۔ ایک تو تمھیں بنگالی زبان نہیں آتی۔ دوسرے وہاں تم جس عورت کی خاطر جاؤ گے اس کی نگرانی ہو رہی ہو گی۔ جس کا مطلب یہ ہوگا کہ تمھارے ساتھ اس عورت کو بھی پولیس پکڑے گی اور اس پر بھی پاکستان کے لیے جاسوسی کرنے کا الزام لگا دیا جائے گا۔ اور یہ یہاں بہت بڑا الزام ہوتا ہے کوئی مسلمان جب اس الزام میں پکڑ لیا جاتا ہے تو پھر اس کی لاش بھی نہیں ملتی۔"

ندیم سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے نجمی اور صرف نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر وہ بارڈر کراس کر کے کسی نہ کسی طرح واپس پاکستان پہنچ بھی جاتا ہے تو کیا اس کا ضمیر نجمی کو اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں کلکتے چھوڑ آنے پر کچوکے نہیں لگائے گا؟ نجمی کے ساتھ اس نے پہلے ہی بہت زیادتیاں کی ہیں۔ اس کی زندگی کی تباہی کا وہی ذمے دار ہے۔ اب وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ وہ تو ہندوستان میں آیا ہی اس لیے تھا کہ یہاں سے نجمی کو نکال کر لے جائے گا۔ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے ندیم نے راجو کی طرف دیکھا اور کہا "خان جی! اللہ گواہ ہے میں ہندوستان آیا ہی اس لیے تھا کہ اپنی محبوبہ کو کلکتے سے نکال کر پاکستان لے جاؤں گا۔ آپ کو شاید فقیر بیٹے نے یہ نہیں بتایا کہ جس لڑکی کی خاطر میں نے اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے۔ اتنی اذیتیں اور تشدد برداشت کیا ہے میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اس کی بربادی کی ساری ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔ ہم شادی کرنے کراچی گئے تھے کہ اسے بدمعاشوں نے اغوا کر لیا بلکہ

میرے ہی ایک دوست نے مجھے دھوکا دیا اور نجمی ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں اغوا ہوتی فروخت ہوتی یہاں پہنچ گئی۔" راجو ندیم کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کہنے لگا "تم ابھی نوجوان ہو۔ تمھاری محبت میں جوش ہے ہوش نہیں ہے۔ تم جن حالات میں گھر چکے ہو وہ کتنے سنگین ہیں تمھیں اس کا احساس نہیں ہے شاید۔ تم اپنے وطن میں نہیں ہو۔ تم ایک دشمن ملک میں ہو جہاں پولیس تمھارے خون کی پیاسی ہے۔ وہ خونخوار درندوں کی طرح تمھاری تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ وہ تمھیں پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے اور اس بار تم پکڑے گئے تو وہ تمھیں زندہ نہیں چھوڑیں گے تمھیں گولی مار دیں گے اور کوئی پوچھنے والا نہیں ہوگا۔ میں تمھیں صرف ایک مشورہ دوں گا۔" راجو نے سگریٹ کا کش لیا اور بولا "تم بارڈر کراس کرتے یا کلکتہ جانے کی بجائے دلی میں ہی اپنے سفارتخانے میں چلے جاؤ۔ وہ تمھارے ملک کا سفارتخانہ ہے۔ وہ لوگ ضرور تمھاری مدد کریں گے۔" ندیم نے پہلے بھی اس نقطے پر غور کیا تھا۔ اسے ہر بار یہی محسوس ہوا کہ اگر وہ اپنے سفارتخانے میں جا کر پناہ لیتا ہے تو وہ اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ جس لڑکی کی اس نے زندگی تباہ کی تھی اور جسے لاہور کے ایک شریف گھر سے اٹھا کر گناہ آلود ماحول میں پہنچا دیا تھا اب اس کا فرض تھا کہ وہ اسے اس دلدل سے نکال کر اپنے ساتھ واپس لے جائے۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ملک کا سفارتخانہ اس کی مدد کرنے پر شاید آمادہ ہو جائے مگر نجمی کے سلسلے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ سفارتی تعلقات کی نوعیت بڑی نازک ہوتی ہے اور کوئی بھی سفارتکار جس ملک میں وہ متعین ہو اس ملک کے ساتھ تعلقات خراب کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ ساری باتیں ندیم کے ذہن میں تھیں۔ جب اس نے راجو سے کہا "خان صاحب! یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ میں نجمی کو یہاں چھوڑ کر واپس نہیں جاؤں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہمارا سفارت خانہ شاید مجھے پناہ دیدے لیکن نجمی کے سلسلے میں وہ یقیناً مجبور ہوگا اور اگر سفارت خانے کی جانب سے نجمی کو حاصل کرنے کے لیے بھارتی حکومت کو کچھ لکھا بھی گیا تو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ یقینی طور پر کلکتہ پولیس نجمی کو فوراً گرفتار کر کے غائب کر دے گی کیونکہ ہمارے سفارت خانے کی جانب سے نجمی میں دلچسپی لینے کا مطلب یہ ہوگا کہ یقینی طور پر نجمی کا تعلق کسی ایسے گروہ سے ہے جو پاکستان کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔

راجو نے پوچھا "تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟ کیونکہ یہاں تم زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتے تمھیں یہاں سے کسی طرف جانا ہی پڑے گا۔" جب ندیم نے فیصلہ کن انداز میں کہہ دیا کہ وہ کلکتے جا کر نجمی سے ملنا اور اسے وہاں سے نکال کر کسی نہ کسی طرح مشرقی پاکستان لے جانے کی کوشش کرنا چاہتا ہے تو راجو چپ ہو گیا۔ راجو ندیم کی اگرچہ ہر طرح کی مدد کرنا چاہتا تھا اور کر رہا تھا اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو اور فقیریٹے کو بھی کسی شدید خطرے میں نہیں ڈال سکتا تھا۔ جب ندیم نے اسے کلکتے جانے کا فیصلہ دے دیا تو راجو نے کہا "اگر تم کلکتے جانے پر ہی تل گئے ہو تو میں تمھیں نہیں روکوں گا کیونکہ یہ تمھارے عاشقانہ جذبات اور تمھارے ضمیر کا معاملہ ہے۔" ندیم نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر کہا "خان صاحب! میں آپ کے اور فقیریٹے کے احسانوں کے بوجھ تلے پہلے ہی بہت دبا ہوا ہوں لیکن میں آپ سے ایک مدد کا ضرور طلب گار ہوں گا۔ کیا آپ کلکتے میں مجھے کوئی ایسا آدمی بتا سکتے ہیں جو آپ کا دوست بھی ہو اور جو مجھے اور نجمی کو وہاں سے نکال کر مشرقی پاکستان کا بارڈر کراس کروا سکے؟" راجو سوچ میں پڑ گیا۔ کلکتے میں اس کا ایک ایسا جگری یار موجود تھا جو ان دونوں محبت کرنے والوں کی مدد کر سکتا تھا لیکن راجو یہ سوچنے لگا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ معاملہ الٹ جائے اور ان کے ساتھ اس کا کلکتے والا دوست بھی گرفتار ہو جائے۔ پھر بات پیچھے کی طرف چلتی ہوئی فقیریٹے اور راجو تک بھی پہنچ سکتی تھی۔ ندیم سمجھ گیا کہ راجو کیا سوچ رہا ہے اس نے بھرپور عزم کے ساتھ کہا "خان صاحب! ایک بات آپ اپنے دل میں نقش کر لیں کہ اگر میں خدا نہ کرے پکڑا گیا تو پولیس چاہے مجھ پر جس قدر تشدد کرے۔ وہ اذیتیں دے کر مجھے مار ڈالے مگر میں خدا کو حاضر ناظر جان کر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری زبان پر آپ کا بھائی فقیریٹے کا یا آپ کے کلکتے والے دوست کا نام کبھی نہیں آئے گا۔ اور نجمی کو تو میں آپ کے بارے میں یا آپ کے کلکتے والے دوست کے بارے میں ایک لفظ نہیں بتاؤں گا۔ کیا آپ کو اب بھی مجھ پر یقین نہیں آیا؟"

راجو بھی جذباتی آدمی تھا۔ یہ لوگ واقعی بڑے جذباتی ہوتے ہیں اور جذبات میں آ کر ایسے ایسے کارنامے انجام دے جاتے ہیں کہ جن کے بارے میں دوسرا آدمی کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ راجو نے ندیم کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دبایا اور بولا "اگر تم نے یہ عہد ہی کر لیا ہے تو میں تمھاری ضرور مدد کروں گا۔ کلکتے میں میرا ایک جگری یار رہتا ہے۔ وہ میرے کہنے پر تمھاری اسی طرح مدد کرے گا جس طرح میں

اپنے یار فقیریٹے کے کہنے پر تمھاری مدد کر رہا ہوں اپنے کلکتے والے دوست کے بارے میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔ سب سے پہلے تمھیں یہاں سے نکال کر کلکتے والی ٹرین میں سوار کروانے کا مسئلہ ہے۔ میرے آدمیوں نے مجھے آج صبح ہی بتایا تھا کہ تمھاری تلاش میں اور تمھاری گرفتاری کے لیے ہوائی اڈے، بس کے اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر بھاری تعداد میں خفیہ پولیس والوں کو لگا دیا گیا ہے ان کے پاس تمھاری تصویریں بھی ہیں اس حلیے میں تم گئے تو فوراً گرفتار کر لیے جاؤ گے ابھی تمھاری داڑھی کے بال زیادہ نہیں بڑھے تم کو نقلی داڑھی مونچھ لگائی گئی تو وہ کسی بھی وقت تمھارا بھانڈا پھوڑ سکتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم داڑھی مونچھ کے بالوں کے بڑھنے تک اسی جگہ چھپے رہو۔"

ندیم نے کہا "لیکن اس کے لیے تو کافی وقت درکار ہے کم از کم ایک مہینہ لگ جائے گا۔"

"ایک مہینہ تو کم از کم لگ ہی جائے گا۔" راجو نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

ندیم بولا "کیا میں کوئی دوسرا بھیس بدل کر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔"

راجو نے کہا "مگر تم اپنے چہرے کو کہاں اور کیسے چھپاؤ گے؟" تم اتنے تجربہ کار جاسوس نہیں ہو کہ جوگی سادھو کا بھیس بدل کر اس بھیس کو نبھا سکو۔ تم ہندی بھی نہیں جانتے اور یہاں کے سادھو لوگ تو ایسی ہندی بولتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ اور پھر جوگی سادھوؤں کے سلسلے میں خفیہ پولیس والے زیادہ مشکوک ہوتے ہیں۔ میری رائے تو یہی ہے کہ تم یہاں مہینہ ڈیڑھ مہینہ رہ کر اپنی داڑھی کے بال بڑھاؤ۔ پھر داڑھی کا خط بنواؤ۔ اور کسی دیندار مولوی کا حلیہ بنا کر ویسے ہی لباس میں یہاں سے ٹرین میں بیٹھ کر کلکتے کی طرف روانہ ہو جاؤ۔"

ندیم نے پوچھا "خان صاحب! کیا ٹرین کے علاوہ کوئی ایسا طریقہ سفر کا نہیں ہے؟" اس پر راجو جیسے کچھ سوچنے لگا چند لمحوں تک وہ خاموش رہا۔ پھر بولا "اس پر غور کیا جا سکتا ہے۔ میں حیران ہوں کہ مجھے پہلے اس کا خیال کیوں نہیں آیا۔ ایک بات ہے اب مجھے خیال آ رہا ہے کہ دلی سے رات کے وقت لکھنؤ کے لیے سبزیوں کے ٹرک روانہ ہوتے ہیں۔ میرا ایک یار ٹرک ڈرائیور ہے۔ وہ ایک آڑھتی کا مال لے کر ہفتے میں دو بار دلی سے لکھنؤ جاتا ہے۔ تم اس کے ساتھ لکھنؤ تک تو جا سکتے ہو۔ اس سے آگے وہ تمھیں ایسے ٹرک میں بٹھا دے گا جو تمھیں کلکتے لے جائے گا

وہاں سے مال لے کر ٹرک کلکتے بھی جاتے ہیں۔ لیکن ایک بات تمھیں بتائے دیتا ہوں بھائی کہ آگے تمھیں اپنی ذمہ داری پر سفر کرنا ہوگا۔ اگر پکڑے گئے تو اپنے عہد کو یاد رکھنا ہمارا نام مت لینا۔"

ندیم نے ایک بار پھر راجو کو یقین دلایا کہ حالات چاہے بد سے بدتر ہو جائیں وہ کسی کا نام نہیں لے گا اور یہی کہے گا کہ وہ اپنے طور پر کسی جیل کی دیوار پھلانگ کر بھاگا تھا اور اتنے دن دلی کے قبرستانوں میں چھپا رہا تھا۔

راجو نے کہا "اب یہاں کی صورتِ حال یہ ہے کہ تم سارا دن اس تہہ خانے میں چھپے رہو گے صرف رات کو میں خود آ کر تمھیں یہاں سے نکال کر اوپر والے کمرے میں تھوڑا ٹہلاؤں گا۔ کیونکہ ہو سکتا ہے تمھیں یہاں سے نکالنے میں کچھ دن لگ جائیں۔ میں آج دن میں اپنے دوست سے ملوں گا اس سے بات کروں گا اسے سب کچھ سمجھا دوں گا پھر وہ جس پھیرے پر کہے گا تمھیں اس کے ساتھ روانہ کر دوں گا۔ تمھارے لیے کھانا بھی میں خود لے کر آؤں گا آج تو دن کے وقت میں تمھارے لیے کھانا لے آؤں گا۔ اس کے بعد ہمیشہ رات کو آیا کروں گا۔ یہ کونے میں پانی کا بھرا ہوا مٹکا پڑا ہے۔ یہ پانی باسی نہیں ہے۔ باتھ روم اوپر والے کمرے میں ہے۔ میں دن کے وقت آ کر تمھیں اوپر لے چلوں گا۔ اب میں جاتا ہوں۔"

راجو چلا گیا ندیم نے جو فیصلہ کیا تھا اس سے اس کا ضمیر مطمئن ہو گیا تھا اسے ایسا ہی کرنا چاہیئے تھا وہ نجمی کو اس کے بُرے حال پر چھوڑ کر اپنی جان بچا کر وہاں سے نہیں بھاگ سکتا تھا اسے نجمی کو ساتھ لے جانا تھا اسے پوری امید تھی کہ اگرچہ حالات کسی طرح سے سازگار نہیں ہیں اور مشن بے حد مشکل ہے لیکن وہ اللہ کی مدد سے ضرور اپنے مشن میں کامیاب ہو گا اور نجمی کو دلدل کے اس گڑھے سے ضرور نکال کر لے جائے گا وہاں سے مشرقی پاکستان کے بارڈر تک پہنچنا آسان تھا۔ یہاں سے وہ نجمی کو لے کر مغربی پاکستان کا بارڈر کراس نہیں کر سکتا تھا۔ ندیم کا جسم نیند کی لہروں پر ڈول رہا تھا وہ کمبل اوڑھ کر وہیں دری پر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا اور بہت جلد گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

وہ دن نکلنے تک سویا رہا جب اس کی آنکھ کھلی تو پہلی بار اس نے دو روشندان دیکھا جہاں

سے رات کے وقت تہہ خانے میں تازہ ہوا آتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ روشندان کم اور چوکور سوراخ زیادہ تھا اس کے آگے جھاڑیاں سی نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً یہ سوراخ کسی گڑھے میں کھلتا ہو گا۔ جسے خشک جھاڑیوں سے ڈھانپ دیا ہو گا۔ یہ جرائم پیشہ لوگوں کا گروہ تھا جن کے دل کنول کے پھول کی طرح صاف اور دوستی کے جذبات سے لبریز تھے۔ خدا جانے اس تہہ خانے میں وہ منشیات کا اسٹاک رکھتے تھے یا جوا کراتے تھے۔ ندیم کو ان لوگوں کے اس پہلو سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ راجو اسے اپنی کلائی کی گھڑی دے گیا تھا۔ ندیم نے گھڑی دیکھی اس وقت دن کے دس بج رہے تھے اسے چائے کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ روشندان میں سے دن کی روشنی بس اتنی ہی آ رہی تھی کہ ندیم کو گھڑی کی سوئیاں جھک کر بڑے غور سے دیکھنی پڑتی تھیں۔ تھوڑی دیر گزری ہو گی کہ اسے اوپر والے کمرے میں کسی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم ہمہ تن گوش ہو گیا۔ آواز کوٹھری کے فرش اور تہہ خانے کی چھت پر آ کر رک گئی پھر تختے کو اٹھانے کی آواز آئی یہ راجو کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ ندیم کمبل پرے کر کے چوکس ہو کر بیٹھ گیا یہ کوئی پولیس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ ندیم تیزی سے اٹھ کر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی ایک طرف ہو کر اس طرح کھڑا ہو گیا کہ اگر راجو کے علاوہ کوئی دوسرا آدمی ہو تو وہ اسے وہیں دبوچ کر نیچے گرا دے مگر یہ راجو ہی تھا اس نے رومال میں بندھی ہوئی روٹی وغیرہ اٹھا رکھی تھی وہ دیکھتے ہی بولا

"خدا کا شکر ہے فقیریئے پر کوئی زد نہیں پڑی میں آج صبح اس سے ملاقات کر کے آیا ہوں۔ وہ تمھارا بہت پوچھ رہا تھا۔" ندیم نے تشویش کے انداز میں پوچھا "بھائی فقیریئے پر ان لوگوں کو شک تو نہیں پڑا؟"

راجو روٹی کا رومال کھولتے ہوئے بولا "اس سے سپرنٹنڈنٹ جیل نے پوچھ گچھ ضرور کی تھی مگر فقیریئے نے صاف انکار کر دیا کہ وہ چرس بھرے سگریٹ بالکل سپلائی نہیں کرتا۔ اس کے حامی وارڈن اور دوسرے اہلکاروں نے بھی تصدیق کی کیونکہ انھیں فقیریئے سے بہت سستا نشہ میسر آ جاتا تھا۔ وہ کیسے اس پر الزام لگا سکتے تھے۔ یوں فقیریا بچ گیا۔"

ندیم نے اطمینان کا سانس لیا اور پوچھا "میرے بارے میں وہ ضرور پریشان ہو گا۔" راجو نے کہا "وہ کیوں پریشان ہونے لگا بھلا؟ کیا اسے معلوم نہیں کہ تم میرے پاس ہو بس وہ یہی

پوچھ رہا تھا کہ تم نے یہاں سے کدھر جانے کا پروگرام بنایا ہے وہ تو مجھے کہہ رہا تھا کہ ندیم کو بارڈر کراس کرا دو۔ میں نے اسے بتایا کہ ندیم کلکتے جانا چاہتا ہے اس پر وہ ضرور پریشان ہوا تھا لیکن جب میں نے ساری بات کھول کر بیان کی تو وہ چپ ہو گیا۔ آخر میں یہی کہا کہ ندیم ہمارا مسلمان بھائی ہے جہاں وہ جانا چاہتا ہے اسے حفاظت سے وہاں تک پہنچا دینا۔"

ندیم نے ایک بار پھر فقیر بیٹے کا شکریہ ادا کیا۔ راجو کھانے میں خشک بھنی ہوئی مچھلی کباب اور روٹیاں لایا تھا روٹیاں اور کباب کافی تھے وہ کہنے لگا "میں ناشتہ کر کے آیا ہوں یہ کھانا کل شام تک کے لیے کافی ہے کل رات کو میں پھر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ بنا کر لیتا آؤں گا۔"

وہ ساتھ ایک چھوٹی تھرمس میں چائے بھی بھر کر لایا تھا ندیم نے تھوڑا سا کھانا کھایا اور دونوں چائے پینے اور باتیں کرنے لگے۔ ندیم کے پوچھنے سے پہلے ہی راجو نے کہا "میں ابھی اپنے اس دوست سے نہیں مل سکا جو تمھیں اپنے ٹرک میں بٹھا کر لکھنؤ لے جائے گا دوپہر کو اس سے ملوں گا اور پھر کل شام کو تمہارے پاس آ کر تفصیل بتاؤں گا۔ آؤ میں تمھیں اوپر باتھ روم سے پڑس۔"

باتھ روم اوپر والی کوٹھڑی کے ساتھ ہی تھا جب ندیم باتھ روم سے منہ ہاتھ دھو کر باہر نکلا تو راجو اسے دوبارہ واپس نیچے تہہ خانے میں لے آیا اور کہنے لگا کہ تم اگر چاہو تو خود تہہ خانے کا تختہ اوپر اٹھا کر باتھ روم میں جا سکتے ہو میں نے اوپر لکڑی کے بھاری تختے اٹھا لیے ہیں صرف خالی بوریاں ہی ڈال دی ہیں۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر راجو چلا گیا۔ ندیم اپنے الجھے ہوئے اضطراب انگیز خیالات میں غوطہ زن ہو گیا اس کے سامنے بلا شبہ ایک خطرناک مرحلہ تھا چاروں جانب اوپر زمین پر انڈین انٹیلی جنس اور پولیس کا جال بچھا ہوا تھا وہ کہیں بھی کسی بھی وقت اس جال میں الٹ کر پکڑا جا سکتا تھا اور اس بار پکڑے جانے کا مطلب سوائے ایک اذیت ناک موت کے اور کچھ نہیں تھا انڈین انٹیلی جنس اس دفعہ یہ سوچ کر تشدد نہیں کرے گی کہ اسے زندہ بھی رکھنا ہے اس کی موت یقینی تھی ندیم نے سگریٹ سلگا لیا اور نیم روشن تہہ خانے میں کمبل اوپر کر کے لیٹ گیا۔ اس کے ذہن میں نجمی کی اداس شکل گردش کر رہی تھی کیا وہ نجمی کو دشمن کے بچھائے ہوئے جال سے نکال کر بارڈر کراس کرا سکے گا؟ اس سوال کا جواب ندیم کے پاس نہیں تھا۔

۔۔ ۔۔ ٭ ۔۔ ۔۔

دوسرے دن رات کے آٹھ بجے کے قریب راجو تہہ خانے میں آ گیا۔ وہ ندیم کے لیے مزید کھانا لایا تھا۔ کھانے کا تھیلا ایک طرف رکھتے ہوئے راجو اپنی اونی ٹوپی اتارتے ہوئے بولا... "میرا خیال تھا کہ چھدا ابھی حامی نہیں بھرے گا وہ دوسرے یا تیسرے پھیرے پر تمھیں ساتھ لے جائے گا مگر قسمت تیری یاوری کر رہی ہے۔ ندیم بھائی... چھدا تمھیں اس ہفتے کے پھیرے پر ہی ساتھ لے جانے کو تیار ہو گیا ہے۔" چھدا اس ڈرائیور کا نام تھا جو راجو اور فقیر بیٹے کا مشترکہ دوست تھا اور جو دلی سے سبزیوں کا بھرا ہوا ٹرک لے کر ہفتے میں دو بار میرٹھ جاتا تھا۔ راجو نے کہا... "تم پرسوں چھدے کے ساتھ دلی سے لکھنؤ کی طرف روانہ ہو جاؤ گے.... وہ رات کے گیارہ بجے دلی اڈے سے روانہ ہوتا ہے مگر تم دلی والے اڈے سے ٹرک میں نہیں بیٹھو گے۔ تمھیں دلی سے باہر غازی آباد والی سڑک کے پاس ایک جگہ سے اٹھایا جائے گا وہاں تک تمھیں میں لے کر جاؤں گا۔ اب تمھیں پہلا کام تو یہ کرنا ہوگا کہ میں کل رات سیفٹی ریزر وغیرہ لاؤں گا تم اپنے سر کے سارے بال مونڈ ڈالو گے۔ مونچھوں اور داڑھی کے خط بناؤ گے اس کام میں میں تمھاری مدد کروں گا تمھیں بنگالیوں ایسا کرتہ پاجامہ پہننا ہوگا اور اوپر سویٹر اور گرم شال اوڑھ لو گے۔ سویٹر تم کلکتے پہنچ کر کسی جگہ پھینک دینا کیونکہ وہاں اتنی سردی نہیں ہو گی۔ گرم شال تم مسلمان بنگالیوں کی طرح اپنے کاندھے پر ڈالے رکھنا۔ ایک تسبیح بھی میں تمھیں لا دوں گا جو تم اپنے گلے میں ڈال لینا لیکن کوشش کرنا کہ تم دن کے وقت زیادہ لوگوں کے سامنے نہ جاؤ تمھیں اپنی معشوقہ تک پہنچنے کے لیے جو کچھ بھی کرنا پڑے وہ شام ہونے کے بعد ہی کرنا تمھاری تصویر بنگال میں بھی پہنچ گئی ہے اور کلکتہ پولیس کی تم حراست میں بھی رہے ہو۔ وہاں تمھارے پہچانے جانے کا خطرہ زیادہ ہے۔ اس لیے تمھیں وہاں زیادہ احتیاط کی ضرورت پڑے گی

دوپہر تک راجو ندیم کے پاس بیٹھا ایسی ہی باتیں کرتا رہا پھر اگلے روز شام کو آنے کا وعدہ کرکے چلا گیا۔ ندیم نے کسی نہ کسی طرح وہ رات اور دوسرا دن بھی گزار لیا۔ دوسرے دن کی شام ہوئی تو راجو آ گیا وہ اپنے ساتھ سیفٹی ریزر کی بجائے اُسترا لایا تھا۔ ایک گٹھڑی میں ندیم کے لیے بنگالی طرز کا کھدر کا کُرتا پاجامہ اور گرم شال اور تسبیح وغیرہ تھی۔ ایک بنگالی طرز کی چپل بھی تھی۔ راجو نے خود ہی ندیم کے سر کے سارے بال اتار کر ٹنڈ کر دی پھر جس طرح سے بھی ہو سکا اس کی تھوڑی بڑھی ہوئی داڑھی اور مونچھوں کے خط بنا ڈالے۔ ندیم نے بنگالی کُرتا پاجامہ اور گرم شال وغیرہ دیکھے اور راجو اس کے لیے جو تکلیف اٹھا رہا تھا اس کے لیے شکریہ ادا کیا۔ راجو نے ایک سگریٹ سلگا کر ندیم کو دیا اور دوسرا سگریٹ خود ہونٹوں میں دبا کر کش کھینچتے ہوئے کہا ......
"میاں بھائی شکریہ کس بات کا؟ بھائی بھائی کی مدد کیا ہی کرتے ہیں .... اب جو کچھ میں کہوں غور سے سنو۔" راجو نے ایک کش اور لگایا اور بولا ...."پہلے تم کھانا کھا لو میں تھرمس میں سے چائے نکال کر پیتا ہوں۔ اس کے بعد گفتگو ہوگی۔ آج تمھارے لیے دلی کی خاص نہاری اور گولہ کباب لایا ہوں۔ ساتھ پراٹھے بھی ہیں" ندیم نے بڑے شوق سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ راجو چائے پیتا رہا۔ جب ندیم کھانا کھا چکا اور چائے پینے لگا تو راجو بولا ...."اب سنو.... کل رات میں تمھارے پاس رات کے ٹھیک نو بجے آؤں گا یہاں سے میں تمھیں اپنے ساتھ نازی آباد والی سڑک پر اس مقام تک لے جاؤں گا جہاں میرے یار چھدے کا ٹرک پہلے سے موجود ہوگا۔ اس نے ٹرک کا بونٹ کھول کر اسے مرمت کے بہانے کھڑا کر رکھا ہوگا .... اس کا کلینر بھی اس کے ساتھ ہوگا۔ کلینر کو اس نے کچھ نہیں بتایا ہے ہم ٹرک سے دور ایک خاص جگہ کھڑے ہو جائیں گے کیونکہ اس کا کلینر مجھے جانتا ہے میں اسے اپنی شکل نہیں دکھاؤں گا۔ چھدا خود ہی ٹھیک وقت پر ہمارے پاس آ جائے گا میں تمھیں اس کے حوالے کر کے فوراً واپس چلا جاؤں گا وہ اپنے کلینر سے تمھارے بارے میں یہ کہے گا کہ تم نے اسے لکھنؤ تک جانے کے لیے پچاس روپے ادا کیے ہیں اور چونکہ تمھاری ماں لکھنؤ میں بیمار ہے اور تمھیں کوئی بس یا ٹرین نہیں ملی اس لیے تم اس ٹرک میں لکھنؤ جلدی سے جلدی پہنچنا چاہتے ہو.... وہاں سے چھدا تمھیں خود ہی سمجھا دے گا تم اپنا نام مولوی باقر بتاؤ گے اس کی ضرورت تو نہیں پڑے گی۔ لیکن راستے میں بالفرض اگر کلینر یا کسی دوسرے شخص نے تم سے تمھارا نام پوچھ لیا تو مولوی باقر

ہی بتانا .... اس نام کو ذہن میں اچھی طرح سے یاد کر لینا تم لکھنؤ کے سیٹھانی محلّے کے رہنے والے ہو۔ وہاں اسلامیہ مکتب میں بچوں کو اردو پڑھاتے ہو۔ تمھاری صرف ایک ماں ہی زندہ ہے جو بیمار ہے۔ تم دلی کسی درسگاہ کی زیارت کو آئے تھے تمھیں تمھاری اماں کی بیماری کی خبر ملی اور تم راتوں رات واپس اپنے گھر جا رہے ہو۔"

ندیم نے یہ ساری باتیں اچھی طرح سے یاد کر لیں۔ راجو دوسرے دن رات کو نو بجے آنے کا کہہ کر چلا گیا وہ رات اور اس سے اگلا دن بھی گزر گیا دوسرے دن رات کو ندیم نے کھدر کا بنگالی کُرتہ پاجامہ اور اس کے اوپر سویٹر پہن لیا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا۔ داڑھی مونچھ کے خط بنے ہوئے تھے۔ اس کے پاس آئینہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے اپنے سر اور چہرے پر ہاتھ پھیر کر اندازہ لگا لیا کہ اس کا حلیہ کافی بدل گیا ہے اور صرف قریب سے دیکھنے پر ہی اسے کوئی پہچان سکے گا۔ تسبیح اس نے اپنی کلائی کے ساتھ لپیٹ لی تھی۔ ٹھیک نو بجے اسے اوپر کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی یہ راجو ہی تھا۔ اب ندیم اس کے قدموں کی چاپ پہچاننے لگا تھا۔ تھوڑی دیر میں وہ نیچے تہہ خانے میں آ گیا۔ ندیم نے موم بتی روشن کر رکھی تھی اسے بالکل تیار دیکھ کر راجو بولا ...."میں تمھارے لیے ایک گول اونی ٹوپی بھی لایا ہوں اسے پہن لو۔" اس نے جیب میں سے نسواری رنگ کی ایک گول اونی ٹوپی نکال کر ندیم کو دی جو اس نے اپنے سر پر پہن لی۔ یہ اس کے کانوں تک آ گئی "اب میرے ساتھ آ جاؤ" اور ندیم اس کے ساتھ تہہ خانے کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی کوٹھری اور پھر وہاں سے کوارٹر کے بڑے بیرک نما کمرے میں سے گزر کر کوارٹر کے باہر آ گیا۔ کتنے دنوں بعد وہ کھلی سرد فضا میں آیا تو اسے شدید سردی کا احساس ہوا....
اس نے اپنا کمبل وہیں چھوڑ دیا تھا اور سویٹر کے اوپر گرم شال اوڑھ رکھی تھی۔ راجو اسے لے کر غیر ہموار میدان کو عبور کر کے چھوٹی کچی سڑک پر آ گیا .... آج رات وہ گاڑی کی بجائے اپنے ساتھ موٹر رکشا لایا تھا.... موٹر رکشا بھی اس کا دوست گاڑی والا آدمی ہی چلا رہا تھا یہ اس کا اپنا آدمی تھا۔ یہی آدمی ندیم کو جیل سے پہلے والے خفیہ ٹھکانے تک لایا تھا۔ ندیم اور راجو رکشے میں سوار ہو گئے اور رکشا کچی سڑک پر سے ہوتا ہوا پکی سڑک پر آ گیا .... شروع رات تھی اس سڑک پر ٹریفک چل رہی تھی مگر رات کا وقت تھا اور وہاں روشنیاں زیادہ نہیں تھیں .... خدا جانے رکشا کون کون

بارونق سڑکوں پر سے ہوتا ہوا ایک ایسی کشادہ سڑک پر آگیا جہاں ٹرک بھی چل رہے تھے راجو نے ندیم کی طرف جھک کر کہا...."یہ سڑک سیدھی دلی سے کلکتے کو جاتی ہے اسے جی ٹی روڈ بھی کہتے ہیں.... ہندوؤں نے اس کا نام کچھ اور ہی رکھ چھوڑا ہے۔" بڑی سڑک پر رکشا دیر تک سفر کرتا رہا۔ ندیم نے پوچھا ....."ابھی غازی آباد کتنا دور ہے" تو راجو بولا ...."فکر نہ کرو ہم اپنی منزل پر پہنچنے ہی والے ہیں جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے اسے اچھی طرح سے یاد کر لیا ہے نا تم نے؟ تمھارا نام مولوی باقر علی ہے تم لکھنؤ کے سیٹھانی محلّے کے اسلامیہ مکتب میں استاد ہو۔ تمھاری والدہ بیمار ہے اور تم جلدی سے جلدی اپنے گھر پہنچنا چاہتے ہو۔" ندیم نے سر کو اثبات میں ہلاتے ہوئے کہا کہ اس نے سب کچھ رٹ لیا ہے۔ رکشے کی رفتار ہلکی ہو گئی .... ڈرائیور نے راجو سے کہا ...."خان صاحب! چھدے کا ٹرک سڑک کی ایک طرف کھڑا ہے۔" راجو نے کہا ...."ٹھیک ہے تم اس سے پچاس قدم پیچھے سڑک کے کنارے درختوں میں رکشا کھڑی کر دو۔" اس کے ساتھی ڈرائیور نے ایسا ہی کیا..... رکشا درختوں کے نیچے اندھیرے میں رک گیا۔ راجو اور ندیم نیچے اتر آئے .... راجو نے کوٹ کی جیب میں سے ایک رومال نکال کر ندیم کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا ...."اس میں ایک ہزار روپے ہیں میں اس سے زیادہ نہیں کر سکا.... مجھے افسوس رہے گا اسے قبول کر لو۔" ندیم کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے .... وہ دلی کے ان مخلص اور اسلام کے نام پر اپنی زندگیوں کو موت کے منہ میں ڈال لینے والے انسانوں کے جذبے سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ اس نے راجو کا ہاتھ تھام لیا اور جذبات سے بھری ہوئی آواز میں بولا ...."بھائی راجو! تمھارے یہ ایک ہزار میرے لیے انمول ہیں، میں تمھارا اور فتیر بیٹے کا احسان ساری زندگی [illegible] نہیں کر سکوں گا۔" راجو نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر دباتے ہوئے کہا ...."ارے میاں بھائی کیسی باتیں کر رہے ہو .... یہ تو ہمارا فرض تھا، کیا انسان اپنا فرض پورا نہیں کیا کرتے؟ چاہے فرض پورا کرنے کے لیے جان کی بازی ہی کیوں نہ لگانی پڑے .... اچھا اب تم اُدھر درختوں کے پیچھے آ جاؤ.... چھدے نے ہمیں دیکھ لیا ہے۔ وہ دیکھو اس کے ٹرک کا بونٹ کھلا ہے کلینر اس پر جھکا ہوا ہے اور وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔" ایک اونچا لمبا چھریرے بدن کا آدمی جس نے پھولی ہوئی گرم جرسی پہن رکھی تھی، اپنے دونوں ہاتھ گرم پتلون کے پہلوؤں سے رگڑتا ان کی طرف بڑھ رہا

تھا قریب آ کر وہ جلدی سے راجو کی بائیں جانب ہو گیا اور ندیم کی طرف اندھیرے میں گھور کر دیکھنے لگا ...."یہ نوجوان ہے مولوی باقر علی عرف ندیم میاں۔" راجو نے کہا ...."ہاں چھدے .... اب جیسے تمھیں سمجھایا ہے ویسے ہی کرنا۔ لکھنؤ پہنچ کر اسے اپنے دوست کے ساتھ کر دینا جو اسے کلکتے پہنچا دے گا۔" چھدا بولا ...."تم فکر نہ کرو لالہ .... اسے کلکتے پہنچا ہی سمجھو۔" اب راجو نے جیب سے ایک تہہ کیا ہوا چھوٹا سا رقعہ نکال کر ندیم کو دیا اور بولا ..."کلکتے میں ذکریا اسٹریٹ مسلمانوں کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں پرانے امرتسر کے کشمیری بھی آباد ہیں۔ یہ لوگ شالوں کا دھندا کرتے ہیں۔ وہاں کا ایک مشہور ہوٹل امجدیہ ہوٹل ہے تم یہ رقعہ اس ہوٹل کے مالک جبار علی کو جا کر دے دینا جبار علی کی بڑی بڑی مونچھیں ہیں، رنگ سانولا ہے، بدن اکہرا ہے اور ناک پر جلے ہوئے زخم کا داغ ہے یہ رقعہ صرف اسی کو دینا۔ یہ رقعہ پڑھ کر وہ تمھیں ایک ایسے شخص سے ملوا دے گا جو تمھارے بنگال کا بارڈر کراس کرانے کا بندوبست کر دے گا اب تم جا کر ٹرک میں بیٹھو .... چھدے! تو بھی اب جا بیٹھ کلینر کو شک نہ ہو جائے۔" ندیم رقعہ ہاتھ میں لیے کھڑا تھا کہ راجو جلدی سے رکشے میں بیٹھ گیا اور رکشا واپس روانہ ہو گیا۔ چھدے نے ندیم سے کہا ...."آجاؤ بابو جی میرے ساتھ۔ کلینر نے پوچھا تو وہی بتانا جو راجو نے تمھیں اور مجھے بتایا ہے۔" راجو نے ندیم کو جو کچھ بتایا تھا وہ اسے زبانی حفظ ہو گیا تھا مگر کلینر نے اس سے کچھ نہ پوچھا۔ جب وہ ٹرک کے قریب گیا تو کلینر نے اپنے استاد کی طرف دیکھا۔ چھدے نے کہا ..."مولوی صاحب ہیں ان کی والدہ بیمار ہے جلدی لکھنؤ پہنچنا چاہتے ہیں۔ چل پیچھے جا کر اینٹ نکال اور پیچھے ہی ٹوکروں میں بیٹھ جا۔" چھدے نے ندیم کو ٹرک میں اپنی ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ بٹھا لیا اور تھوڑی دیر بعد ٹرک لکھنؤ کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ ٹرک میں یہ کافی لمبا سفر تھا۔ ساری رات ٹرک شاہراہ پر چلتا رہا مشرق میں صبح کا اجالا نیلے غبار کی شکل میں ابھر رہا تھا کہ ٹرک بریلی پہنچا۔ یہاں ٹرک اڈے میں رک گیا۔ چھدے نے راستے میں ندیم کو بہت سی باتیں سمجھا دی تھیں کہ اسے راستے میں کیا کچھ کرنا ہو گا۔ چنانچہ بریلی پہنچتے ہی ندیم ٹرک سے اتر کر چائے کے ہوٹل کی طرف آ گیا یہاں اس نے منہ ہاتھ دھویا اور چائے منگوائی۔ تھوڑا بہت ناشتہ کیا اور پھر اڈے کی مسجد میں صبح کی نماز پڑھنے چل دیا۔ وہ اس وقت تک مسجد میں ہی بیٹھا رہا جب تک کہ چھدا وہاں نہیں آیا۔ چھدے کے ساتھ وہ واپس

ٹرک میں آکر بیٹھ گیا اور ٹرک اپنے سفر پر روانہ ہوگیا۔ مراد آباد راتوں رات گزر گیا تھا اور چھیدے نے جان بوجھ کر وہاں ٹرک نہیں روکا تھا۔ اب آگے شاہجہان پور کا شہر آتا تھا۔ اس کے بعد لکھنؤ... دوپہر کا کھانا انھوں نے شاہجہان پور میں کھایا... یہاں بھی چھیدے نے ندیم کو ایک مسجد دکھا دی اور جتنی دیر ٹرک وہاں کھڑا رہا ندیم مسجد میں ہی بیٹھا تسبیح پھیرتے ہوئے خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتا رہا۔

شام ہو رہی تھی کہ ٹرک لکھنؤ کے مضافات میں داخل ہوگیا۔ اس شہر کے بارے میں ندیم نے بہت کچھ سن رکھا تھا اگر وہ عام حالات میں یہاں آتا تو اس شہر کی ضرور سیر کرتا لیکن اب صورت حال دوسری تھی۔ شہر میں جگہ جگہ روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ٹرک جی ٹی روڈ پر سے گزرتا ہوا بہت بڑی سبزی منڈی کے احاطے میں داخل ہو کر ایک طرف رک گیا جیسا کہ چھیدے نے ندیم کو ہدایت دی تھی۔ ٹرک کے رکتے ہی ندیم اگلی سیٹ پر سے اترا اور ایک کھمبے کے پاس چبوترے پر جا کر شال اچھی طرح سے لپیٹ کر بیٹھ گیا۔ یہاں سردی تھی کوئی دس منٹ کے بعد چھیدا اسے اپنی طرف آتا دکھائی دیا وہ اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے ندیم کے قریب سے گزر گیا سبزی منڈی میں کئی دوسرے ٹرک بھی کھڑے تھے جن میں سے سبزیوں کے ٹوکرے اور بڑے بڑے گٹھڑ نیچے اتارے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ بلب روشن تھے ایک جانب چائے خانوں کی قطار تھی جہاں ڈرائیور اور دوسرے لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ فلمی گانوں کی ریکارڈنگ بھی ہو رہی تھی۔ ندیم کے لیے لکھنؤ شہر بالکل اجنبی تھا دو سکھ آپس میں پنجابی میں باتیں کرتے اس کے قریب سے گزر گئے۔ انھوں نے ندیم کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ ندیم کی نظریں دس بارہ قدم آگے چلتے چھیدے پر تھیں۔ وہ ایک سڑک پر آکر رک گیا۔ سڑک پر کافی رونق تھی لوگ آجا رہے تھے۔ ندیم کو ایک سپاہی نظر آیا جو چھڑی ہاتھ میں لیے ایک دکان کے باہر کھڑا لوگوں کو آتے جاتے دیکھ رہا تھا۔ ندیم ایک طرف کو سمٹ کر کھڑا ہوگیا۔ چھیدا بھی سڑک کے کنارے کھڑا شاید کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا اتنے میں اس نے ایک خالی رکشے کو اشارے سے روکا اسی میں بیٹھا اور رکشا لے کر ندیم کے پاس آگیا۔ ندیم جلدی سے اس میں سوار ہوگیا اور رکشا آگے کو چل دیا۔ چھیدے نے ندیم سے کوئی بات نہ کی۔ رکشا بارونق بازاروں میں سے گزرتا ایک کشادہ سڑک پر آگیا اس سڑک کی دونوں جانب اونچی

اونچی عمارتیں تھیں جن میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ کاریں، تانگے اور رکشے اس کے قریب سے سڑک پر گزر رہے تھے۔ سڑک طویل تھی کافی آگے جا کر رکشے نے ایک موڑ کاٹا اور اس سے نسبتاً خاموش سڑک پر آگیا اس سڑک کی ایک جانب کوٹھیاں بنگلے تھے اور دوسری جانب میدان تھا جو ندیم کو کھیل کا میدان لگا۔ رکشا یہاں سے بھی آگے گزر گیا پھر دریا کا پل آگیا یہ گومتی کا دریا تھا اس کا پل کافی چوڑا اور عظیم الشان تھا جگہ جگہ کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ اندھیرے میں ندیم نے دیکھا کہ دریا کی سطح پر پل کی روشنیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ چھیدا بولا... "مولوی جی! خدا نے چاہا تو آپ کی والدہ اب بالکل ٹھیک ہوں گی" شاید یہ جملہ وہ رکشا ڈرائیور کو سنانا چاہتا تھا۔ ندیم نے کہا "اللہ فضل کرے گا.... اللہ فضل کرے گا۔" چھیدے نے ندیم کا ہاتھ اس طرح سے دبایا جیسے کہہ رہا ہو تم نے بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دیا شاباش..... پل پر سے اترنے کے بعد رکشا بڑی سڑک چھوڑ کر ایک ایسی چھوٹی سڑک پر آگیا جہاں اتنی روشنی نہیں تھی اس کی دونوں جانب ایک منزلہ کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ ہر کوارٹر کے باہر ایک بتی جل رہی تھی۔ سردی کی وجہ سے یہاں کے لوگ باہر برآمدوں میں بیٹھے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ان کوارٹروں کے عقب میں کسی عمارت پر نیون سائن کی روشنیاں جل بجھ رہی تھیں۔ اس علاقے سے بھی رکشا نکل گیا۔ ندیم نے اپنی بائیں جانب دیکھا تو ادھر سے سڑک کے ساتھ ساتھ لگے کھمبوں کی طویل قطار دکھائی دی جس کی روشنیاں دور تک چلی گئی تھیں۔ یقیناً یہ جی ٹی روڈ تھی اور چھیدا کافی آگے جا کر ایک بار پھر جی ٹی روڈ یعنی لکھنؤ سے کلکتے جانے والی بڑی شاہراہ کے قریب نکل آیا تھا مگر یہ سڑک کافی فاصلے پر تھی اور رکشا اس کی دائیں جانب یعنی مخالف سمت ایک مضافاتی بستی کے کنارے جا کر رک گیا۔ چھیدے نے اترتے ہوئے ندیم سے کہا..... "آئیے مولوی صاحب! آپ کا گھر آگیا فکر نہ کریں والدہ صاحبہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں گی۔" ندیم رکشے سے اتر کے ایک طرف کھڑا ہوگیا اور بولا "بس اللہ سے دعا کیجیے بھائی صاحب" اتنی دیر میں چھیدے نے رکشے والے کو کرایہ ادا کیا اور وہ رکشے کو بیک کر کے جدھر سے آیا تھا ادھر کو چل دیا۔ چھیدے نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔۔ "واہ میرے یار تم نے تو کمال کر دیا اگر تم نے اسی ہوشیاری اور سمجھداری سے کام لیا تو تم بڑی سلامتی کے ساتھ کلکتے پہنچ جاؤ گے" ندیم نے پوچھا... "کیا مجھے یہاں سے کلکتے کے لیے ٹرک

پکڑنا ہوگا۔" چھدے نے ندیم کا بازو پکڑ کر بستی کی طرف چلتے ہوئے کہا... "میرے بھائی! اتنی جلدی ٹرک کہاں ملے گا؟ تمھیں آج رات اور کل کا دن یہاں ایک مکان میں بسر کرنا ہوگا۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں یہاں کوئی تمھاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھ سکتا تم بالکل محفوظ ہوگے۔" وہ بستی میں داخل ہونے کی بجائے اس کے عقب کی طرف آگئے۔ یہاں باہر میدان میں بڑے بڑے گڑھے تھے جن میں کوڑا کرکٹ بھرا پڑا تھا۔ چھدا کہہ رہا تھا... "وہ سامنے والی جو سڑک دیکھ رہے ہو یہ سیدھی کلکتے کو جاتی ہے یہیں گڈز ٹرانسپورٹ والوں کا گودام ہے اور یہیں سے میرا دوست چاند خان ٹرک میں مال بھر کر کلکتے جاتا ہے وہ ہفتے میں صرف ایک پھیرا آنے جانے کا لگاتا ہے کیونکہ کلکتہ یہاں سے کافی دور ہے اور بیچ میں ایک رات بھی پڑتی ہے جو تمھیں بنارس یا گیا شہر میں بسر کرنی ہوگی۔" ندیم نے پوچھا... "کیا آپ نے اسے میرے بارے میں کچھ بتایا ہے؟" چھدا ہنس دیا۔ بولا... "ابھی تو میں اسے ملا بھی نہیں بس بتانا کیا ہے ابھی دو باتیں کروں گا اور تمھیں اس کے حوالے کر دوں گا۔" ندیم کو فکر لگی تھی کہ کہیں اس کا راز نہ کھل جائے اور کوئی پولیس کے اعلان شدہ انعام کی رقم کے لالچ میں آکر اسے پولیس کے حوالے نہ کر دے۔ اس نے دبی زبان میں کہا... "آپ کا یہ دوست قابل اعتبار ہی ہوگا۔"

چھدے نے کہا... "اگر قابل اعتبار نہ ہوتا تو میں تمھیں کبھی اس کے پاس لے کر نہ آتا۔ میرے بھائی ہمارے یار تو یار پر جان نچھاور کر دیتے ہیں اور یہ میرا یار جس کا نام چاند خان ہے کھرا اور نڈر آدمی ہے۔ اس نے میری خاطر میرے ایک دشمن کو چاقو بھی مار دیا تھا.... تم بالکل فکر مت کرو چاند خان تمھیں اپنی حفاظت میں کلکتے پہنچا دے گا آگے تم جانو تمھارا کام..... بستی کے کونے میں ایک گلی کی نکڑ پر ایک گھنا پیڑ تھا یہاں ایک کوارٹر نما مکان کی عقبی دیوار کے ساتھ ایک بلب جل رہا تھا جس کی روشنی میں نیچے ڈھلان اور گڑھے میں کوڑا کرکٹ نظر آتا تھا۔ اس گڑھے میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا جو سردی کی وجہ سے زیادہ اوپر نہیں جا رہا تھا اس کوارٹر کا دروازہ گلی میں تھا۔ چھدا گلی میں پہنچ کر رک گیا اس نے ندیم کو باہر ہی رکنے کو کہا اور خود کوارٹر کا دروازہ ذرا سا کھول کر ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا یہاں اس نے چاند خان کو آواز دی۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ ندیم کو باہر سردی محسوس ہونے لگی تھی گرم شال اور سویٹر لکھنؤ شہر کی رات کی سردی کا

مقابلہ کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ دیوار کے ساتھ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ کوئی تین منٹ کے بعد چھدا کوارٹر سے باہر آیا اور اسے اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ ایک کمرے میں بھوری آنکھوں اور گوری رنگت والا چوڑا چکلا آدمی انگیٹھی پلنگ کے پاس رکھے بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں اور بال گنگریالے تھے عمر چالیس سے کچھ اوپر ہو گی۔ ندیم کی طرف اس نے ایک پل کے لیے گھور کر دیکھا۔ ندیم نے سلام کیا اور اس نے ندیم سے ہاتھ ملایا اور کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر چھدے کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولا... "تم جو پینا چاہو میرے پاس موجود ہے۔" چھدا سگریٹ سلگا رہا تھا کہنے لگا.... "چاند خان پیارے! مال ابھی ٹرک ہی میں بھرا ہے۔ ابھی جا کر اسے اتروانا ہے۔ تم میرے مہمان کو سنبھال لو میں ابھی کل کا دن بھی لکھنؤ میں ہی ہوں۔" چاند خان اپنی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا.... "مگر میں تو کل رات مال لے کر جا رہا ہوں۔ چھدا بولا.... تو پھر کیا ہوا پیارے۔ واپس آؤ گے تو محفل جما لیں گے۔ اگلے پھیرے پر سہی۔ چھدا اٹھ کھڑا ہوا۔ چاند خاں نے کہا.... کیا چائے بھی نہیں پیو گے؟" چھدے نے کہا.... وہ سالا شام لال کوئی ہیرا پھیری نہ کر جائے۔ بڑا چالاک آدمی ہے۔ میرا اڈے پر پہنچنا ضروری ہے۔" اس نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا.... "پیارے! اب تم چاند خاں کے سپرد ہو گئے کسی قسم کا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بس کلکتے پہنچے ہی سمجھو۔" چھدا چاند خان سے ہاتھ ملا کر جانے لگا تو چاند خان نے پوچھا کہ فقیریئے کی کتنی قید باقی رہ گئی ہے۔ چھدے نے کہا.... "یہی کوئی تین ایک سال کی قید باقی ہے اسے یوں چٹکی بجاتے گزر جائیں گے ..... اچھا السلام علیکم۔" ندیم کرسی پر خاموش بیٹھا تھا۔ انگیٹھی کی وجہ سے اب سردی کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ چاند خان نے پلنگ کے سرہانے کے نیچے سے اعلیٰ قسم کے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر کھولا اور ندیم کی طرف بڑھا کر بولا... "سگریٹ پیو۔" ندیم نے شکریئے کے ساتھ سگریٹ سلگا لی۔ چاند خان پلنگ پر سے اٹھا گرم چادر کاندھے پر اوڑھی اور چپل پہنتے ہوئے کہنے لگا.... "میرے ساتھ آؤ تمھیں وہ کمرہ دکھا دوں جہاں تم رات کو سوؤ گے۔" یہ کمرہ بیٹھک کے ساتھ ہی تھا بیچ میں ایک چھوٹا سا دالان پڑتا تھا۔ اس دالان میں ایک طرف غسل خانہ تھا جس کے باہر چوکی اور بالٹی رکھی ہوئی تھی کمرے میں چارپائی پر بستر تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ چارپائی کے پاس ہی لوہے کی چھوٹی سی گول میز

بھی تھی۔ کارنس پر کاغذ کے پھولوں کا گلدستہ لکڑی کے گلدان میں لگا تھا۔ چاند خان نے بستر کھول دیا اور بولا ...."تم آرام کرو.... میں تمھارے لیے کھانا لاتا ہوں۔ ندیم بستر پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹ گیا۔ اس نے لحاف اوپر کر لیا اسے بہت سکون کا احساس ہوا کتنے اچھے تھے یہ لوگ اور کس طرح اس کے کام آ رہے تھے۔ رات اور دن بھر کے ٹرک کے سفر کے بعد ندیم کا سر چکرا رہا تھا اور وہ بڑی جلدی سو جانا چاہتا تھا۔ اسے بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ چاند خان اس کے لیے خود کھانا لے آیا اس نے اپنے سامنے ندیم کو کھانا کھلایا اور بولا ...."غسل خانہ دالان میں بالکل سامنے ہے یہاں بے فکر ہو کر سونا کوئی تمھاری طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا اب میں صبح ناشتے کے وقت ملوں گا اندر سے کنڈی لگانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

چاند خان چلا گیا ..... ندیم نے دروازہ بند کر لیا اور اندر سے کنڈی نہ لگائی اس نے گرم شال ایک طرف رکھ دی اور بستر میں گھس کر لحاف اوڑھ لیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ نیند میں ڈوب گیا تھا اور بے خبر ہو کر گہری نیند سو رہا تھا۔ اسے کمرے کی بتی بجھانی بھی یاد نہیں رہی تھی۔ ندیم اگلے روز دس بجے دن چڑھے تک سویا رہا اس دوران چاند خان دوبارہ آ کر اسے دیکھ گیا تھا۔ سوا گیارہ بجے تک ندیم نہا دھو کر فارغ ہو چکا تھا کہ چاند خان اس کے لیے پوری حلوے کا ناشتہ لے آیا۔ چینک میں گرم گرم چائے بھی تھی۔ چاند خان اپنی پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے بولا ...."میں ناشتہ کر چکا ہوں صرف چائے پیوں گا۔" وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پوچھا .... "کلکتے میں تمھیں امجدیہ ہوٹل جانا ہے مجھے یہی بتایا گیا ہے کیا تم پہلے کبھی اس علاقے میں گئے ہو؟" ندیم نے کہا ...."بالکل نہیں گیا خان صاحب بس دریا کے کنارے والی ایک آبادی تک ہی گیا تھا۔" "کوئی بات نہیں" چاند خان نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا "میں خود تمھیں امجدیہ ہوٹل تک چھوڑ آؤں گا ہم آج رات بنارس چلے جائیں گے۔ دوسرے دن رات کو کلکتے پہنچیں گے۔ میں اسّی میل سے کم پر ٹرک نہیں چلاتا۔ پھر بھی کلکتے پہنچتے پہنچتے رات ہو ہی جاتی ہے۔" دوپہر کو چھیدا بھی ندیم سے ملنے آ گیا اس نے ندیم سے کہا ...."مال وال کی ضرورت ہو تو بتا دینا۔" ندیم نے شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس کے پاس کافی پیسے ہیں۔ چاند خان نے کہا ...."تم ہمارے یار کے یار ہو جس چیز کی ضرورت ہو بے دھڑک

مانگ لینا۔" ندیم نے چاند خان کا بھی شکریہ ادا کیا۔ دوپہر کے بعد ندیم نے شام تک آرام کیا رات کا کھانا چاند خان نے اڈے پر جا کر کھایا اور ندیم نے کمرے میں کھا لیا۔ چاند خان اپنے ٹرک .... کی روانگی کے انتظامات کے لیے گیا ہوا تھا وہ رات کے دس بجے واپس آیا اس نے چھیدے کی طرح ندیم سے ایسی کوئی بات نہ کی کہ کلینر پوچھے تو یہ کہنا اور یہ نہ کہنا۔ ٹھیک گیارہ بجے رات چاند خان نے ندیم کو ساتھ لیا اور اندھیری رات میں کوارٹر سے نکل کر جی ٹی روڈ والے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا یہ گڈز ٹرانسپورٹ کا اڈا تھا اور یہاں دو بڑے بڑے اونچی چھت والے گودام مال سے بھرے ہوئے تھے۔ یہاں وہاں احاطے میں کئی ٹرک کھڑے تھے ایک جگہ آگ کا الاؤ جلا کر کچھ کلینر بیٹھے سگریٹ وغیرہ پی رہے تھے۔ چاند خان کے ٹرک پر مال لادا جا چکا تھا اور اس کا کلینر اس کے اوپر ترپال باندھ رہا تھا۔ چاند خان نے چاروں طرف گھوم کر ٹرک کا جائزہ لیا۔ کلینر کو کچھ ہدایات دیں اور ندیم سے کہا ...."تم اگلی سیٹ پر جا کر بیٹھ جاؤ۔" ندیم ٹرک کی کھڑکی کھول کر ڈرائیونگ سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈ بہت تھی سرد ہوا بھی چل رہی تھی۔ چاند خان نے خاص طور پر ٹرک کے پیچھے کلینر کے لیے ایک چھوٹی سی جگہ بنا دی تھی۔ کلینر کو وہیں بیٹھ کر کلکتے تک سفر کرنا تھا۔ نہ چاند خان نے ندیم سے کچھ کہا اور نہ ندیم نے اس سے پوچھا کہ اس نے کلینر کو اس کے بارے میں کیا کہا ہے۔ چاند خان ندیم کو زیادہ دلیر آدمی لگا۔ ٹھیک بارہ بجے رات ٹرک اڈے سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آ گیا اس کا رخ کلکتے کی طرف تھا۔ سڑک دور تک خالی تھی کبھی کبھی کوئی ٹرک ضرور قریب سے گزر جاتا تھا۔ کشادہ سڑک پر آتے ہی ٹرک نے اسپیڈ پکڑ لی اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ کچھ دیر تو ندیم سڑک پر نظریں جمائے بیٹھا رہا۔ پھر اسے نیند آ گئی اور وہ کھڑکی سے سر لگا کر سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو ٹرک ایک شہر کی روشنیوں بھری سڑک سے گزر رہا تھا۔ چاند خان نے کہا ...."ہم کانپور شہر سے گزر رہے ہیں۔" ندیم کھڑکی کے شیشے سے لگ کر کانپور شہر کی روشنیوں کو تکنے لگا۔ ٹرک شہر سے باہر آیا تو سامنے پھر وہی خاموش کشادہ جی ٹی روڈ .... ندیم کی پھر آنکھ لگ گئی جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور آس پاس کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ٹرک کی رفتار مدھم ہو گئی تھی۔ چاند خان نے ندیم کی طرف مسکرا کر ایک نگاہ ڈالی اور سامنے

سڑک پر نظر جماتے ہوئے بولا.....

"اچھا کیا تم نے نیند پوری کر لی ہم نہیں سو سکتے ہمیں رات بھر جاگنا پڑتا ہے مگر بنارس میں پوری رات آرام کریں گے ۔" ندیم نے پوچھا.... "یہ کونسا شہر ہے؟" چاند خان بولا... "یہ الٰہ آباد ہے ۔ یہاں کے امرود بڑے مشہور ہیں ۔ گوری گوری میموں ایسے امرود ہوتے ہیں یہاں ہم ناشتے کے لیے تھوڑی دیر رکیں گے" ٹرک شہر کی گنجان اور ٹریفک سے بھری ہوئی سڑکوں پر سے گزرتا ٹرانسپورٹ کے اڈے پر جا کر رک گیا ۔ ندیم کو خطرہ تھا کہ کہیں کوئی پولیس والا اسے پہچان نہ لے اگرچہ اس کا حلیہ اب بالکل مختلف تھا خط کشیدہ داڑھی منڈے ہوئے سر پر جمی ہوئی اونی ٹوپی اور کھدر کا بنگالی ٹائپ کا کرتہ پاجامہ اور شال .... پھر بھی جوں جوں کلکتہ قریب آ رہا تھا اس کی پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا ۔ وہ پہلی بار اسی شہر میں گرفتار ہوا تھا اور وہاں اس پر پولیس نے بے پناہ مظالم ڈھائے تھے ۔ کلکتے کا مرہٹہ انسپکٹر پولیس منجر کمر تو ندیم کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا ۔ اس نے اس پر بے پناہ تشدد کیا تھا ۔ چاند خان نے ندیم کی طرف دیکھا شاید وہ اس کے ذہنی ہیجان کو بھانپ گیا تھا ۔ چھدے نے ندیم کے بارے میں چاند خان کو سب کچھ بتا دیا ہوا تھا ۔ کہنے لگا.... "ہم سامنے والے ہوٹل میں جا کر ناشتہ کریں گے ۔ وہاں تمھیں نہانے کے لیے گرم پانی بھی مل جائے گا تم کسی قسم کی فکر نہ کرو جب تک تم میرے ساتھ ہو تمھاری ہوا کی طرف بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا ۔" اڈے کے پاس جو ہوٹل تھا وہ درمیانے درجے کا تھا اور وہاں زیادہ تر ڈرائیور ہی ناشتہ اور کھانا وغیرہ کھاتے تھے ۔ یہاں ندیم نے گرم پانی سے منہ ہاتھ دھویا ۔ دانتوں کو منجن سے خوب صاف کیا ۔ پھر چاند خان کے ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کیا ۔ چائے پیتے ہوئے ندیم بار بار ہوٹل کے باہر دیکھ لیتا کہ کہیں کوئی پولیس یا خفیہ پولیس والا تو اس کے پیچھے نہیں لگا ہوا .... وہ چاہتا تھا کہ جلدی جلدی وہاں سے نکل جائے ۔ بڑے شہروں سے اسے ہول آنے لگا تھا کیونکہ بڑے شہروں میں پولیس اور خفیہ پولیس کی نفری زیادہ ہوتی ہے اور ویسے بھی یہ شہر کلکتے کے قریب تھا ایک گھنٹے بعد ٹرک آگے روانہ ہو گیا راستہ میں دوپہر کے وقت ایک بستی میں سڑک کے کنارے انھوں نے کھانا کھایا اور پھر سفر شروع کر دیا ۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ دور سے بنارس شہر کے مندروں کے کلس اور عالمگیری مسجد کے مینار نظر آنے

لگے ۔ پھر ٹرک دریائے گنگا کے پل پر سے گزر کر بنارس شہر میں داخل ہو گیا یہاں انھیں رات بسر کرنا تھی ۔ چاند خان نے ٹرک اپنی ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے میں کھڑا کیا ۔ کلینر کو وہیں چھوڑا اور ندیم کو لے کر قریب ہی ایک بستی میں آ گیا ۔ یہاں اس کا ایک گہرا دوست رہتا تھا یہ دوست بھی پٹھان مسلمان تھا ۔ اور خان جی کے نام سے مشہور تھا ۔

چاند خان نے ندیم کا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ یہ میرے دوست کا لڑکا ہے اور اسے آسنسول جانا ہے جہاں یہ اسکول میں پڑھتا ہے ۔ چاند خان کے دوست نے ندیم میں کوئی دلچسپی نہ لی ۔ وہ چاند خان کی طرف متوجہ ہو کر بولا ... "تمھارے پینے کے لیے آج ایک اسپیشل شے رکھی ہوئی ہے پیارے ....." چاند خان کو ندیم کی فکر تھی کہنے لگا .... "میرا دوست بھی رات یہیں بسر کرے گا ۔" چاند خان کے دوست نے کہا ...."ارے تم نے یہ کیسی بات کہہ دی ... تمھارا مہمان میرا مہمان .... سارا گھر خالی ہے اوپر والے چوبارے میں بستر لگا ہے کھانا کھا کر آرام کرے ۔" پھر آنکھ مار کر بولا ... تمھارا دوست بھی ....." اور ساتھ ہی ہنسنے لگا ۔ چاند خان نے ندیم کی طرف دیکھا ۔ ندیم نے کہا.... "جی نہیں شکریہ ۔" ندیم کو شروع رات میں ہی کھانا کھلا کر اوپر چوبارے میں بھیج دیا گیا اور چاند خان اور اس کا خان جی "اسپیشل شے" کھول کر بیٹھ گئے ۔ ندیم چوبارے میں بستر میں لحاف کے اندر گھسا ان کے قہقہے اور باتیں کرنے کی آوازیں سن رہا تھا ۔ وہ نیند کی لہروں پر جھول رہا تھا کہ اچانک اسے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی ۔ ندیم ہوشیار ہو کر ہمہ تن گوش ہو گیا ۔ دروازہ کھول کر چاند خان کے دوست خان جی نے کہا "آیئے تھانیدار جی آیئے آپ بھی بہتی گنگا میں سے چوبچ بھر لیں" تھانیدار کا لفظ سنتے ہی ندیم کے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی وہ بستر میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور کان نیچے سے آتے والی آوازوں پر لگا دیئے ۔ تھانیدار کہہ رہا تھا.... "خان جی اس وقت میں ایک ضروری کام سے آیا ہوں ....." "تو باہر کیوں کھڑے ہیں اندر آ جایئے نا آپ ہی کا گھر ہے ۔" اس کے بعد خاموشی چھا گئی ۔ ندیم کا دل زور سے دھڑکنے لگا ۔ کہیں یہ تھانیدار اسے گرفتار کرنے تو نہیں آیا ہے ؟

- - ❖ - -

ندیم کے لیے یہ لمحے بے حد جان لیوا تھے۔

نچلی منزل میں تھانیدار آیا ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس کے ساتھ دو تین کانسٹیبل بھی ہوں گے اور یہ سب کے سب مسلح ہوں گے۔ کسی نے مخبری کر دی ہو گی کہ مفرور پاکستانی جاسوس چاند خان کے مکان میں چھپا ہوا ہے اور اب پولیس اسے گرفتار کرنے وہاں پہنچ گئی ہے۔ ندیم بے آواز ہو کر پلنگ سے نیچے اتر آیا۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس کی ایک کھڑکی گلی کی طرف کھلتی تھی۔ جو اس وقت بند تھی۔ ندیم دبے پاؤں چل کر کھڑکی کے پاس آیا۔ کھڑکی کا ایک پٹ کھول کر نیچے جھانکا۔ یہ کھڑکی گلی کے فرش پر سے کوئی بیس بائیس فٹ اونچی تھی۔ یہاں سے چھلانگ لگانے پر اندر پولیس کو یقیناً پتہ چل جاتا۔ اور پھر ندیم کے ہاتھ پاؤں ٹوٹ جانے کا بھی خطرہ تھا۔ کیونکہ گلی کا فرش پختہ تھا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ نیچے بیٹھک میں سے باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی مگر ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اچانک ڈیوڑھی کا دروازہ کھلا اور ایک کانسٹیبل جس نے بندوق اٹھا رکھی تھی مکان کے باہر گلی میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب ندیم کے لیے یہ راستہ بھی بند ہو گیا تھا۔

اس نے کھڑکی آہستہ سے بند کر دی اور کمرے سے باہر نکل کر سخت سردی میں دالان میں آ گیا۔ چھوٹا سا دالان تھا جس کی مشرقی دیوار کے ساتھ ایک سیڑھی اوپر چھت کو چلی گئی تھی۔ ندیم دبے پاؤں چلتا سیڑھیوں کے پاس آیا اور آہستہ آہستہ پاؤں رکھتا اوپر چھت پر آ گیا۔ وہ زمین سے اور بلندی پر آ گیا تھا۔ اس نے منڈیر پر سے جھانک کر دیکھا۔ ایک جانب وہی گلی تھی جس میں کونے پر کانسٹیبل ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ ایک جانب دوسرے کوارٹر کی دیوار تھی جو مزید اوپر چلی گئی تھی۔ اور تیسری جانب گلی تھی۔ اس نے نیچے دیکھا کانسٹیبل گلی میں موجود تھا اور سردی سے بچنے کے لیے ادھر ادھر ٹہل رہا تھا۔

ندیم کو یہ خیال بھی آیا کہ چاند خان جرائم پیشہ آدمی ہے۔ پولیس والوں سے ایسے آدمیوں کے بڑے تعلقات ہوتے ہیں۔ ممکن ہے یہ تھانیدار کو اپنے اعتماد میں لے کر واپس روانہ کر دے۔ لیکن معاملہ ایک پاکستانی جاسوس کا تھا۔ یہ بات اتنی سنگین تھی کہ پولیس خان جی اور اس کے ساتھ ہی چاند خان کو بھی گرفتار کر سکتی تھی۔ چھت پر سے چھلانگ نہیں لگائی جا سکتی تھی۔ ندیم کے اعصاب تن گئے تھے۔ وہ دبے پاؤں سیڑھیاں اتر کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اسے سردی کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔

اسے گلی میں تھانیدار اور چاند خان کی آوازیں سنائی دیں۔ شاید وہ باہر آ گئے تھے۔ ندیم لپک کر کھڑکی کے ساتھ جا لگا۔ کمرے کی بتی جل رہی تھی۔ اب اسے بجھا کر وہ خواہ مخواہ پولیس کو خبردار نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے کھڑکی کے پٹ کے ساتھ کان لگا دیئے۔ تھانیدار کہہ رہا تھا۔
"خان جی! اگر کل تک آپ نے مطلوبہ ملزم ہمارے حوالے نہ کیا تو پھر نتیجے کی ذمہ داری آپ پر ہو گی۔"

ندیم کا جسم پتھر کی طرح سن ہو گیا۔ چاند خان کے دوست کی آواز آئی۔
"سردار جی! تم فکر نہ کرو۔ کل دوپہر سے پہلے پہلے تمہارا آدمی تمہارے پاس تھانے پر موجود ہو گا۔"
ندیم کا دل بیٹھنے لگا۔ ضرور ان لوگوں نے انعام کے لالچ میں آ کر اسے پولیس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ آخر دس ہزار کی رقم کوئی معمولی رقم نہیں تھی اور انسان کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اس نے ذرا سا پٹ کھول کر نیچے گلی پر دیکھا۔ ایک وردی پوش تھانیدار اور تین کانسٹیبل گلی میں سے گزرتے ہوئے دوسری طرف اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ندیم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں سے غائب ہو جائے گا۔ یہ لوگ تو ابھی اوپر آ کر اسے رسیوں میں جکڑ کر کونے میں پھینک دیں گے۔ مگر یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ انعام کی رقم کا تو ان لوگوں کو پہلے سے علم تھا۔ ممکن ہے تھانیدار کے آنے کے بعد انہوں نے ندیم کو پولیس کے حوالے کرنے کا ارادہ کر لیا ہو۔
ندیم اسی کشمکش و پیچ میں تھا کہ اسے سیڑھیوں پر کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم جلدی سے دروازے کی ایک طرف ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور چاند خان اندر داخل ہوا۔ [illegible] دبوچنے ہی والا تھا کہ چاند خان ایک دم دوسری طرف ہٹ گیا اور ندیم کو حیرت زدہ نظروں سے

تکنے لگا۔

"یہ تم کیا کرنے والے تھے؟"

ندیم نے طیش کے عالم میں کہا۔

"اور تم لوگ کیا کرنے والے ہو؟ تم لوگوں نے دس ہزار کے عوض ۔۔۔۔۔ اپنے کردار کا سودا کیا ہے۔ میں نے تمھارے دوست کی اور تھانیدار کی ساری بات سُن لی ہے۔ ٹھیک ہے اگر تم مجھے پولیس کے حوالے کرنا چاہتے ہو؟ اگر تم نے بھی میرے اعتماد کو صدمہ پہنچانا ہے تو میں تیار ہوں۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ اس کے بعد میرا انسانی دوستی پر سے اعتماد اٹھ جائے گا۔"

چاند خان بولا

"میرے دوست کا خدشہ بالکل درست تھا۔ اس نے مجھے اوپر بھیجا ہے کہ ہو سکتا ہے تم جاگ رہے ہو اور تم نے تھانیدار کی گفتگو سن لی ہو۔ تم بالکل بچے ہو۔ لگتا ہے تم نے ابھی دوست نہیں دیکھے۔ یا تمھیں ابھی تک کوئی مرد دوست نہیں ملا۔"

اس کے بعد چاند خان نے ندیم کو بتایا کہ سارا قصہ ایک بدمعاش کا ہے۔ جو ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ کرکے فرار ہو گیا ہے اور پولیس اس کی تلاش میں میرے دوست کے مکان تک آئی تھی۔ کیونکہ ملزم میرے دوست کے ڈیرے کا خاص آدمی ہے۔ تھانیدار بھی میرے دوست کا اپنا آدمی ہے اور اس سے باقاعدہ ماہانہ وصول کرتا ہے۔

چنانچہ اس نے خاص طور پر آکر میرے دوست کو خبردار کیا ہے کہ آئی جی پولیس خود اس کیس میں دلچسپی لے رہا ہے اس لیے مفرور ملزم کو تھانے پیش کر دے بعد میں اس کی ضمانت کرا دی جائے گی۔ تمھارا تو اس میں کہیں ذکر تک نہیں آیا۔"

ندیم نے سب سے پہلے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے بعد اس نے چاند خان سے بے حد معذرت طلب کی اور کہا کہ چونکہ وہ خود مفرور پاکستانی جاسوس ہے اور پولیس اس کی تلاش میں ہے اس لیے تھانیدار کو دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر وہ گھبرا گیا اور خواہ مخواہ اتنے اچھے دوستوں پر شک کر بیٹھا۔

چاند خان نے ندیم کے کندھے کو تھپتھپا کر کہا۔

"کوئی بات نہیں میرے بھائی۔ تمھیں ابھی دوستوں کا تجربہ نہیں ہے۔ سو جاؤ۔ رات کو تمھیں اٹھنا بھی ہے۔" اور ہاں اطمینان رکھو میں اپنے دوست کو اس بارے میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

چاند خان چلا گیا۔ ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ بلا ٹل گئی تھی اور ابھی تک پولیس کی گرفت سے آزاد تھا۔ چاند خان اور اس کے دوست خان جی کے بارے میں ندیم کے دل میں جو بدگمانی پیدا ہوئی تھی اس کا ندیم کو ضرور افسوس تھا۔ وہ بستر میں دبک گیا۔ بتی اس نے نہیں بجھائی تھی۔ اندر سے کنڈی بھی نہیں لگائی تھی۔ ندیم پلنگ سے ٹیک لگائے ہی اونگھتا رہا اور اسی عالم میں روانگی کا وقت آ گیا۔ نیچے سے چاند خان اوپر آیا۔ اس نے ندیم سے کہا۔

"تم ابھی تک سو رہے ہو۔ دن نکلنے والا ہے۔ تیاری پکڑو۔ ہمیں اب روانہ ہونا ہے بنارس سے آگے۔"

یہ کہہ کر چاند خان چلا گیا۔ ندیم جلدی سے اٹھا۔ باتھ روم میں جا کر اس نے منہ ہاتھ دھویا اور واپس پلنگ پر آکر بیٹھ گیا پھر اس نے کھڑکی کھول دی۔ باہر دن کا اجالا آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا اور کھڑکی میں سے سرد ہوا اندر آنے لگی تھی۔ ندیم نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ نیچے سیڑھیوں سے اسے چاند خان کی آواز آئی۔

"نیچے آ جاؤ دوست۔"

ندیم نے شال اپنے گرد لپیٹی اور سیڑھیاں اتر کر نچلے کمرے میں آ گیا۔ یہاں چاند خان اور اس کا دوست پہلے سے موجود تھے۔ چاند خان کے دوست خان جی نے ندیم کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "رات ایک تھانیدار مجھ سے ملنے آیا تھا۔ معاملہ کچھ اور تھا۔ میں نے سوچا کہیں تم اس کی آواز سُن کر گھبرا گئے ہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ لو ناشتہ کر لو۔"

ندیم نے ان کے ساتھ مل کر ناشتہ کیا۔ جلدی جلدی چائے پی اور خان جی سے مصافحہ کرتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا اور چاند خان کے ساتھ کوارٹر سے نکل کر گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستہ بھر چاند خان اپنے اس بنارس والے دوست کی تعریفیں کرتا رہا۔

"بڑا سچا مسلمان اور جی دار دوست ہے۔ اپنے دوست کے لیے جان بھی قربان کر سکتا ہے۔"

بنارس سے ٹرک کلکتہ کی طرف چل پڑا۔ دن کے دس بجے وہ صوبہ بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا پہنچے

یہ وہ شہر تھا جہاں آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے مہاتما بدھ کو بڑ کے درخت تلے گیان حاصل ہوا تھا۔ یہاں سے وہ دھنباد اور پھر آسنسول پہنچے تو صوبہ بنگال کی سرحد شروع ہو گئی تھی۔ اور پیپل کے درختوں کی جگہ تاڑ اور ناریل کے درختوں نے لے لی تھی۔ آسنسول کے آگے درگاہ پور، بردوان اور پھر کلکتہ شہر آ جاتا ہے۔ چاند خان یہ ساری تفصیلات ندیم کو بتاتا جا رہا تھا۔ بنگال میں داخل ہوتے ہی ندیم انتہائی محتاط ہو گیا تھا۔ یہاں سردی بھی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی۔ ہوا میں ہلکی ہلکی خوشگوار حرارت آ گئی تھی۔ ندیم نے سوئیٹر اور کوٹ اتار دیا تھا۔ صرف شال کندھوں پر رہنے دی تھی اور سر پر اونی ٹوپی اوڑھے رکھی تھی۔ کیونکہ اس حلیے میں بہت کم پہچانے جانے کا امکان تھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے کہ ٹرک بردوان شہر کی مضافات میں داخل ہو گیا۔ سڑک پر ٹریفک بڑھ رہی تھی۔ مسافر بسیں اور ٹرک بھی آتے جاتے مل جاتے تھے۔

ندیم سیٹ میں ذرا نیچے ہو کر بیٹھا تھا۔ سامنے سے ایک ٹرک آ رہا تھا اس ٹرک نے بتیاں تین بار جلا کر بجھا دیں تھیں۔ اس سگنل کو دیکھتے ہی چاند خان نے بریک لگانی شروع کر دی۔ ٹرک کی رفتار دھیمی ہونے لگی۔ ندیم کچھ پریشان سا ہو گیا۔ چاند خان نے ٹرک کو سڑک کے کنارے کچے پر اتار دیا اور ایک جانب درختوں کے پیچھے روک کر بریک لگا دی اور بولا۔

"آگے پولیس ہے۔ جو ٹرک ہمارے قریب سے گزرا تھا اس نے خطرے کا سگنل دیا ہے۔"

ندیم کا حلق پولیس کا نام سن کر خشک ہو گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ چاند خان نے نیچے اتر کر کلینر سے کہا۔

"بونٹ اٹھا کر پانی ڈالو ریڈی ایٹر میں۔"

وہ ندیم کو ٹرک کے عقب میں درخت کے پیچھے لے آیا اور بولا۔

"پولیس یونہی یہاں چیکنگ نہیں کر رہی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ تمھاری تلاش میں ہے۔ لیکن یہ میرا وہم بھی ہو سکتا ہے۔ مجھے اس کی پوری خبر منگوانی ہو گی تم ٹرک کے پیچھے کلینر والی جگہ میں جا کر چھپ جاؤ۔ میں کلینر کو آگے بھیج کر پتہ کرواتا ہوں۔"

ندیم اسی وقت درخت کے پیچھے سے نکل کر ٹرک کے عقب میں اچھل کر پچھلی سیٹ میں گھس گیا۔ یہ سیٹ ایسی تھی کہ سامان کے درمیان میں بنائی گئی تھی اور وہاں اگر آدمی بیٹھ جائے تو باہر

نظر نہیں آتا تھا۔ اتنی دیر میں چاند خان نے کلینر کو ایک ٹرک میں سوار کروا کر آگے روانہ کر دیا۔ وہ خود بونٹ پر جھکا یونہی انجن میں ہاتھ ادھر ادھر چلانے لگا جیسے ٹرک خراب ہو گیا ہو اور وہ اس کی مرمت کر رہا ہو۔ اس دوران وہ ندیم کے پاس ایک لمحے کے لیے بھی نہیں گیا۔ ندیم مال سے بھرے ہوئے کھوکھوں اور بڑے بڑے گٹھڑوں کے درمیان سمٹ کر بیٹھا رہا۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ بنگال میں اس کے لیے خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ پولیس کو معلوم تھا کہ ندیم دلی کی جیل سے بھاگ کر یا تو بارڈر کراس کر کے پاکستان جانے کی کوشش کرے گا اور یا اپنی محبوبہ سے ملنے کلکتے کا رخ کرے گا۔ انھوں نے بارڈر پر بھی سیکورٹی کو خبردار کر دیا ہو گا اور یہاں بھی دلی سے آنے والی گاڑیوں کی چیکنگ شروع کر دی تھی۔ وقت رک رک کر گزر رہا تھا۔ سورج مغرب کی طرف غروب ہو رہا تھا۔ دن کی روشنی ماند پڑتی جا رہی تھی۔ ندیم کو سڑک پر سے گاڑیوں کے گزرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے یہ دھڑکا بھی لگا تھا کہ کہیں پولیس یہاں تک نہ پہنچ جائے۔ پھر وہ کیا کرے گا؟ وہ یہاں سے بھاگ کر جدھر جائے گا پولیس اسے پکڑ لے گی۔ پیچھے سے اس پر گولیاں برسنا شروع ہو جائیں گی۔ وہ غیر ملکی جاسوس تھا اس پر یہی الزام لگایا گیا تھا اور اسے گولی مار دینا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔

اتنے میں ایک بس ٹرک سے تھوڑی دور آ کر رک گئی۔ اس میں سے کلینر نیچے اتر کر سیدھا اپنے استاد چاند خان کے پاس آیا۔ کچھ دیر اس سے باتیں کرتا رہا۔ چاند خان نے اسے انجن میں کوئی پیچ لگانے کو کہا اور خود ٹرک کے پیچھے آ گیا۔ اسے ندیم دکھائی نہیں دے رہا تھا اس نے اس کا نام لے کر کہا۔

"اسی جگہ بیٹھے رہو۔ میں ٹرک کو دوسری طرف لے جا رہا ہوں۔"

ندیم کے منہ سے اپنے آپ نکل گیا "وہ..... وہ کیا خبر لایا ہے؟" چاند خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک کا انجن سٹارٹ ہوا اور وہ درختوں میں سے نکل کر ایک طرف گھوم کر سڑک پر آیا اور دوسری طرف اتر کر درختوں کے درمیان ایک ویران راستے پر چلنے لگا۔ چاند خان کو ان سارے راستوں کا علم تھا۔ وہ ٹرک کو آہستہ آہستہ غیر ہموار جگہوں سے نکالتا ہوا ایک پرانے مکان کی دیوار کے قریب لے آیا۔ یہاں اس نے ٹرک کھڑا کیا اور اتر کر کلینر سے کہا۔

"انجن گرم ہو گیا ہے اس میں پانی ڈالو۔"

اس کے ساتھ ہی ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہاں اونچے اونچے گھنے چھتاروں والے درخت غروب ہوتے سورج کی الوداعی روشنی سے جدا ہو رہے تھے اور ہلکا ہلکا اندھیرا اس ملگجی کی روشنی کی جگہ لے رہا تھا۔ شاید وہ نیم کا گھنا درخت تھا جس کے نیچے چاند خان بیٹھ گیا اور ندیم کو بھی اس نے اپنے پاس بٹھا لیا۔ کہنے لگا۔

"کلینر نے مجھے بتایا کہ پولیس کسی مفرور ملزم کی تلاش میں آگے سڑک پر چیک پوسٹ قائم کیے ہوئے ہے اور مفرور ملزم کی سرگرمی سے تلاش جاری ہے۔ اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا ہے کہ ملزم خطرناک ہے اور جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے۔ اب تم بتاؤ کہ ہمیں کیا کرنا چاہیئے جہاں تک میرا قیاس ہے یہ بنگال کی پولیس تمھاری ہی تلاش میں یہاں چیکنگ کر رہی ہے۔ میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر پولیس واقعی تیری تلاش میں ہے تو یقینی بات ہے کہ تم گرفتار کر لیے جاؤ گے اور تمھارے ساتھ میں بھی پکڑ لیا جاؤں گا۔"

ندیم کا رنگ اڑ چکا تھا۔ منزل قریب آتے آتے اس سے ہزاروں میل دور ہو گئی تھی۔ کیا وہ واپس چلا جائے؟ مگر واپس کہاں جائے گا جس کے پاس بھی جائے گا وہاں زیادہ دیر تک نہ رہ سکے گا۔ دوسری صورت میں اسے کسی بھی مکان میں قید ہو کر وقت گزارنا ہوگا۔ کیا وہ اتنی دیر تک کسی کے پاس چھپ سکے گا کہ حالات کے معمول پر آنے کا انتظار کر سکے؟ نہیں کوئی بھی اس کے لیے اتنا بڑا رسک نہیں لے گا۔ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ پہ مجبور ہے وہ انہی خیال میں الجھا ہوا تھا کہ چاند خان بولا۔

"اب میرے خیال میں دو ہی صورتیں ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ تم یہیں سے کسی بس میں سوار ہو کر واپس دلی چھیدے کے پاس چلے جاؤ۔ جب حالات ٹھیک ہو جائیں۔ ذرا امی جمی ہو جائے تو پھر بنگال میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔ لیکن اگر تم واپس نہیں جانا چاہتے ہو اور تمھیں ہر حالت میں کلکتہ پہنچنا ہی ہے تو اس کی بھی ایک صورت ہے" ندیم نے فوراً پوچھا۔

"وہ صورت کونسی ہے خان صاحب؟ میں ہر حالت میں کلکتہ میں داخل ہو جانا چاہتا ہوں۔"

چاند خان بولا "وہ صورت یہ ہے کہ امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی کے نام جو رقعہ تمھارے پاس ہے وہ اور ساری نقدی مجھے دے دو۔ میں یہ نقدی اور تمھارا خط امجدیہ ہوٹل کے مالک

جبار علی کے پاس تمھاری امانت کے طور پر رکھوا دوں گا۔ خط پڑھ کر جبار بھائی سب سمجھ جائیں گے۔"

ندیم بولا "اور میں کلکتہ کیسے پہنچوں گا؟"

چاند خان نے کہا "اس کے لیے تمھیں ایک خاص راستے سے کچھ پیدل سفر اور کچھ چھوٹی ٹرین پر سفر کر کے اکیلے کلکتہ پہنچنا ہوگا۔ راستہ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں۔ ادھر پولیس کا بھی زیادہ خطرہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ تم زیادہ تر بنگال کے دیہات میں سفر کرو گے۔ اگر تم اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہو تو میں تمھیں سارا راستہ اور روٹ سمجھا دیتا ہوں۔"

ندیم نے جھٹ حامی بھر لی۔ بہرحال کلکتہ ہی پہنچنا اس کے لیے مناسب تھا۔ خطرہ تو واپس جاتے میں بھی تھا۔ وہ کہیں بھی پکڑا جا سکتا تھا۔ چنانچہ وہ دیہاتی راستے سے کلکتہ جانے پر تیار ہو گیا۔ اب چاند خان نے اسے روٹ سمجھانی شروع کر دی۔

"میں یہ ٹرک اسی لیے اسی بادی کے پاس لایا ہوں۔ یہ جو پگڈنڈی درختوں بیچ سے گزر کر مشرق کی طرف جا رہی ہے یہ یہاں سے دو اڑھائی کوس تک ایسے ہی درختوں سے بھرے ہوئے غیر ہموار میدان میں سے گزرتی ہے۔ آگے ایک ندی آ جائے گی اس ندی کی دوسری جانب ایک گاؤں ملے گا۔ وہاں سے ایک کچا راستہ پھر مشرق کی طرف جاتا ہے۔ اسی راستے پر ایک گھنٹہ پیدل چلنے کے بعد ایک بڑا قصبہ آ جاتا ہے۔ سندراوتی اسی قصبے کا نام ہے۔ یہ سارا علاقہ میرا دیکھا بھالا ہے وہاں سے جنوب کی طرف ایک راستہ دووالا نام کے دیہاتی ریلوے اسٹیشن کو جاتا ہے۔ یہاں چھوٹی ریلوے لائن والی ٹرین چلتی ہے۔ اگر تم خیریت سے دووالا اسٹیشن پر پہنچ گئے تو وہاں سے تمھیں رات کے دو بجے کے قریب ماتا پور کے لیے چھوٹی ریل گاڑی ملے گی۔ تم اس گاڑی میں سوار ہو جانا یہ گاڑی چار بجے صبح لکھیا پور پہنچتی ہے جہاں سے تمھیں سیالدہ کے لیے کسی نہ کسی وقت کوئی نہ کوئی براڈ گیج کی پسینجر ٹرین مل جائے گی۔ سیالدہ کلکتہ ہی کا ایک ریلوے اسٹیشن ہے۔ یاد رکھنا کلکتہ کے دو ریلوے اسٹیشن ہیں۔ ایک سیالدہ ایک ہوڑہ۔ تم سیالدہ اسٹیشن پر اترو گے وہاں سے تم ٹیکسی لے کر شام کے وقت ذکریا اسٹریٹ آ جانا اور کسی سے بھی پوچھو گے تو ذکریا اسٹریٹ میں تمھیں امجدیہ ہوٹل پہنچا دے گا۔ یہ ہوٹل مسجد ناخدا کے پیچھے ہے۔ تمھاری ساری رقم امجدیہ ہوٹل کے مالک کے پاس تمھاری امانت کے طور پر موجود ہوگی اور تمھارا خط

بہرحال اسے مل گیا ہوگا۔ اس کے بعد تم بانو اور جبار علی جانے۔ تم ضرورت کے لیے اپنے پاس سو روپے
روپے رکھ لینا۔ اتنی رقم کلکتہ پہنچنے کے لئے کافی سے زیادہ ہوگی۔"

ندیم پہلے ہی تیار تھا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ پولیس کی نظروں سے بچنے کے لیے بڑی شاہراہوں کی بجائے اب دیہاتوں اور ویران علاقوں میں سفر کرتا ہوا کلکتہ پہنچے۔ کیونکہ یہاں سیکورٹی بہت سخت تھی اور پولیس اس کی تلاش میں پوری طرح چوکس ہو چکی تھی۔ اس نے چاند خان سے پانچ پانچ اور دو روپے کے نوٹوں کی شکل میں اپنے ہزار روپے میں سے ایک سو روپے کی رقم لے کر اپنے کرتے کی جیب میں رکھ لی اور چاند خان کے بتائے ہوئے راستے کو ایک بار پھر ذہن میں اچھی طرح سے پکا کیا۔ چاند خان نے کہا "تمہیں شام کا اندھیرا گہرا ہونے سے پہلے پہلے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

ندیم نے جبار علی کے نام دیا ہوا احمد خان کا خط اور ایک سو کم ایک ہزار روپیہ چاند خان کے حوالے کر دیا اور اسی پگڈنڈی کی طرف دیکھا جہاں اونچے درختوں کے درمیان اندھیرے کے ہلکے ہلکے سائے سرگوشیاں کرنے لگے تھے۔ چاند خان نے خط اور کرنسی نوٹ اپنی واسکٹ کی اندرونی جیب میں سنبھال کر رکھ لیے اور اٹھتے ہوئے بولا "اب جتنی جلدی ہو سکے نکل چلو۔ اللہ تمہارا نگہبان ہو۔ راستہ یاد رکھنا اگر بھول گئے تو کسی مصیبت میں پھنس سکتے ہو۔ بات ہندوستانی میں کرنا اور اپنے آپ کو بہار کا رہنے والا بتانا۔" چاند خان نے ایک بار پھر ندیم کو خدا حافظ کہا اور اپنے ٹرک کی طرف بڑھتے ہوئے کلینر کو آواز دی۔

"ابے پانی ڈال دیا انجن میں؟ بہت دیر ہو رہی ہے۔"

ندیم درختوں میں گھری ہوئی اس پگڈنڈی پر آگیا جس پر اسے مشرق کی جانب اڑھائی کوس تک پیدل چلنا تھا۔ وہ تیز تیز چل رہا تھا تاکہ رات گہری ہونے سے پہلے پہلے دو والا ریلوے اسٹیشن تک پہنچ جائے۔ دوسری طرف چاند خان ٹرک کو لے کر جی ٹی روڈ پر آگے بڑھ رہا تھا۔ اسے دور سے کچھ ٹرک اور گاڑیاں سڑک کے کنارے کھڑی نظر آئیں۔ سڑک کے درمیان میں پولیس والے کھڑے گاڑیوں کو ایک طرف رکنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ چاند خان نے بھی اپنا ٹرک دوسری گاڑیوں کے پیچھے لگا دیا۔ کلینر اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ وہ معاملے کی

تہہ تک پہنچ گیا تھا مگر وہ اپنے استاد کا فدائی تھا اور مخبری کرنے کے بارے میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ چاند خان کی باری بھی آگئی۔ پولیس کی بھاری تعداد وہاں موجود تھی۔ بنگالی ہیڈ کانسٹیبل نے چاند خان کو کاغذ دکھانے کے لیے کہا۔ چاند خان ہمیشہ کاغذ ٹھیک رکھتا تھا۔ اسی دوران انسپکٹر اس کے پاس آگیا اس نے غور سے چاند خان کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ بک تھی جس پر وہ بار بار نگاہ ڈال رہا تھا۔ ظاہر ہے اس نوٹ بک میں مفرور پاکستانی جاسوس کی تصویر ہوگی۔ آخر یہ بات کھل کر سامنے آگئی۔ بنگالی انسپکٹر پولیس نے چاند خان کو ایک طرف لے جا کر اسے نوٹ بک میں رکھی ہوئی ندیم کی تصویر دکھائی اور پوچھا۔

"اس آدمی کو تم جانتے ہو؟"

تصویر ہو بہو ندیم کی تھی۔ یہی تصویر اخباروں میں چھپی تھی۔ چاند خان نے تصویر کو جھک کر غور سے دیکھا اور بولا۔

"نہیں سر۔ میں نے اس آدمی کو نہیں دیکھا۔"

یہی تصویر ٹرک کے کلینر کو بھی دکھائی گئی۔ کلینر نے بھی نفی میں جواب دیا۔ چاند خان کے ٹرک کی تلاشی لی گئی کہ اس میں کوئی آدمی تو نہیں چھپا ہوا اور پھر اسے گزر جانے کی اجازت دیدی گئی۔ چاند خان کی جیب میں وہ خط تھا جو احمد خان نے ندیم کے بارے میں کلکتہ کے جبار علی کے نام لکھا تھا۔ اگرچہ اس میں ندیم کا نام نہیں لکھا گیا تھا اس کے باوجود یہ خط چاند خان کو زندگی کی سب سے بڑی مصیبت میں پھنسا سکتا تھا۔ جب تک وہ پولیس انسپکٹر کے پاس رہا اس کا دل بری طرح دھڑکتا ہی رہا جب وہ ٹرک لے کر دوبارہ جی ٹی روڈ پر چڑھا تو چاند خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بہت بڑی بلا ٹل گئی تھی۔ اس نے بڑی عقلمندی کی تھی کہ ندیم کو راستے میں ہی اتار دیا تھا۔ اس کا شبہ بالکل درست نکلا تھا پولیس اس کی تلاش میں چیکنگ کر رہی تھی۔ کلینر بولا۔

"خان جی! بابو کلکتہ پہنچ جائے گا نا؟ کہیں راستے میں بھٹک تو نہیں جائے گا؟"

چاند خان نے کلینر کو جھڑک دیا تھا اور کہا۔

"خبردار جو بابو کا پھر ذکر کیا۔ خاموش بیٹھے رہو۔"

ٹرک بردوان کے بارونق علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ اب کلکتہ زیادہ دور نہیں تھا۔

دوسری طرف ندیم ندی پار کرنے کے بعد سندراوتی نام کے قصبے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ بنگال کے گاؤں یا قصبے زیادہ تر جھگیوں، ڈھلوان چھتوں والے اک منزلہ مکانوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ کہیں کہیں ان قصبوں میں زمینداروں اور جاگیر داروں کی دومنزلہ حویلیاں بھی نظر آجاتی ہیں جن کے احاطے کی دیواریں برسات کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی ہوتی ہیں۔ ندیم سندراوتی قصبے سے کچھ پرے ہی آگے گزر گیا۔ اب رات پڑ چکی تھی اور اندھیرا چاروں طرف چھا گیا تھا۔ ندیم دھان کے کھیتوں میں چلتا.. قصبے کے جنوب کی طرف نکل گیا۔ چاند خان نے اسے جنوب کی طرف جانے کی ہدایت کی تھی۔ وہاں وہ کچا راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا جو اسٹیشن کی طرف جاتا تھا۔ اپنا رخ اس نے جنوب ہی کی طرف رکھا تھا۔ یہاں کھیتوں کے ساتھ ساتھ جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں اور کہیں کہیں تاڑ کے چھریرے درخت رات کے اندھیرے میں ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر میں خاموش کھڑے تھے۔ کچھ دیر کی تلاش کے بعد آخر ندیم کو ایک پگ ڈنڈی جھاڑیوں میں سے ہو کر جنوب کی طرف جاتی نظر آئی۔ وہ اس پگڈنڈی پر چل پڑا۔ وہ کافی دیر تک اس کچے راستے پر چلتا رہا۔ مگر اسے نہ تو دور کہیں کسی ریلوے سگنل کی بتی نظر آئی اور نہ ہی دور سے ریل کے انجن کی سیٹی ہی سنائی دی اسے خیال آیا کہ کہیں وہ راستے سے بھٹک تو نہیں گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر وہ کوئی اندازہ نہ لگا سکا۔ چاند خان اس راستے سے اچھی طرح واقف تھا۔ قصبہ کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ ستاروں کو راہنما بنا کر ندیم جنوب کی سمت میں چل رہا تھا۔ دور سے بیلوں کی گھنٹیوں کی آواز آنے لگی۔ ندیم رک گیا۔ تھوڑی دیر بعد سامنے اندھیرے میں سے ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی۔ جب وہ قریب آئی تو ندیم نے بنگالی گاڑی بان سے پوچھا کہ دووالا ریلوے اسٹیشن کتنی دور ہوگا۔ گاڑی بان نے گاڑی روک لی اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جس سے پیچھے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”جیادہ دور نہیں۔“

ندیم نے گاڑی بان کا شکریہ بھی ادا نہ کیا اور پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ وہ بنگلہ زبان سے ناواقف تھا اور نہیں چاہتا تھا کہ کسی کو اس کا علم ہو۔ پگڈنڈی آگے جا کر ایک کچی سڑک میں بدل گئی۔ اب اسے پہلی بار دور تاڑ کے درختوں کے عقب میں سگنل کی سرخ بتی دکھائی دی۔ ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ یہ چھوٹی لائن کا ایک دیہاتی ریلوے اسٹیشن تھا۔ پلیٹ فارم

رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف اسٹیشن کی ڈیوڑھی کے آگے دائیں بائیں کھمبوں پر دو بلب روشن تھے۔ کہیں کوئی مسافر نہیں تھا۔ دفتر کا کمرہ بھی بند تھا۔ گیٹ کے پاس ایک بنگالی بوڑھا بیٹھا بیڑی پی رہا تھا۔ ندیم نے اس سے کلکتہ جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تو وہ کسی قدر حیرت سے بولا کہ گاڑی تو رات کے دو بجے آئے گی۔ ندیم خاموشی سے پلیٹ فارم پر آ کر ایک خالی بینچ پر بیٹھ گیا۔ موسم خشک تھا مگر سردی بالکل نہیں تھی۔ کھانے پینے کا وہاں کوئی سلسلہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہ اسٹیشن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہاں کبھی کوئی گاڑی نہیں آئی۔ ندیم چادر کی بکل مار کر بینچ پر بیٹھا اسٹیشن کی ڈیوڑھی والے گیٹ کو دیکھ رہا تھا۔ جو بوڑھا وہاں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا وہ وہیں فرش پر لیٹ گیا تھا۔ پہلے ندیم نے سوچا کہ اس سے پوچھے کہ یہاں کہیں سے چائے وغیرہ مل جائے گی مگر ایک تو وہ بنگلہ نہیں جانتا تھا دوسرے اسے خدشہ تھا کہ کہیں اس پر شک نہ پڑ جائے سگریٹ ندیم کے پاس موجود تھے۔ اس نے سگریٹ سلگا لیا۔ ابھی گاڑی کے آنے میں بہت دیر تھی۔ یہ شروع رات کا وقت تھا۔ گھڑی ندیم کے پاس نہیں تھی۔ دو تین سگریٹ پھونکنے کے بعد ندیم نے سوچا کہ اسے کچھ دیر کے لیے نیند کر لینی چاہیئے۔ وہ بینچ پر لیٹ گیا۔ مگر اُسے نیند بالکل نہ آئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ چاروں طرف ایک پُراسرار سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی وقت ندیم کو اس سناٹے سے خوف محسوس ہونے لگتا۔ جیسے پولیس اس کی تلاش میں اسٹیشن کی طرف بڑھ رہی ہو۔ جس بینچ پر وہ بیٹھا تھا وہ اندھیرے میں تھا۔ وہ پلیٹ فارم سے اتر کر سامنے والے کھیتوں میں چلا گیا۔

یہاں اسے کسی قدر تحفظ کا احساس ہوا۔ کم از کم یہاں اسے دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔ کھیت جوار کا تھا اور ایک جگہ سے اس کی کٹائی ہو چکی تھی۔ ندیم وہاں بیٹھ گیا۔ لیکن رات کے دو بجنے میں ابھی بڑا وقت تھا۔ بیٹھے بیٹھے جب وہ تھک گیا تو اٹھ کر کھیت کے کنارے ٹہلنے لگا۔ اسے بھوک اور پیاس بھی لگ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر اسے اندھیرے میں ایک کوارٹر سا دکھائی دیا۔ وہ اس طرف چل پڑا معلوم ہوا کہ یہ ٹیوب ویل ہے۔ دروازے پر تالا پڑا تھا اور ٹیوب ویل بند تھا۔ باہر چو بچے میں تھوڑا سا پانی جمع تھا لیکن ندیم نے وہ پانی پینا پسند نہ کیا۔ یہ پانی گندا بھی ہو سکتا تھا۔ وہ چو بچے کی منڈیر پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ عجیب واہیات ریلوے اسٹیشن تھا کہ دو بجے سے پہلے وہاں کوئی گاڑی نہیں آتی تھی۔ سگریٹ بھی ختم ہو گیا۔ ندیم نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور

اٹھ کر کھیتوں کی طرف واپس چلنے لگا۔ وہ کھیت کی پگڈنڈی پر چل رہا تھا کہ اُسے انسانی آواز سنائی دی۔ وہ جلدی سے اونچی فصل کے عقب میں بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑے اس طرف تکنے لگا جدھر سے اسے انسانی آواز سنائی دی تھی۔ آواز تو اُسے پھر سنائی نہ دی لیکن اس نے سامنے والے کھیتوں میں سے دو انسانی سایوں کو ابھرتے دیکھا۔ یہ سائے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ندیم نے اپنے آپ کو فصل کے اندر چھپا لیا۔ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ یہ ایک عورت اور مرد تھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے چلے آ رہے تھے۔ وہ بنگلہ زبان بول رہے تھے جو ندیم نہیں سمجھ سکتا تھا۔ دونوں کے لباس دیہاتی قسم کے تھے۔ جب وہ ندیم کے قریب سے ہو کر پگڈنڈی پر سے گزرے تو ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ عورت بھی ایک دم سے یہاں رُک گئی۔ اس نے ایک کھیت کی طرف اشارہ کیا۔ یہ کھیت اس کھیت کے سامنے کچھ فاصلے پر تھا جس کی فصل میں ندیم چھپا بیٹھا تھا۔ مرد نے بنگلہ میں کچھ کہا اور وہ دونوں سامنے والے کھیت کی طرف چل دیئے۔ اس کھیت میں بھی کوئی اونچی فصل اُگی ہوئی تھی۔ جب وہ دونوں اندھیرے میں ندیم کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تو وہ فصل کے اندر ہی اندر سے ہوتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی طرف نکل آیا۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ وہ پلیٹ فارم پر ہی بیٹھا رہے۔ ندیم واپس پلیٹ فارم والے بنچ پر آ کر بیٹھ گیا۔ اب رات کچھ زیادہ خنک ہو گئی تھی۔ ندیم نے چادر کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹ لیا اور بنچ پر نیم دراز ہو گیا۔ بھوک کی وجہ سے اسے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔ ویسے بھی وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں داخل ہو چکا تھا جہاں پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اس حقیقت سے چشم پوشی اس کے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈال سکتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے تھک جاتا تو اٹھ کر بنچ کے پیچھے پلیٹ فارم کے اندھیرے میں ٹہلنا شروع کر دیتا۔ وقت جیسے ایک جگہ تھم گیا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر چکی ہے۔

آخر وہ لمحہ بھی آ گیا جب ڈیوڑھی کے اندر کی بتی روشن ہو گئی۔ ندیم نے دیکھا کہ دبلا پتلا دھوتی پوش بنگالی جمائیاں لیتا ہوا اسٹیشن کے دفتر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پھر اس نے تالا کھولا اور اندر چلا گیا۔ دفتر کی بتی بھی جل اٹھی۔ یہ دفتر بھی تھا اور ٹکٹ والی کھڑکی بھی اسی جگہ تھی۔ اب اکا دکا

مسافر بھی پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گئے۔ ندیم نے جیب سے دس روپے کے پانچ نوٹ نکال کر اپنے ہاتھ میں رکھ لیے اور ٹکٹ لینے ڈیوڑھی میں آ گیا۔ اس نے ہندوستانی میں پوچھا کہ کلکتہ کا کرایہ کتنا ہے ٹکٹ بابو نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا اور میز پر رکھی ہوئی چیزیں اٹھا کر دوسری طرف رکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی تھی اور وہ جیسے خواب میں چل پھر رہا تھا۔ اپنے آپ ہی وہ ٹکٹ والی کھڑکی کے پاس آ گیا اور ندیم کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"ستره روپے نکالو۔"

ندیم نے جلدی جلدی سے دس دس کے دو نوٹ کھڑکی میں آگے بڑھا دیئے۔ ٹکٹ لیتے وقت ندیم نے سامنے دیوار سے لگی گھڑی کو دیکھا۔ رات کا سوا ایک بج چکا تھا۔ وہ پلیٹ فارم پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین کے آنے میں ابھی پون گھنٹہ باقی تھا۔ مگر ندیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ پون گھنٹہ پانچ منٹ میں گزر جائے گا۔ وہ سگریٹ پینے لگا۔ خالی پیٹ تمباکو اسے زیادہ تلخ لگ رہا تھا۔ جس طرف سے گاڑی آنے والی تھی اُدھر کچھ فاصلے پر سگنل کا کھمبا لگا تھا جس پر زرد روشنی ہو رہی تھی۔ اگر اسی سگنل کو سامنے کے رُخ سے دیکھا جاتا تو بتی سُرخ ہوتی۔ سگنل ابھی گرا ہوا نہیں تھا۔ پلیٹ فارم پر کچھ اور مسافر آ گئے تھے۔ شاید یہ قریبی قصبے اور دیہات سے آئے تھے۔ ندیم چوکس ہو کر بیٹھ گیا۔ آخر سگنل ڈاؤن ہو گیا اور زرد روشنی بجھ گئی۔ دوسری جانب سے بتی یقیناً سبز ہو گئی ہو گی۔ ندیم نے سگریٹ پھینک دیا تھا۔ دس پندرہ منٹ کے بعد زور سے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ پھر تھوڑی دیر بعد انجن کی روشنی نظر آنے لگی۔ گاڑی ایک موڑ کاٹ کر نمودار ہوئی تھی۔ انجن کی روشنی کافی تیز تھی۔ ندیم اٹھا اور ڈیوڑھی میں ایک طرف اوٹ میں ہو کر کھڑا ہو گیا۔ وہ انجن کی روشنی کے سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ انجن شور مچاتا پلیٹ فارم پر سے گزر گیا۔ ندیم نے دیکھا کہ ٹرین کے ڈبوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ یہ ٹرین عام ٹرین سے قدرے چھوٹی تھی اور اس کے ڈبے کشادہ نہیں تھے۔ اکثر مسافر سو رہے تھے۔ ندیم بھی ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دوسرے مسافروں کے ساتھ گھس کر ایک طرف کونے میں بیٹھ گیا۔ اس نے چادر اپنے سر پہ کر لی اور سر یوں جھکا لیا جیسا کہ سو رہا ہو۔ مگر وہ پوری طرح چوکس تھا اور کنکھیوں سے ایک ایک مسافر کا اور پلیٹ فارم کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہاں اسے پولیس کا کوئی آدمی نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر آگے پولیس کا

خطرہ تھا۔ کیونکہ آگے کلکتہ تھا۔ یہ ٹرین لکھیا پور سے ہوتی ہوئی ماتا پور کی طرف نکل جاتی تھی۔ لکھیا پور ٹرین کو دو گھنٹے بعد پہنچنا تھا جہاں سے ندیم نے کلکتہ کے لیے براڈ گیج ٹرین پکڑنی تھی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین پلیٹ فارم سے کھسکنے لگی۔ کچھ دور جا کر ٹرین نے اسپیڈ پکڑ لی۔ جوں جوں ٹرین لکھیا پور کے قریب پہنچ رہی تھی۔ ندیم کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ لکھیا پور جنکشن تھا اور کلکتہ وہاں سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ اس وقت صبح ہو رہی ہوگی اسٹیشن پر پولیس ضرور موجود ہو گی۔ اخبار میں چھپی ہوئی تصویر اور انعام کی بھاری رقم کی وجہ سے ندیم کو بے حد تشویش تھی۔ اگرچہ اس نے اپنا حلیہ کافی بدل لیا ہوا تھا مگر پھر بھی وہ پہچانا جا سکتا تھا۔ میٹر گیج ٹرین رات کے اندھیرے میں ویران ویران چھوٹے اسٹیشن چھوڑے جا رہی تھی صرف ایک اسٹیشن پر رکی۔ اس کے بعد جب پو پھٹنے لگی تو دور لکھیا پور جنکشن کے سگنل کی سبز سرخ روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ یہ اس نے اچھا کیا تھا کہ دو والا اسٹیشن ہی سے کلکتہ تک کا ٹکٹ لے لیا تھا۔ ٹرین لکھیا پور اسٹیشن کے بڑے پلیٹ فارم پر آ کر رک گئی۔ ندیم اپنی نشست پر ہی دبکا بیٹھا رہا۔ کیونکہ کچھ مسافر ڈبے میں سوار ہو رہے تھے۔ ندیم نے بیٹھے بیٹھے باہر پلیٹ فارم کا جائزہ لے لیا تھا۔ اسے ... اسے پولیس کا کوئی بھی سپاہی نظر نہیں آیا تھا۔ پلیٹ فارم دوسری طرف تھا۔ اسے سامنے والے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اس میں مسافر بھی سوار تھے اور پلیٹ فارم پر لوگ چل پھر رہے تھے۔ یقیناً یہی گاڑی کلکتہ جا رہی تھی۔ ندیم ٹرین کی دوسری جانب ریلوے لائن میں اترا اور سامنے والے پلیٹ فارم پر چڑھ گیا۔ بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا کہ سیالدہ یہی گاڑی جائے گی۔ اس آدمی نے بتایا کہ گاڑی تو یہی ہے مگر اس کے انجن میں کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے دو گھنٹے لیٹ چلے گی۔ اس دوران ندیم پلیٹ فارم کا جائزہ لے چکا تھا۔ ریلوے اسٹیشن کے دو سپاہی پلیٹ فارم نمبر ایک کے گیٹ کے پاس کھڑے تھے۔ ادھر کوئی سپاہی نہیں تھا۔ سی آئی ڈی والا بھی شاید وہاں کوئی نہیں تھا۔ ورنہ یہ لوگ اجنبی چہرے کی طرف ضرور گھور گھور کر دیکھتے ہیں۔ یہاں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ندیم نے عافیت اسی میں سمجھی کہ بجائے پلیٹ فارم پر پھرنے کے ٹرین میں کسی جگہ جم کر بیٹھ جانا چاہیئے۔ وہ تھرڈ کلاس کے ایک ایسے ڈبے میں گھس گیا جس میں رش نسبتاً زیادہ تھا اور سامان بھی کافی بھرا ہوا تھا۔ وہ سامان کے پیچھے

اس سمت بیٹھ گیا جدھر پلیٹ فارم نہیں تھا۔ عجیب اتفاق کی بات ہوئی کہ وہ ابھی بیٹھا ہی تھا کہ لائن کے پار سامنے والے پلیٹ فارم پر گہرے سانولے رنگ کے ایک دُبلے پتلے کھدر پوش آدمی نے اسے گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ندیم نے توجہ دوسری طرف کر لی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوبارہ آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ وہ کھدر پوش لوہے کے کھمبے کے ساتھ لگا بیڑی پیتے ہوئے برابر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ـ ـ ـ ـ ـ

گاڑی کلکتے کے مضافات میں داخل ہو گئی تھی۔

ندیم تھرڈ کلاس کے ڈبے میں اس طرح بیٹھا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو دوسرے مسافروں میں چھپا رکھا تھا۔ ندیم کو اس کھدر پوش بنگالی کا مسلسل خطرہ لگا ہوا تھا جس نے اسے لکھیا پور جنکشن کے سامنے والے پلیٹ فارم سے گھور کر دیکھا تھا۔ یہ انٹیلی جنس کا آدمی بھی ہو سکتا تھا۔ کلکتہ انٹیلی جنس اور پولیس کے لیے ندیم کا چہرہ جانا پہچانا تھا۔ ندیم کلکتہ پولیس کی حراست میں رہ کر ایسی شدید اذیتیں اٹھا چکا تھا کہ انھیں یاد کر کے آج بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ خاص طور پر مسٹر پولیس انسپکٹر منجریکر نے اس پر بھیانک تشدد کیا تھا۔ سونا گاچی تھانے کے تقریباً سبھی پولیس اور انٹیلی جنس والے اس کی شکل سے واقف تھے اگرچہ ندیم نے داڑھی بڑھالی تھی۔ اس کے باوجود وہ پہچانا جا سکتا تھا۔ یقینی بات تھی کہ دوسرے علاقے کی پولیس اور سی آئی ڈی والوں کو ندیم کی تصویریں دکھا دی گئی ہوں گی۔ پولیس بڑی سرگرمی سے اس کی تلاش میں تھی۔ اس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا اور یہ بھارت میں قتل سے بھی بڑا جرم تصور کیا جاتا ہے۔ ٹرین معمولی رفتار کے ساتھ کلکتے کے دوسرے بڑے ریلوے اسٹیشن سیالدہ کے پلیٹ فارم کی طرف بڑھتے ہوئے ریلوے یارڈ میں بچھے ہوئے لائنوں کے بہت بڑے جال پر سے گزر رہی تھی۔ لکھیا پور جنکشن کے بعد ندیم کو وہ سی آئی ڈی والا کھدر پوش پھر دکھائی نہیں دیا تھا۔ ٹرک ڈرائیور چاند خان کے ساتھ ہی کلکتے پہنچ چکا ہوگا۔ اگر بردوان شہر کے باہر پولیس کی چیک پوسٹ نہ ہوتی تو اس وقت تک ندیم بھی چاند خان کے ساتھ کلکتے پہنچ چکا ہوتا۔ مگر بردوان شہر کے باہر جی ٹی روڈ پر ہر گاڑی کی زبردست چیکنگ ہو رہی تھی جس کی وجہ سے

چاند خان نے ٹرک پیچھے ہی ایک طرف روک لیا اور ندیم سے کہا کہ کھیتوں اور میدانوں سے گزر کر لکھیا پور جنکشن سے کلکتہ جانے والی گاڑی پکڑے اور کلکتے میں امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی سے جا کر ملے۔ چاند خان نے ندیم سے ایک ہزار روپیہ اور وہ رقعہ بھی لیکر اپنے پاس لے کر رکھ لیا جو دلّی والے راجو نے اس کے نام لکھ کر دیا تھا۔ اور جس میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ندیم ایک بے قصور پاکستانی نوجوان ہے جو اپنی محبوبہ کی تلاش میں ہے اور پاکستان سے دلّی اور پھر دلّی سے کلکتے پہنچا اور پولیس نے اسے پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا۔ اب یہ جیل سے فرار ہو کر تمھارے پاس آ رہا ہے اسے کسی طریقے سے مغربی بنگال کی سرحد پار کروا کر مشرقی پاکستان پہنچا دو۔

جس وقت ٹرین ریلوے یارڈ میں پہنچی تو پو پھٹ رہی تھی۔ ندیم نے ڈبے میں اپنے اپنے سامان کو سنبھالتے مسافروں کے چہروں کو دیکھا ان میں اسے اس کھدر پوش آدمی کا چہرہ کہیں نظر نہ آیا جس نے لکھیا پور جنکشن پر اسے مسلسل گھور کر دیکھا تھا۔ ندیم نے کھڑکی میں سے سر باہر نکال کر دیکھا سیالدہ کا اسٹیشن اور اس کا یارڈ بہت بڑا تھا۔ ہر طرف روشنیاں ہو رہی تھیں۔ ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہونے لگی تو ندیم نے سر اندر کر لیا اور دروازے کے کونے میں لگ کر بیٹھ گیا۔ ٹرین شور مچاتی پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ مسافروں نے دروازے کی طرف ہلّہ بول دیا۔ ندیم بھی ان میں گھس گیا اور انہی کے ریلے کے ساتھ ڈبے سے نکل کر تھرڈ کلاس والے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسے یہاں سے لوئر چیت پور روڈ پر مسجد ناخدا کے عقب میں واقع امجدیہ ہوٹل جانا تھا۔ ابھی روشنی پوری طرح سے نہیں پھیلی تھی لیکن ندیم کو یقین تھا کہ امجدیہ ہوٹل بھی دوسرے بڑے ریستورانوں کی طرح منہ اندھیرے کھل جاتا ہوگا اور نوکر صفائی وغیرہ میں مصروف ہوں گے۔ امجدیہ ہوٹل ایک بڑا ریستوران بھی تھا جس کی بریانی، پلاؤ، قورمہ اور روغنی نان دور دور تک مشہور تھے جو لوگ کلکتے میں رہ چکے ہیں انھیں معلوم ہوگا کہ امجدیہ ہوٹل اور مسجد ناخدا کا علاقہ مسلمانوں کا گڑھ ہے اور وہاں پاکستان کے بننے سے پہلے امرتسر اور لدھیانہ کے کشمیری شال باف کا کاروبار کرتے تھے یہ لوگ گرم پشمینے کی شالوں کی دھلائی، فروخت اور رفوگری کا کام کرتے تھے۔ یہ لوگ سال میں چھ مہینے یہاں آ کر رہتے تھے۔ کاروبار کرتے اور پھر واپس امرتسر چلے جاتے۔ صرف وہی لوگ

وہاں رہ جاتے جن کی وہاں زکریا سٹریٹ میں کشمیری شالوں اور نوادرات کی اپنی دکانیں تھیں۔ پاکستان بننے سے پہلے حسین شہید سہروردی اس علاقے میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔ یہاں کے امرتسری کشمیری بڑے دلیر تھے اور ان کے دلوں میں اسلام اور پاکستان کی خاطر جان قربان کر دینے کا جذبہ ہر وقت موجزن رہتا تھا۔ ندیم کے لیے لوئر چیت پور روڈ کے پاس زکریا اسٹریٹ اور مسجد ناخدا والا علاقہ اجنبی تھا۔ کلکتے میں ویسے بھی ندیم نے زیادہ وقت جیل اور حوالات میں ہی بسر کیا تھا جہاں اس پر گھناؤنا تشدد ہوتا رہا تھا۔ اس کے نتیجے میں ندیم میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ اب وہ لاہور والا ناتجربہ کار اور نازک خیال کالج اسٹوڈنٹ نہیں تھا بلکہ اس میں ایک مہم جو اور کمانڈو ایسی سخت جان پیدا ہو گئی تھی۔ بنگلہ زبان وہ پوری طرح سمجھ سکتا تھا۔ اگرچہ روانی سے بول نہیں سکتا تھا۔ کلکتے کے اسٹیشن سیالدہ سے وہ خیریت کے ساتھ باہر نکل آیا۔ بھارت کے صوبے مغربی بنگال کا دارالحکومت اور بہت بڑا شہر کلکتہ نیند سے بیدار ہو رہا تھا۔ ستارے بجھ گئے تھے اور ان کی جگہ آسمان پر سلیٹی رنگ کی پھیکی روشنی کا غبار پھیل رہا تھا۔

سڑک کی دونوں جانب کھمبوں پر بتیاں ابھی تک روشن تھیں۔ کچھ مسافر قریبی بس اسٹاپ پر کھڑے ہو گئے۔ ندیم بھی ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پوری طرح بیدار آنکھیں دن کے پھیلتے اجالے میں چاروں طرف غور سے ایک ایک آدمی کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ سی آئی ڈی والا کھدر پوش اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا اس بات کی ندیم کو بڑی تسلی تھی۔ مگر وہاں بس اسٹاپ پر زیادہ دیر ٹھہرنا مناسب نہیں تھا کیونکہ سامنے ہی سیالدہ اسٹیشن کی عظیم الشان عمارت روشنیوں میں جگمگا رہی تھی اور وہاں پولیس کے کچھ سپاہی بھی ندیم نے دیکھے تھے وہ ان کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ ہزار روپیہ چاند خان کے حوالے کرنے کے بعد ندیم نے اپنے پاس سو روپیہ رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھر ادھر ٹیکسی کو تلاش کرنے لگیں۔ وہاں ٹیکسی کا ملنا کوئی دشوار بات نہیں تھی۔ سڑک کے پار اسٹیشن کے پلیٹ فارم کے قریب سڑک پر کتنی ہی خالی ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ مگر ندیم وہاں سے ٹیکسی لینے کا خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ ایک خالی ٹیکسی بس سٹاپ کے قریب دھیمی رفتار سے گزری تو ندیم نے ہاتھ دے کر اسے روک لیا۔ جلدی سے اس میں سوار ہوا اور سکھ ڈرائیور کو مسجد ناخدا کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ امجدیہ ہوٹل کا وہ نام لینا نہیں چاہتا تھا۔

سکھ ڈرائیور نے میٹر اون کیا اور کلکتے کی نسبتاً خالی خالی سڑکوں پر روانہ ہو گیا۔ وہاں سے مسجد ناخدا اتنی قریب نہیں تھی اگر وہ کلکتے کے ہوڑہ اسٹیشن پر اترتا تو فاصلہ زیادہ نہ ہوتا۔ خدا جانے ٹیکسی کہاں کہاں سے گزرتی کافی دیر بعد ایک ایسی سڑک پر آ گئی جس کے وسط میں ٹرام کی لائن بچھی تھی۔ ندیم نے ڈرائیور سے پوچھا کہ مسجد ناخدا ابھی کتنی دور ہے؟ سکھ ڈرائیور بولا "ہم لوئر چیت پور روڈ سے گزر رہے ہیں مسجد ناخدا قریب ہی ہے۔" پھر اس نے پنجابی زبان میں ندیم سے پوچھا کہ وہ پنجاب سے آ رہا ہے؟ ندیم "ہوں" کہہ کر چپ ہو گیا۔ یہ کلکتہ کا قدرے گنجان علاقہ تھا۔ ٹیکسی ایک سینما ہاؤس کے سامنے سے گزری جس کی پیشانی پر مون لائٹ سینما لکھا تھا۔ یہاں اب دن کی روشنی چاروں طرف پھیل چکی تھی۔ سڑک پر ٹریفک بھی شروع ہو گئی تھی۔ یہاں زیادہ تر رہائشی فلیٹ تھے۔ ٹیکسی ایک کشادہ گلی کے کونے پر جا کر رک گئی۔ گلی میں ایک جانب ندیم کو ایک مسجد کا بڑا محرابی دروازہ اور اونچے اونچے مینارے دکھائی دیئے۔ سکھ ڈرائیور نے کہا "یہ مسجد ناخدا ہے باؤ جی۔" ندیم نے کرایہ ادا کیا اور بند دکانوں کے ساتھ ساتھ ہو کر مسجد کے دروازے کی طرف چلنے لگا۔ وہ مسجد کے دروازے کے سامنے سے گزر کر ساتھ والی گلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں کچھ.... دکانیں اسے ایسی ملیں جن کے اندر کچھ لوگ بڑے بڑے مٹکوں میں شالیں ڈالے انھیں پاؤں سے کچل رہے تھے۔ مٹکوں میں سے ریٹھوں کی جھاگ اڑ اڑ کر باہر گر رہی تھی۔ ندیم نے ایک آدمی سے امجدیہ ہوٹل کا پتہ پوچھا۔ اس نے ایک جانب اشارہ کیا اور دیوار پر دونوں ہاتھ ٹکائے پھر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

ندیم گلی میں سے گھوم کر مسجد ناخدا کی عقبی بازار نما گلی میں آیا تو اس کی نظر ایک دو منزلہ عمارت پر پڑی جس کے باہر امجدیہ ہوٹل اردو میں لکھا ہوا تھا۔ ندیم ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ نوکر ہوٹل کا فرش دھو رہے تھے۔ سنگ مرمر کی گول کرسیاں اور میز ایک دوسرے کے اوپر رکھے ہوئے تھے ایک لڑکا کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا کاؤنٹر کے شیشے کے بیام کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ دوسری جانب چبوترے پر انگیٹھیوں میں آگ روشن کر دی گئی تھی۔ ایک انگیٹھی پر بڑا تسلہ چڑھا ہوا تھا۔ جس میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ کئی پتیلے، چائے کی چینکیں، شیشے کے گلاس اور پیالیاں ایک طرف فرش پر پڑی تھیں۔ ندیم کو بتایا گیا تھا کہ امجدیہ ہوٹل کے مالک جبار علی سے اسے ملنا ہو گا

ندیم کو یقین تھا کہ اس کے ساتھی ٹرک ڈرائیور چاند خان نے جبار علی کو راجو کا خط پہنچا دیا ہوگا۔ اور خود بھی اسی ہوٹل میں ہوگا۔

ندیم نے گلی کے آر پار دیکھا یہ کافی کشادہ گلی تھی جو چھوٹا سا بازار لگتی تھی۔ کلکتے میں اس قسم کے چھوٹے بازاروں کو گلی ہی کہا جاتا ہے۔ یہی شاید زکریا اسٹریٹ تھی۔ گلی میں بہت کم لوگ تھے ایک دُبلا پتلا بنگالی بوڑھا اپنے سر پہ ناریلوں کا ٹوکرا اٹھائے ندیم کے سامنے سے گزر گیا۔ پھر ایک ملازمہ قسم کی بنگالی عورت ہاتھ میں تھیلا پکڑے گزر گئی اسے کوئی مشتبہ شخص اپنی طرف گھورتا نظر نہ آیا۔ ندیم نے اللہ کا نام لے کر سڑک پار کی عبور کی اور سیدھا امجدیہ ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ جو لڑکا کاؤنٹر پر سجے ہوئے شیشے کے بیام صاف کر رہا تھا اس نے بنگلہ میں کہا کہ ابھی چائے نہیں ملے گی۔ ندیم نے آہستہ سے قریب جا کر اردو میں کہا کہ مجھے جبار علی صاحب سے ملنا ہے وہ کہاں ہوں گے لڑکے نے ایک بوڑھے بنگالی ملازم کو آواز دے کر بلا لیا۔ بوڑھے بنگالی نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں ندیم سے پوچھا کہ وہ سیٹھ سے کیوں ملنا چاہتا ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ ندیم نے کہا کہ وہ پنجاب سے آیا ہے اور سیٹھ کے نام اس کے بھائی کا پیغام لایا ہے۔ بوڑھے نے ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ ہوٹل کے بڑے کمرے میں جگہ جگہ سنگ مرمر کی چھوٹی چھوٹی میزیں اور کرسیاں رکھی جا رہی تھیں۔ پیچھے ایک زینہ اوپر والی منزل کو جاتا تھا۔ بوڑھا بنگالی اس زینے پر سے ہوتا ہوا ندیم کو دوسری منزل میں لے گیا یہاں ایک چھوٹا دالان تھا سامنے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ مگر اندر سے دو آدمیوں کے باتیں کرنے کی مدہم آواز آ رہی تھی۔ بوڑھے بنگالی ملازم نے بند دروازے کے پاس جا کر بنگلہ میں کہا سیٹھ صاحب پنجاب سے کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ اندر سے آنے والی آوازیں ایک دم بند ہو گئیں پھر دروازہ کھلا اور ایک بھاری بھرکم جسم والا سرخ و سفید ادھیڑ عمر آدمی نمودار ہوا جس نے سفید شلوار اور سلک کی قمیض پہن رکھی تھی۔ اس کے آنکھوں کے پپوٹے بھاری اور پھولے ہوئے تھے۔ سر کے گھنگریالے سیاہ بالوں میں کہیں کہیں سفیدی جھلک رہی تھی۔ بھرے بھرے چہرے والے اس آدمی کی شکل بتا رہی تھی کہ کبھی یہ خوبصورت نوجوان رہ چکا ہے اس نے ندیم کی طرف گھور کر دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے نوکر کو چلے جانے کو کہا۔ جب بوڑھا بنگالی ملازم نیچے سیڑھیاں اتر گیا تو اس شخص نے پنجابی میں ندیم سے پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے؟ ندیم نے تسلی کے لیے سوال کیا" کیا آپ ہی سیٹھ جبار علی ہیں؟ سیٹھ

نے اثبات میں آہستہ سے سر ہلایا تو ندیم نے کہا۔

"میرا نام ندیم ہے۔" اس پر پیچھے سے چاند خان کی آواز آئی "سیٹھ اسے اندر لے آؤ۔" جبار علی نے ندیم کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ کمرے میں چاند خان پہلے سے موجود تھا۔ اس نے اٹھ کر ندیم کو گلے لگا لیا اور پہلا سوال یہی کیا کہ اسے کسی نے یہاں آتے دیکھا تو نہیں ہے۔ ندیم نے گردن ایک طرف جھکاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا ویسے لکھیا پور جنکشن پر ایک آدمی نے ضرور میری طرف گھور کر دیکھا تھا۔" ڈرائیور چاند خان نے جبار علی سے ندیم کا معمولی سا تعارف کرایا۔ تفصیل وہ پہلے ہی جبار سیٹھ کو بتا چکا تھا۔ جبار سیٹھ کو دلّی والے اپنے جگری دوست راجو کا خط بھی پہنچا دیا گیا تھا۔ جبار سیٹھ چارپائی پر پاؤں اٹھا کر بیٹھ گیا۔ ندیم سامنے والے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ چھت والا پنکھا بڑی سست رفتار سے چل رہا تھا۔ کلکتے کا موسم زیادہ گرم نہیں تھا پھر بھی گھروں میں پنکھے چل رہے تھے۔ جبار سیٹھ نے ندیم کو کریون اے کا سگریٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔

"چاند خان نے رات کو ہی مجھے راجو کا خط پہنچا دیا تھا ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ ٹرین میں تو تمہارا کوئی تعاقب نہیں کر رہا تھا۔؟"

ندیم نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لگایا اور ذرا آگے کو جھک کر بولا "جہاں تک میرا خیال ہے میرا تعاقب نہیں کیا گیا بس لکھیا پور کے جنکشن پر ایک کھدر پوش بنگالی نے میری طرف گھور کر دیکھا تھا اس کے بعد وہ آدمی مجھے کہیں نظر نہیں آیا ہو سکتا ہے وہ سی آئی ڈی کا آدمی نہ ہو اور اس نے ویسے ہی مجھے گھور کر دیکھا ہو۔" جبار سیٹھ نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہنے لگا "بہرحال تمہیں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے بارے میں یہاں اخباروں میں بھی کافی خبریں آ چکی ہیں۔ تمہاری تصویر بھی پولیس نے اخباروں میں چھپوا رکھی ہے تم نے اچھا کیا جو تھوڑی سی داڑھی بڑھا لی ہے پھر بھی تم پہچانے جا سکتے ہو۔ پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام کوئی معمولی الزام نہیں ہے اور پھر تم پولیس کی حراست سے فرار بھی ہو چکے ہو۔ ابھی تک پولیس نے زکریا سٹریٹ کے علاقے میں کہیں چھاپہ نہیں مارا۔ لیکن یقینی بات ہے کہ یہاں انٹیلی جنس کے آدمی ضرور نگرانی کر رہے ہوں گے کیونکہ یہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دلی پولیس کی گارڈ اور انٹیلی جنس کا گروپ تمہاری تلاش میں یہاں

کلکتے پہنچ چکا ہو۔“

جبار سیٹھ کو ندیم کے بارے میں ایک ایک تفصیل معلوم تھی۔ کچھ اس نے اخباروں میں پڑھ لی تھی اور باقی کی تفصیلات اسے چاند خان نے بتا دی تھیں۔ ندیم خاموشی سے جبار سیٹھ کی باتیں سن رہا تھا جب وہ خاموش ہوا تو ندیم نے کہا۔ ”جیسا کہ راجو نے بھی آپ کو لکھا ہوگا میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ...“

جبار سیٹھ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”ستمبر کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستان کا بارڈر کراس کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ سرحد پار کروانے سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے میں یہاں شرافت سے اپنا کاروبار کر رہا ہوں لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر پاکستان سے آیا ہوا کوئی مسلمان مشکل میں پھنس جائے تو اس کی مدد ضرور کرتا ہوں۔ راجو میرا دوست ہے تم اس کا خط نہ بھی لاتے تو میں کسی نہ کسی طرح تمھاری مدد ضرور کرتا لیکن اب راجو کی وجہ سے مجھ پر تمھاری مدد فرض بن گئی ہے.... میرے کچھ دوست ایسے ہیں جو سرحد پار کروا سکتے ہیں۔ میں ان سے بات کروں گا اتنا مجھے ضرور معلوم ہے کہ ستمبر کی جنگ کے بعد سرحدوں پر دونوں جانب سیکورٹی فورس بڑھا دی گئی ہے اور اسمگلر بھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے ہوئے ہیں لیکن نا امید ہونے کی ضرورت نہیں کچھ وقت گزرنے پر یہ سختی ختم ہو جائے گی۔“

ندیم اکیلا سرحد پار کر کے مشرقی پاکستان نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ نجمی کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی مقصد کو ذہن میں لے کر وہ کلکتے آیا تھا۔ نجمی کی زندگی اس کی وجہ سے برباد ہوئی تھی اور اب ندیم اسے گناہوں کی دلدل سے نکال کر کسی حد تک اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ نجمی کو کلکتے سے نکال کر ڈھاکہ لے جائے گا اور وہاں اس سے شادی کرے گا۔ وہ جبار سیٹھ سے اس ضمن میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ابھی سرحد پار کرنا مشکل ہے تو اس نے نجمی کے بارے میں کوئی بات نہ کی۔ جبار سیٹھ کہنے لگا ”تمھارا میرے ہاں رہنا ٹھیک نہیں... جب تک کہ سرحدوں پر آنا جانا پھر سے ٹھیک نہیں ہو جاتا اتنی دیر تک تمھیں کسی دوسری جگہ رہنا ہوگا۔ میں اس کا بندوبست کروں گا۔ اس وقت تم نہا دھو کر ناشتہ وغیرہ کر لو۔“ پھر اس نے ندیم کے لکھنؤ کے ساتھی چاند خان ٹرک ڈرائیور کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ ”تم واپس ٹرک لے کر کب جا رہے ہو؟“

چاند خان نے اسے بتایا کہ وہ اسی دن رات کو مال لے کر لکھنؤ چلا جائے گا۔ جبار سیٹھ نے

اسے ہدایت کی کہ وہ کسی طریقے سے راجو تک یہ پیغام پہنچا دے کہ جیسا اس نے کہا ہے ویسے ہی ہوگا۔ چاند خان نے آخری بار ندیم کو تسلی دی اسے گلے لگایا اور رخصت ہو گیا۔ جبار سیٹھ اس کے ساتھ باہر دالان تک گیا جب چاند خان چلا گیا تو جبار سیٹھ واپس کمرے میں آگیا اور ندیم کی طرف دیکھ کر بولا ”جب تک میں نہ آؤں تم اس کمرے سے باہر مت نکلنا۔“

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ندیم کمرے میں اکیلا رہ گیا۔ اسے طرح طرح کے پریشان خیالوں نے گھیر لیا اس کا خیال بار بار نجمی کی طرف جاتا وہ بھی اسی شہر میں تھی اور جس فضا میں ندیم سانس لے رہا تھا نجمی بھی اسی فضا میں سانس لے رہی تھی۔ وہ اڑ کر اس کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا۔ مگر نہیں جا سکتا تھا۔ جیل میں اسے صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا تھا کہ پولیس نے نجمی کو رہا کر دیا ہے مگر اس کی مسلسل نگرانی کی جا رہی ہے۔ دلی پولیس بھی کلکتے پہنچ گئی ہوگی۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ ندیم فرار ہو کر نجمی کے پاس ضرور جائے گا۔ ندیم مونڈھے پر سے اٹھ کر پلنگ کی پٹی سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ ساری رات پریشانی کے عالم میں سفر میں گزری تھی۔ بیچ میں تھوڑی دیر کے لیے ہی اس کی آنکھ جھپکی تھی اسے نیند آ رہی تھی مگر وہ سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ جبار سیٹھ نے اسے نہانے اور ناشتہ کرنے کے لیے کہا تھا۔ ندیم نے کمرے کا جائزہ لیا غسل خانہ کمرے کے اندر ہی تھا وہ خود بھی نہانا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور غسل خانے میں داخل ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب نہا کر باہر نکلا تو کافی حد تک تازہ دم ہو گیا تھا۔ نیچے سڑک پر سے اب ٹریفک کے شور کی آواز آنے لگی تھی۔ چند لمحے کے بعد جبار سیٹھ کمرے میں آیا۔ دروازہ بند کر کے بولا۔ ”میرے ہوٹل کے نوکروں نے تمھیں دیکھ لیا ہے۔ ایسی فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے انھیں یہی بتایا ہے کہ میرے ایک جاننے والے کا بھائی ہے آج شام واپس چلا جائے گا....... میرا اندازہ تو یہی ہے کہ ان میں سے کسی نے تمھیں نہیں پہچانا۔“ باہر سے نوکر کی آواز آئی۔

”سیٹھ صاحب ناشتہ لے آیا ہوں۔“ سیٹھ جبار خود اٹھ کر باہر دالان میں گیا اور ناشتے کی ٹرے نوکر سے لے کر اندر آ گیا۔ ”ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا کہ میرا کوئی جاننے والا میرے پاس آیا ہو اور میں اس کا ناشتہ خود لے کر کمرے میں جاؤں۔ یہ بات میرے نوکروں کو شک میں ڈال سکتی ہے میرے نوکر زیادہ تر مسلمان ہیں۔ مگر دو ہندو بنگالی بھی ہیں...... خیر کوئی بات نہیں جو ہوگا

دیکھا جائے گا تم ناشتہ کرو میں تمہارے لیے کسی مناسب جگہ کا بندوبست کرنے جاتا ہوں جہاں تم محفوظ ہو کر رہ سکو،، جبار سیٹھ چلا گیا۔ ندیم ناشتہ کرنے لگا پہلی بار وہ باہر تالا لگا گیا تھا اس نے جاتے ہوئے ندیم کو یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ وہ اندر سے کوئی کھڑکی وغیرہ نہ کھولے ناشتے میں پوڑی حلوہ اور قیمے کا قتلہ بھی تھا۔۔۔۔ چائے کی بھری ہوئی چینک بھی ساتھ ہی تھی ندیم کو سخت بھوک لگی تھی اس نے جی بھر کر ناشتہ کیا اور پھر پلنگ پر لیٹتے ہی گہری نیند میں کھو گیا۔ اس کی آنکھ اس وقت کھلی جب خود جبار سیٹھ اسے جگا رہا تھا۔ وہ کاندھے پر ہاتھ رکھے اسے آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔ ندیم نے آنکھیں کھول دیں۔ خواب میں وہ اپنی والدہ اور والد کے پاس پہنچا ہوا تھا اسے یوں لگا جیسے اب بھی وہ لاہور میں اپنے گھر پہ ہی ہے مگر بہت جلد یہ سحر ٹوٹ گیا جب اس نے سیٹھ جبار کا بھرا بھرا چہرہ اور غلافی آنکھیں اپنے اوپر جھکی ہوئی دیکھیں۔ وہ جلدی سے اٹھ بیٹھا۔ جبار سیٹھ نے کہا۔

،، نیچے بازار کے کونے میں داہنی جانب ایک بند جیپ کھڑی ہے اس کا پچھلا کینوس کا دروازہ کھلا ہے اس میں جا کر بیٹھ جاؤ۔ ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر مت بیٹھنا۔ ڈرائیور تمہیں شہر سے باہر ایک چھوٹے تالاب کے کنارے والے مکان میں لے جائے گا۔ ڈرائیور سے کوئی بات نہ کرنا اور اس مکان میں گھس کر بیٹھ جانا اور میرا انتظار کرنا جلدی کرو۔،،

ندیم نے اپنے آپ کو ٹھیک کیا۔۔۔۔ آنکھوں پر ہاتھ پھیرا اور اللہ کا نام لے کر نیچے اتر گیا۔ بازار میں داہنی جانب نظر اٹھائی کونے میں جہاں کشادہ گلی بڑی سڑک سے ملتی تھی وہاں اسے ایک خاکی رنگ کی بند جیپ کھڑی نظر آئی۔ گلی میں دھوپ مکانوں کے اوپر تک چلی گئی تھی لگتا تھا دن کا تیسرا پہر ہو گیا ہے وہ کافی دیر تک سویا رہا تھا۔ ندیم لمبے لمبے ڈگ بھرتا گلی کے آخری کنارے پر جیپ کے قریب گیا۔ پچھلا کینوس کا دروازہ کھولا اور اندر جا کر بیٹھ گیا۔ جیپ چاروں طرف سے بند تھی۔ اندر ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک چھوٹی سی کینوس کی کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور شکل و صورت سے بنگالی نہیں پنجابی لگتا تھا۔ اس نے گردن گھما کر ندیم کو دیکھا پھر سیدھا ہو کر اس طرح بیٹھ گیا کہ کھڑکی اس کی پیٹھ کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کے ساتھ ہی انجن اسٹارٹ ہوا اور جیپ تیزی سے ایک طرف نکل کر سڑک پر آ گئی۔ مختلف سڑکوں اور ٹریفک کے شور میں

ڈوبے ہوئے بازاروں میں سے گزرتی جیپ ایک کشادہ سڑک پر آ گئی۔ ندیم نے اپنی سیٹ کے پیچھے کینوس کی دیوار کے سوراخ میں سے باہر دیکھا۔ کلکتے کی یہ سڑک کافی چوڑی تھی اور دور سامنے کنارے پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اونچی اونچی عمارتیں کھڑی تھیں۔ سڑک پر سے کاریں اور بسیں گزر رہی تھیں۔ یہ سڑک کافی طویل تھی۔ پھر جیپ بائیں جانب گھوم کر ایک ایسی سڑک پر آ گئی جس کی ایک جانب وسیع گراؤنڈ تھا۔ گراؤنڈ میں فٹ بال کا کھیل ہو رہا تھا یہاں سے بھی جیپ آگے نکل گئی۔ تیسرے پہر کی نیم سنہری روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ جیپ اب دریائے ہگلی کے پل پر سے گزر رہی تھی۔ دریا بھی پیچھے رہ گیا کچھ اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانے آئے وہ بھی پیچھے رہ گئے۔ جیپ بڑی سڑک پر سے اتر کر ایک کچے راستے پر چل رہی تھی۔ یہاں جس طرف ندیم بیٹھا تھا اس طرف پہلے تو کھیتوں کا سلسلہ دور تک ساتھ ساتھ چلتا گیا پھر ایک جھیل گزر گئی جس کے کنارے گھنے درخت کھڑے تھے جیپ کئی موڑ کاٹ کر ایک ویران سے جنگلی علاقے میں آ گئی تھی۔ یہاں نہ کھیت تھے نہ کوئی مکان۔۔۔۔ بس جنگلی جھاڑیاں، تاڑ، ناریل اور راملی کے درخت جگہ جگہ اگے ہوئے تھے زمین ناہموار تھی جیپ کی رفتار آہستہ ہو گئی تھی۔ معلوم ہوا کہ یہ کوئی باقاعدہ سڑک نہیں ہے۔ مٹی بھی اڑ رہی تھی۔ ندیم نے عقبی دروازے کا تھوڑا سا پردہ اٹھا کر پیچھے دیکھا۔ جیپ ایک جنگل سے گزر رہی تھی۔ جنگلی جھاڑیاں اور اونچی نیچی خشک گھاس جگہ جگہ اگی ہوئی تھی۔ جیپ جس کچے راستے سے گزر رہی تھی وہاں سے مٹی اڑ رہی تھی۔ بہت جلد جیپ نے ایک موڑ کاٹا تو وہ سایہ دار درختوں کے نیچے آ گئی۔ یہاں دن کی روشنی کم ہو گئی۔ زمین بھی کچی نہیں تھی بلکہ گیلی گیلی تھی اور اس پر گھاس اُگ رہی تھی۔ ندیم پیچھے ہٹ کر بیٹھ گیا۔ جیپ ہچکولے کھا رہی تھی۔

کچھ منٹ جنگل میں اسی طرح دھیمی رفتار سے دھچکے کھاتے جیپ چلتی چلی گئی۔ آخر وہ ایک طرف گھوم کر رک گئی۔ انجن غرا رہا تھا۔ انجن کو ڈرائیور نے بند نہیں کیا تھا۔ ڈرائیور اگلی سیٹ سے باہر نکل گیا۔ ندیم نے عقبی دروازے کو کھول دیا۔ جیپ کے اندر جنگل کی تر و تازہ مرطوب ٹھنڈی ہوا کا جھونکا داخل ہوا۔ ندیم جیپ سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور نے اردو میں کہا ”وہ ہے سامنے مکان،، اس سے آگے اس نے کچھ بھی نہ کہا اور جیپ میں سوار ہو کر جدھر سے آیا تھا ادھر کو

چل دیا۔ جب جیپ درختوں میں غائب ہوگئی تو ندیم نے مکان کی طرف نگاہ ڈالی یہ اک منزلہ ٹین کی ڈھلانی چھت والا کوارٹر ایک تالاب کے کنارے زمین سے کوئی چار فٹ اونچی مچان پر بنا ہوا تھا۔ آگے بانسوں کو جوڑ کر چھوٹا سا لکڑی کا برآمدہ بنا دیا گیا تھا۔ اس مکان کی دیواریں بھی لکڑی کی تھیں اور آدھے مکان پر کوئی جنگلی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ندیم آگے بڑھا۔ کوارٹر کا دروازہ بند تھا اور باہر صرف کنڈی لگی ہوئی تھی۔ ندیم مختصر سے لکڑی کے برآمدے سے گزر کر دروازے کے پاس آیا۔ اسے کھول کر اندر دیکھا یہ لکڑی کے فرش والا ایک مختصر سا کمرہ تھا جس میں ایک طرف چارپائی پر بستر تہہ کر کے رکھا ہوا تھا۔ کونے میں پرانی سی چھوٹی گول میز اور کرسی پڑی تھی۔ اندر آکر ندیم کو معلوم ہوا کہ ایک دروازہ پیچھے بھی کھلتا ہے وہ دروازہ کھول کر دوسری طرف آیا تو یہاں دائیں بائیں آمنے سامنے جو جھونپڑیاں سی جھاڑیوں اور درختوں کے بیچ بنی ہوئی تھیں ان میں سے ایک غسل خانہ تھا جہاں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ صابن، تولیہ، کنگھی سب کچھ موجود تھا دوسری جھونپڑی میں تیل کا چولھا اور کچھ برتن پڑے تھے۔ ندیم کو اس خیال سے گھبراہٹ سی محسوس ہوئی کہ شاید اسے یہاں کافی دیر رہنا پڑے گا۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی اس نے صراحی میں سے پانی نکال کر پیا اور چارپائی والے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور کمرے کا ایک بار پھر جائزہ لیا۔ یہاں بجلی نہیں تھی۔ طاق میں موم بتیوں کا ایک پیکٹ اور ماچس پڑی تھی۔ وہ اُٹھ کر باہر نکل آیا۔ اس کوارٹر کے چاروں طرف جنگل ہی جنگل تھا۔ رات کو یہاں کوئی شیر چیتا آگیا تو کیا ہوگا؟ ہر طرف گہری خاموشی چھا رہی تھی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی کسی پرندے کے بولنے کی آواز تھوڑی دیر کے لیے بلند ہو کر خاموش ہو جاتی تھی۔ ندیم کو ایسے محسوس ہوا جیسے اسے قیدِ تنہائی میں ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن حالات کچھ ایسا رُخ اختیار کر چکے تھے کہ یہ قیدِ تنہائی قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سورج غروب ہونا شروع ہوا تو ندیم کو جیپ کے انجن کی آواز سنائی دی وہ کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ وہی کینوس کے فریم والی جیپ سامنے والے درختوں میں آکر کھڑی ہوگئی۔ جبار سیٹھ خود اسے چلا رہا تھا وہ نیچے اُتر آیا۔ پیچھے کی طرف جا کر اس نے ایک بڑا تھیلا باہر نکال کر پکڑا اور ندیم کے قریب آکر بولا "جیپ کی آواز پر تمھیں اس طرح باہر نہیں نکلنا چاہیئے تھا..... اگر میری جگہ پولیس کی جیپ ہوتی تو کیا کرتے؟" وہ اپنے ساتھ ندیم کے لیے کھانا،

چائے کی بھری ہوئی تھرمس اور کچھ پھل لایا تھا۔ ندیم کے آگے کھانا کھول کر کہنے لگا۔

"میرے مخبروں نے مجھے خبر دی ہے کہ دلی سے پولیس کی ایک گارڈ کلکتہ پہنچ گئی ہے جس میں سی آئی ڈی کے تین تجربہ کار انسپکٹر بھی شامل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ تمھاری تصویریں کلکتہ سٹی کے تمام تھانوں میں پہنچا دی گئی ہیں اور سوناگاچی میں لکھی بائی کے کوٹھے اور دریائے ہگلی والی اس کی پرانی کوٹھی کے گرد بھی سی آئی ڈی والوں کی نفری میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔

ندیم خاموشی سے کھانا کھاتا رہا۔ اب یہ باتیں اس کے لیے روزمرّہ کا معمول سا بن کر رہ گئی تھیں۔ پولیس والوں کی طرف سے دی گئی گھناؤنی جسمانی اذیتوں، جیل سے فرار اور سخت جان زندگی نے اسے کافی حد تک بے حس بنا دیا تھا۔ کوئی خیال اگر اس کے دل میں گداز پن پیدا کرتا تھا تو وہ نجمی کا خیال تھا جس کی زندگی محض اس کی وجہ سے تباہ و برباد ہو گئی تھی۔ ندیم کو اپنے اس گناہ کا اتنی شدت سے احساس تھا کہ اگر وہ دس بار مر کر بھی نجمی کے ساتھ کیے گئے ظلم کا کفارہ ادا کر سکتا تو وہ اس پر تیار تھا اگرچہ اس سارے الم انگیز کھیل میں اس کی نیت بالکل نیک تھی اس کے باوجود محض اس کے کہنے پر نجمی نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑا تھا اور ایک ایسی گہری کھائی میں جا گری تھی کہ جہاں سے اس کا نکلنا اتنا آسان کام نہیں تھا جتنا کہ ندیم سمجھ رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سیٹھ جبار کی باتیں سنتا رہا اس نے بیچ میں صرف اتنا کہا "آپ کے خیال میں مجھے یہاں کتنے دنوں تک رہنا پڑے گا سیٹھ صاحب؟" جبار سیٹھ کوارٹر کے اندر چارپائی پر ٹانگیں اوپر کر کے بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ اس کے منہ میں سونفی پان تھا جس کی ہلکی ہلکی خوشبو کمرے میں پھیل رہی تھی۔ کہنے لگا "کچھ نہیں کہا جا سکتا ابھی میں ان لوگوں سے نہیں مل سکا جنھوں نے تمھیں سرحد پار کروا کر مشرقی پاکستان پہنچانا ہے یہ تو ان سے مل کر ہی کچھ کہا جا سکتا ہے۔ بہرحال یہاں تمھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی کھانا تمھیں روزانہ صبح کو پہنچ جایا کرے گا۔ پیچھے کچن میں بھی آگ وغیرہ کا انتظام ہے مٹی کے تیل کا چولھا اور بوتل بھی تیل سے بھری ہوئی ہے چائے کی پتی چینی وغیرہ سب کچھ ہے ویسے چائے سے بھری ہوئی بڑی تھرمس روزانہ یہاں کھانے کے ساتھ ہی پہنچ جایا کرے گی۔"

ندیم نے کھانا کھانے کے بعد ہاتھ دھوئے اور سگریٹ سلگا کر بولا "سیٹھ صاحب آپ نے مجھے

یہاں پناہ دے کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے ..... میں آپ کے اس احسان کو کبھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

جبار سیٹھ نے ہاتھ کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر ایک طرف ہلایا اور بولا "اس میں احسان کی کوئی بات نہیں ہے پتر..... ایک تو تم پاکستانی ہو... مسلمان ہو..... دوسرے مصیبت میں ہو اور اوپر سے میرے جگری یار راجو نے تمھیں میرے پاس بھیجا ہے۔ اب تم خود ہی اندازہ لگا لو کہ مجھ پر تمھاری کتنی بھاری ذمے داری پڑ گئی ہے۔"

ندیم نے پوچھا..... "ویسے آپ کا اندازہ کیا کہتا ہے کب تک سرحد پر حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔"

جبار سیٹھ نے آنکھیں سکیڑیں اور سگریٹ کا کش لگا کر بولا "یہ میں کالیے سے مل کر ہی کچھ کہہ سکوں گا ویسے میں نے آج رات اسے بلایا ہوا ہے۔ کالیا بھاری مسلمان ہے دوستوں کے لیے جان قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے پاکستان سے اسے بھی بہت عشق ہے میری طرح .... لاؤ تمھارے لیے چائے ڈال دوں۔"

جبار سیٹھ نے پلاسٹک کے گلاسوں میں تھرمس میں سے چائے نکال کر ڈالی۔ ندیم بھی گہری سوچ میں گم چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ سیٹھ جبار کو نجمی کے ساتھ لے جانے کے بارے میں کچھ بتا دے یا ابھی نہیں؟ ندیم یہ سوچ ہی رہا تھا کہ جبار سیٹھ نے خود ہی اس موضوع کو چھیڑ دیا۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے ندیم سے پوچھا۔

"جس عورت کی خاطر تم نے یہ سارا جھنجھٹ مول لیا، اتنی مصیبتیں اٹھائیں، پولیس کی اذیتیں برداشت کیں کیا اسے تم بلکتے کے گناہ بازار میں ہی چھوڑ جاؤ گے؟"

ندیم جبار سیٹھ کا منہ تکنے لگا۔ وہ ندیم اور نجمی کے المناک رومان سے پوری طرح واقف تھا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ راجو نے جبار سیٹھ کو جو خط لکھا تھا اس میں اس کی وضاحت کر دی تھی کہ نوجوان ندیم لاہور سے بھارت کس مقصد کو لے کر آیا ہے دوسری وجہ یہ تھی کہ جبار سیٹھ کا براہ راست نہ سہی مگر کلکتے کے جرائم پیشہ افراد سے تعلق ضرور تھا اور جب اخباروں میں پاکستانی جاسوس ندیم کی خبریں چھپیں تو جبار سیٹھ کو ساری کہانی معلوم ہو گئی۔

علاوہ ازیں سوناگاچی میں منشیات کا دھندا کرنے والوں نے بھی جبار سیٹھ کو چندا عرف نجمی کے بارے میں کافی کچھ بتا دیا تھا۔ ندیم نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ جبار سیٹھ خود ہی بولا "ہم سے بھی ایک پاکستانی عورت کی یہ بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی مگر ہم یہاں بہت مجبور ہیں ہمارا سارا کاروبار اسی جگہ پر ہے ہمارے بچے اسی ملک میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک ایک قدم ہزار بار سوچ کر اٹھانا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود میں تم دونوں کو بارڈر کراس کروانے کی پوری کوشش کروں گا.... کیا تم اس چندا نام کی مسلمان عورت کو اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے جانے پر تیار ہو۔؟"

ندیم نے جبار سیٹھ کا ہاتھ تھام لیا اور انکساری سے بولا "سیٹھ صاحب میں چندا کو یہاں گناہ کی دلدل میں کیسے چھوڑ کر جا سکتا ہوں میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں.... یہ بات تو میں خود آپ سے کرنے والا تھا۔"

جبار سیٹھ نے پیالی نیچے رکھ دی کریون اے سگریٹ کا کش لگایا اور پان کو ایک گال میں چباتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے تمھیں ایسا ہی کرنا چاہیئے تمھاری محبوبہ چندا کو لکھی بائی کے اڈے سے نکالنا سخت مشکل کام ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کلکتہ سی آئی ڈی اس کی نگرانی کر رہی ہے۔ لکھی بائی کے سوناگاچی والے کوٹھے اور دریائے ہگلی والے اسکوائر کی پرانی کوٹھی کے باہر ہر وقت دو چار انٹیلی جنس کے آدمی موجود ہوتے ہیں۔ چندا جہاں جاتی ہے یہ لوگ اس کے پیچھے پیچھے جاتے ہیں اس کے باوجود میں پوری کوشش کروں گا کہ چندا کو میرے اسمگلر دوست کے آدمی یہاں سے کسی طرح نکال کر تمھارے ساتھ سرحد پار کرا دیں۔"

ندیم نے قدرے مضطرب لہجے میں پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ چندا کو بھی اسی جگہ چھپا دیا جائے۔؟"

جبار سیٹھ نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں ذرا سی سکیڑیں اور کہا "میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کبھی میں اس قسم کے خطروں میں کود جایا کرتا تھا لیکن جب سے میرے بچے جوان ہوئے ہیں میں ایسا نہیں کرتا..... میں نے بڑی مشکل سے پولیس کے ریکارڈ میں اپنی فائلیں داخل دفتر کروائی ہیں ..... میں انھیں دوبارہ نہیں کھلوانا چاہتا ..... ہاں اتنا ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ

تم دونوں کو جس طرح بھی ہو سکا مشرقی پاکستان پہنچا دوں گا۔"

ندیم نے کہا "تو پھر ایک مہربانی کریں کہ نجمی یعنی چندا کو یہ اطلاع پہنچا دیجئے کہ میں خیریت سے ہوں.....وہ میرے بارے میں بڑی فکر مند ہو گی۔"

جبار سیٹھ نے وعدہ کیا کہ وہ چندا کو یہ خبر پہنچا دے گا۔ جبار سیٹھ دوسرے دن کھانا لے کر آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد ندیم نے اپنے آپ کو کمرے میں بند کر لیا اور نجمی کی سوگوار یادوں میں کھو گیا۔ نجمی نے اب ہفتے کی شام کو لکھی بائی کے اشارے پر سونا گاچی والی بیٹھک میں مجرا شروع کر دیا تھا مگر وہ پہلے جیسی نجمی نہیں رہی تھی اب وہ ایک تجربہ کار نڈر اور بے باک طوائف بن چکی تھی جس کے سینے میں ہر وقت ان لوگوں سے بھیانک انتقام لینے کی آگ سلگتی رہتی تھی۔ جنھوں نے اس کے ساتھ بہیمانہ اور اخلاق سوز سلوک کیا تھا۔ ان میں گل مچھوں والا موحمیدار سر فہرست تھا اس کے بعد خضر پور جیٹی کے کوارٹر والے روپا اور کالی بدمعاش تھے جنھوں نے لکھی بائی کے کہنے پر نجمی کے ذہن میں مسلسل تین دن تک غلیظ گالیوں کا زہر گھولا تھا۔ اسی فہرست میں لکھی بائی کا نام بھی شامل تھا جو بھولی بھالی لڑکیوں کو خرید کر انھیں طوائف بنا دیتی تھی۔ نجمی کسی موقع کے انتظار میں تھی ابھی تک اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ موقع کس قسم کا ہوگا کہ وہ ان تمام بدمعاشوں اور انسانیت کے قاتلوں سے ایک ساتھ بدلہ لے سکے گی۔

جب پولیس انسپکٹر منجریکر نے اسے حوالات سے رہا کر دیا اور نجمی واپس لکھی بائی کے پاس آ گئی تو نجمی کو اس دن سے ندیم کی فکر لگی تھی کہ خدا جانے جیل میں اس کے ساتھ پولیس کس قسم کا وحشیانہ سلوک کر رہی ہو گی پھر جب اس نے سنا کہ ندیم جیل سے فرار ہو گیا ہے تو اس نے اطمینان کا سانس لیا لیکن ساتھ ہی اس پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ انٹیلی جنس کے آدمی اس کی مسلسل نگرانی کرنے لگے ہیں۔ لکھی بائی تو چندا سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی وہ اسے کہیں نہ کہیں فروخت کرنے پر تیار ہو گئی تھی لیکن انسپکٹر منجریکر نے لکھی بائی کو سختی سے منع کر دیا اور کہا "چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں کے ایک گروہ سے ہے اس گروہ کا سراغ لگانا چاہتے ہیں اس کے لیے ضروری ہے کہ چندا تمھارے کوٹھے پر ہی رہے ہمیں یقین ہے کہ ان پاکستانی جاسوسوں میں سے کوئی نہ کوئی اسے ملنے یہاں ضرور آئے گا یا چندا خود ان سے ملنے جائے گی ہم اس کی برابر نگرانی کر رہے

ہیں۔" لکھی بائی سر پکڑ کر رہ گئی۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر واقعی چندا کا تعلق پاکستانی جاسوسوں کے کسی گروہ سے ہے تو کہیں لکھی بائی خود کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے لیکن وہ چندا کو پولیس کی ہدایت کے مطابق اپنے پاس رکھنے پر مجبور تھی اس نے اب اسے سونا گاچی والے کوٹھے پر بھی بھیجنا شروع کر دیا یہ بھی پولیس کے اشارے پر کیا گیا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو یقین تھا کہ کوئی نہ کوئی پاکستانی جاسوس کسی تماش بین کے بھیس میں چندا کے پاس ضرور آئے گا۔ دوسری طرف جب جبار سیٹھ کے آدمی نے نجمی کو خفیہ طور پر یہ خبر پہنچائی کہ ندیم کلکتے میں ہی ہے اور خیریت سے ہے تو نجمی کا دل ندیم سے ملنے کے لیے تڑپ اٹھا جس آدمی نے اسے ندیم کے بارے میں بتایا تھا نجمی نے اس سے کسی نہ کسی طرح یہ بھی معلوم کر لیا کہ ندیم کلکتے کے مشرقی جنگل میں کہاں چھپا ہوا ہے۔ اب محبت کے جوش میں آ کر نجمی نے یہ حماقت کی کہ ایک روز منہ اندھیرے دریائے ہگلی والی پرانی کوٹھی سے باہر نکلی سڑک پر آ کر ٹیکسی پکڑی اور ندیم کی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ انٹیلی جنس کا ایک آدمی دوسری ٹیکسی میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔

- - - ÷ - - -

نجمی نے چلتے وقت ایک چھوٹا پستول اپنی ساڑھی میں اڑس لیا چاقو اور پستول اب اس کے لیے کوئی انوکھی شئے نہیں رہے تھے وہ جس ماحول میں رہ رہی تھی وہاں دوسرے تیسرے دن چاقو اور پستول چلتے ہی رہتے تھے۔ دھول بدمعاش نے خود نجمی کو کمانی دار چاقو کھولنا اور اس سے دشمن کے پیٹ میں نیچے سے اوپر وار کرنا اور پستول سے فائر کرنا سکھا دیا تھا تاکہ وقت آنے پر نجمی اپنی یعنی چندا اپنا بچاؤ کر سکے۔ نجمی کو اس ٹریننگ کی ضرورت بھی تھی۔ وہ خود چاقو اور پستول چلانا سیکھنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس میں کافی ماہر ہو گئی تھی کیونکہ ایک نہ ایک دن اسے دھول سمیت ان سب بدمعاشوں سے اپنی عزت کو تار تار کرنے کا انتقام لینا۔

نجمی یہ بھی جانتی تھی کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ شہر میں جہاں بھی جاتی ہے سی آئی ڈی والا اس کے پیچھے لگا ہوتا ہے۔ جس وقت اسے ندیم کی خفیہ کمین گاہ کا سراغ ملا اور اس نے ندیم سے فوراً ملنے کا فیصلہ کیا تو وہ شدید جذباتی ہیجان میں تھی۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ انٹیلی جنس والے اس کا تعاقب کریں گے۔ جب وہ کوٹھی کے گیٹ پر آئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ پولیس کی نگرانی میں ہے۔ واپس اپنے کمرے میں جا کر الماری میں سے چھوٹا جرمن پستول نکال کر اس کے میگزین کو چیک کیا۔ اسے ساڑھی میں چھپایا اور کوٹھی سے نکل کر سڑک پر آ گئی مکھی بائی نے آدھی رات تک سوناگاچی میں دوسری طوائفوں کے ساتھ ڈیوٹی دی تھی اور تماش بینوں سے نوٹ وصول کیے تھے چنانچہ وہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہی تھی۔ نجمی نے رات ہی کو یہ پروگرام بنا لیا تھا کہ وہ منہ اندھیرے ندیم سے ملنے اس کی خفیہ کمین گاہ کی طرف روانہ ہو گی۔ نجمی کلکتے کے چپے چپے سے واقف ہو چکی تھی۔ بنگلہ زبان وہ روانی سے بول لیتی تھی۔ بنگال کی مرطوب ہوا

میں رہتے ہوئے اس کا رنگ جو لاہور میں گورا ہوا کرتا تھا سانولا ہو گیا تھا۔

ٹیکسی منہ اندھیرے جاگتی، بیدار ہوتی فضا میں دریائے ہگلی پر بنے ہوئے ہوڑہ برج کی طرف دوڑی چلی جا رہی تھی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ انٹیلی جنس کا آدمی اس کا تعاقب نہ کرتا۔ یہ ایک ہندو جس کا تعلق جبل پور کی پولیس انٹیلی جنس سے تھا۔ اگرچہ دبلا پتلا پکی عمر کا تھا مگر انتہائی زیرک اور تجربے کار تھا اور جس کے پیچھے لگ جاتا تھا اسے کیفر کردار تک پہنچا کر ہی چھوڑتا تھا۔ اس کی ڈیوٹی آدھی رات کے بعد مکھی بائی کی دریا والی کوٹھی کے باہر شروع ہوتی تھی۔ وہ عام شہریوں کے لباس میں ملبوس کوٹھی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک جگہ جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھا تھا۔ رات کا پچھلا پہر بھی گزر گیا۔ منہ اندھیرے کا سماں ہوا تو اس نے ایک ساڑھی پوش... عورت کو کوٹھی کے گیٹ تک آتے دیکھا۔ سی آئی ڈی والا چوکس ہو گیا اور غور سے کوٹھی کی طرف دیکھنے لگا۔ عورت کو اس نے پہچان لیا۔ یہ چندا طوائف یعنی نجمی تھی جس کی نگرانی پر اسے مامور کیا گیا تھا۔ چندا کو اس نے گیٹ پر آ کر ایک پل کے لیے رکتے اور پھر واپس کوٹھی کے اندر جاتے دیکھا۔ سی آئی ڈی والا نظریں جمائے وہیں بیٹھا رہا۔ چند لمحوں کے بعد چندا یعنی نجمی دوبارہ نمودار ہوئی اور کوٹھی سے نکل کر درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی بڑی سڑک پر آ گئی۔ سی آئی ڈی والا ہندو بھی جھاڑیوں میں سے نکل آیا۔ ایک خاص فاصلہ رکھ کر اس نے نجمی کا تعاقب شروع کر دیا۔ رات کو ایک ٹیکسی سڑک سے ہٹ کر درختوں کے نیچے ہر وقت موجود رہتی تھی۔ یہ ایک طرح سے پولیس ہی کی تحویل میں تھی تاکہ بوقت ضرورت ٹیکسی تلاش نہ کرنی پڑے۔ جب سی آئی ڈی والے ہندو نے چندا یعنی نجمی کو دیکھا کہ وہ سڑک پر آ کر کھڑی ہو گئی ہے اور کسی ٹیکسی وغیرہ کے انتظار میں ہے تو اچانک اس کے دل میں ایک اسکیم کا خیال آیا۔ اس وقت منہ اندھیرے کا وقت تھا اور دن کی روشنی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ سی آئی ڈی والا ہندو جھاڑیوں اور درختوں کے عقب سے تیز تیز چلتا سڑک کے پیچھے ان درختوں میں آ گیا جہاں پولیس کی حاصل کردہ ٹیکسی رات کو ہر وقت موجود رہا کرتی تھی۔ ٹیکسی ڈرائیور پچھلی سیٹ پر گہری نیند سو رہا تھا۔ ہندو سی آئی ڈی والے نے اسے جگایا اور کہا کہ وہ اسی جگہ اس کا انتظار کرے خود ٹیکسی میں بیٹھا اور ٹیکسی کو درختوں میں سے نکال کر سڑک پر لے آیا۔ ڈرائیور نیند میں تھا ٹیکسی سے نکل کر وہیں درخت کے نیچے لیٹ گیا اور گہری نیند میں کھو گیا۔ انٹیلی جنس ہندو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سپاہی سفید کپڑوں میں تھا اور اس نے اپنا آپ وہاں کسی کو نہیں دکھایا تھا۔ نجمی بھی اس کی شکل سے ناواقف تھی۔ سفید پوش سپاہی نے دیکھا کہ نجمی سڑک کے کنارے سیدھی چلی جا رہی تھی۔ اسے اپنے عقب میں گاڑی کی آواز سنائی دی تو رک کر پیچھے دیکھا اور ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے رکنے کا اشارہ کیا۔ انٹیلی جنس والے سپاہی کو یہی چاہیئے تھا۔ نجمی کے قریب جا کر اس نے ٹیکسی روک دی اور یونہی ایک جمائی لے کر بنگلہ میں بولا "میں اڈے پر جا رہا ہوں۔ زیادہ دور نہیں لے جا سکوں گا۔"

نجمی نے اسے ڈرائیور ہی سمجھا اور جلدی سے کہا۔ "میری ماتا جی بہت بیمار ہیں۔ ہوڑہ برج کے پار وہ رہتی ہیں تم مجھے وہاں تک پہنچا دو۔ میں تمھیں سو روپے کرایہ دوں گی۔"

سی آئی ڈی والے نے اداکاری کرتے ہوئے جیسے بادل نخواستہ کہا "بیٹھ جاؤ۔ اب تم نے ماں کی بیماری کا کہہ دیا ہے کیا کروں۔ تمھیں پہنچانا ہی پڑے گا۔"

نجمی ٹیکسی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ جس آدمی کو وہ ٹیکسی ڈرائیور سمجھ رہی ہے اصل میں وہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے۔ ٹیکسی خالی سڑک پر ہوڑہ برج کی طرف دوڑنے لگی۔ یہاں سے ہوڑہ برج زیادہ دور نہیں تھا۔ پہلے پہل دریائے ہگلی پر بنا ہوا ہوڑہ برج کشتیوں سے تیار کیا گیا تھا لیکن بعد میں کشتیوں کے پل کی جگہ لوہے کا ایک بڑا پل بنا دیا گیا تھا۔ سی آئی ڈی والا عام ٹیکسی ڈرائیوروں کی طرح خاموشی سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔ ہوڑہ برج پر پہنچ کر اسے خیال آیا کہ اس سے بڑی سخت غلطی ہو گئی ہے اسے چاہیئے تھا کہ وہ ٹیکسی کے اصلی ڈرائیور کو ہدایت کر آتا کہ وہ پولیس اسٹیشن جا کر خبر کر دے کہ میں دریائے ہگلی والی بڑی سڑک پر چندا کا پیچھا کر رہا ہوں۔ مگر اب وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس ٹیکسی میں وائرلیس کا بھی انتظام نہیں تھا۔ لیکن سی آئی ڈی والا یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ اس پاکستانی جاسوس کے ٹھکانے کا پتہ چلا کر ہی واپس آئے گا جس سے ملنے چندا جا رہی ہے۔ اسے یقین تھا کہ چندا منہ اندھیرے جو اس طرح کوٹھی سے نکلی ہے تو یقینی طور پر پاکستانی جاسوسوں کے گینگ کے کسی جاسوس سے ملنے جا رہی ہے۔ ٹیکسی نے دریائے ہگلی کا ہوڑہ برج پار کیا تو سی آئی ڈی والے نے پیچھے دیکھے بغیر چندا سے پوچھا "اب کدھر چلنا ہے؟"

اسی دوران نجمی بار بار پیچھے دیکھتی رہی تھی۔ اسے بڑی تسلی تھی کہ کوئی سی آئی ڈی والا اس کا تعاقب نہیں کر رہا۔ کوئی گاڑی اس کے عقب میں پیچھا کرتی نہیں آ رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ جس انٹیلی جنس والے سے بچ کر نکلی ہے وہی اس ٹیکسی کو چلا رہا ہے۔ نجمی نے جبار سیٹھ کے آدمی سے ندیم کی کمین گاہ کے راستے کی ایک ایک تفصیل معلوم کر لی تھی۔ یہ معلومات حاصل کرنے کے لیے نجمی کو رشوت دینی پڑی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ٹیکسی ڈرائیور دور تک اس کے ساتھ جائے۔ اس نے سوچ رکھا تھا کہ ٹیکسی کہاں چھوڑ دینی ہو گی۔ اس نے دائیں جانب ایک چھوٹی سڑک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس طرف چلو۔ چمن باڑی کی طرف۔"

سی آئی ڈی والے نے چمن باڑی کو جانے والی سڑک پر گاڑی ڈال دی۔ اب مشرقی آسمان پر طلوع ہوتے سورج کی گلابی روشنی پھیل رہی تھی۔ ٹیکسی بہت جلد کھیت کھلیانوں کو پیچھے چھوڑ کر نسبتاً ویران سے علاقے میں آئی اور کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں پیچھے رہ گئی تھیں۔ سی آئی ڈی والا سوچ رہا تھا کہ چندا ضرور جاسوسوں کے خفیہ اڈے کی طرف جا رہی ہے۔ جب ایک جگہ سڑک کا موڑ آیا تو نجمی نے گاڑی رکوا دی۔ پرس میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو دیا اور جلدی سے دروازہ کھول کر نکلی اور بولی "بس یہاں سے ماتا جی کا مکان قریب ہی ہے۔ تمھارا دھنیباد بھائی۔"

سی آئی ڈی والے نے بناوٹی جمائی لے کر کہا "میری طرف سے ماتا جی کا حال پوچھنا بہن۔"

نجمی سڑک سے اتر کر درختوں میں آ گئی اور ایک طرف تیز تیز چلنے لگی۔ یہاں تاڑ ناریل اور سنبل کے گھنے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ سنبل کے درخت اتنے گھنے تھے کہ ان کے نیچے دھوپ بڑی مشکل سے پہنچ رہی تھی۔ یہاں چاروں طرف گھنی ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ نجمی کو معلوم تھا کہ ان درختوں کے پار ناریلوں کا ایک گنجان باغ آئے گا۔ اس کے بعد وہ پرانا تالاب ہے۔ جس کے کنارے والے پرانے کوارٹر میں ندیم چھپا ہوا ہے۔ ندیم کے قرب میں آ کر نجمی کا دل فرط محبت سے دھڑکنے لگا تھا۔ انٹیلی جنس والا نجمی کا پیچھا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔ اس نے وہاں سے تو ٹیکسی موڑ لی تھی مگر کچھ دور جا کر ٹیکسی کو سڑک کے کنارے ایک جگہ جھاڑیوں کے نیچے کھڑا کیا اور کچھ فاصلہ رکھ کر نجمی کا تعاقب شروع کر دیا۔ نجمی نے ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد لپیٹ لیا تھا۔

اس کے پاؤں میں چبھ رہی تھی۔ وہ جھاڑیوں اور خشک گھاس میں سے گزرتی سنبل اور تاڑ کے درختوں میں سے نکل کر ناریلوں کے گنجان باغ میں آگئی۔ ناریل کے ٹیڑھے میڑھے بے ہنگم درختوں کا ایک سلسلہ تھا جو دور تک چلا گیا تھا۔ زمین پر کئی جگہ ناریل گرے پڑے تھے۔ یہاں سورج کی ترچھی کرنیں پڑ رہی تھیں۔ ندیم کے قریب ہونے کے احساس سے نجمی کے اندر ایک نئی طاقت آگئی تھی۔ اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ انٹیلی جنس والا ہندو برابر نجمی کا تعاقب کرتا پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ وہ درختوں کی آڑ لیتا چلا آ رہا تھا۔ نجمی کو اس نے اپنی نظروں میں رکھا ہوا تھا۔ اس ہندو انٹیلی جنس کے حوالدار کو اس بات کی بہت خوشی ہو رہی تھی کہ آج وہ پاکستانی جاسوسوں کے گینگ کا ٹھکانہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس کارنامے پر محکمے کی طرف سے اسے یقینی طور پر ترقی مل جائے گی۔ آگے قسمت اپنے دامن میں اس کے لیے کیا لیے بیٹھی تھی اس کی اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ ناریلوں کا باغ ختم ہو گیا۔ نجمی کو تالاب کے کنارے جھاڑیوں اور درختوں میں سے کوارٹر کی ڈھلانی چھت نظر آئی تھی اس کا دل خوشی سے تیز تیز دھڑکنے لگا۔ وہ تالاب کے پاس آئی تو اچانک اسے اپنے عقب میں جھاڑیوں کی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی جنگلی جانور اس کی طرف بڑھ رہا ہو۔ نجمی نے ایک دم سے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو ایک آدمی کا چہرہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ نجمی کے جسم میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی۔ ایک پل کے اندر اندر اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار کر دیا کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ اور تعاقب کلکتہ پولیس کی انٹیلی جنس کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اور اس کم بخت نے وہ کوارٹر بھی دیکھ لیا ہے جہاں ندیم چھپا ہوا ہے۔ نجمی یوں بیٹھ گئی جیسے کانٹا چبھ گیا ہو۔ اس نے ایک سیکنڈ کے اندر اندر فیصلہ کر لیا تھا کہ ندیم کی زندگی بچانے کے لیے اب اسے کیا کرنا ہوگا۔

وہ اٹھی اور کوارٹر کی جانب جانے کی بجائے تالاب کی طرف چل دی یہاں کنارے کنارے کانٹے دار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ جب وہ پوری طرح سے ان جھاڑیوں کی اوٹ میں آگئی تو نجمی نے اپنی ساڑھی میں چھپایا ہوا جرمن پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس پستول سے وہ دھومل بدمعاش کی زیر ہدایت کئی فائر نشانے پر لگا چکی تھی۔ نجمی جھاڑیوں میں بیٹھ گئی اور کسی جنگلی چیتے کی طرح بازوؤں اور گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ان جھاڑیوں سے نکل کر دوسری سامنے والی جھاڑیوں کی اوٹ میں جا کر اس طرح سمٹ کر بیٹھ گئی کہ اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ جھاڑیوں کے پیچھے سے سامنے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے یقین تھا کہ سی آئی ڈی والا ادھر سے ضرور گزرے گا اس کی آنکھیں درختوں میں سے ان جھاڑیوں کی طرف آتی پگڈنڈی پر لگی تھیں۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور انگلی ٹریگر پر تھی۔ نجمی سب سے پہلے اس بات کی تسلی کرنا چاہتی تھی کہ جس آدمی کو اس نے اپنے پیچھے دیکھا تھا اور جس نے جلدی سے خود کو درخت کے عقب میں چھپا لیا تھا۔ کیا وہ واقعی انٹیلی جنس کا آدمی ہی ہے اور اس کے تعاقب میں ہی لگا ہوا ہے یا کوئی چور اچکا بدمعاش قسم کا آدمی ہے جو عورت کو جنگل میں اکیلی دیکھ کر اسے اغوا کرنا چاہتا ہے۔ نجمی بڑے غور سے آنکھیں کھولے تالاب کی طرف آتی پگڈنڈی کو تک رہی تھی۔ اچانک اسے ایک آدمی جھکا جھکا درختوں کی اوٹ سے نکل کر تالاب کی طرف بڑھتا نظر آیا۔ نجمی کو ایسے لگا جیسے اس آدمی کو اس نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ جب وہ چند قدم مزید آگے آیا تو نجمی کا سارا بدن خوف سے ایک لمحے کے لیے سرد ہو گیا۔ یہ وہی ٹیکسی ڈرائیور تھا جو اسے لے کر اس جنگل تک آیا تھا۔ تو کیا یہ انٹیلی جنس کا آدمی تھا؟ اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ نجمی نے سوچا۔ اگر وہ نجمی کو محض اغوا کرنے کی خاطر اس کے پیچھے لگا ہوتا تو وہ اب تک اسے بڑی آسانی سے اغوا کر چکا ہوتا۔ نجمی کو اس آدمی کے ہاتھ میں اب ریوالور بھی دکھائی دیا۔ نجمی کا جسم جو ایک لمحے پہلے خوف سے سرد ہو گیا تھا اب انتقام کی آگ میں بھڑک اٹھا۔ یہ آدمی ندیم کی کمین گاہ کا سراغ لگانے کے لیے اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جنھوں نے نجمی اور ندیم کو اپنی بربریت کا نشانہ بنایا تھا اور اب وہ ندیم کو گرفتار کر کے پھانسی کے تختے تک لے جانا چاہتا تھا۔ نجمی کا پستول والا ہاتھ اوپر اٹھا اور نالی جھاڑیوں میں سے ذرا سی باہر نکل آئی۔ انٹیلی جنس کا ہندو حوالدار پھونک پھونک کر قدم رکھتا۔ جھکے جھکے جھاڑیوں کے قریب آ گیا تھا اس کی نظریں جھاڑیوں کی بجائے کوارٹر کی طرف تھیں۔ اس کے خیال میں چندا یعنی نجمی اسی کوارٹر کے اندر گئی تھی۔ وہ کوارٹر کی طرف آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔

جونہی وہ نجمی کے قریب سے گزرنے لگا نجمی نے اس کی چھاتی کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔ دھماکے کی آواز سے جنگل گونج اٹھا۔ درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندے پھڑ پھڑا کر اڑ گئے۔ گولی پستول میں سے نکل کر سی آئی ڈی کے ہندو حوالدار کی چھاتی کی بجائے اس کی گردن میں لگی تھی اور

ہنسلی کی ہڈی کو توڑتی ہوئی دوسری طرف سے نکل گئی تھی۔ اس آدمی کو جوابی فائر کرنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ اگر نجمی کا نشانہ ٹھیک رہتا اور گولی اس شخص کے سینے میں لگتی تو بہت ممکن تھا کہ وہ جھاڑیوں میں ریوالور سے جوابی فائر داغ دیتا۔ لیکن نجمی کی خوش قسمتی تھی کہ اس کا نشانہ چوک گیا تھا اور گولی دشمن کی گردن میں گھس کر اس کی ہنسلی کی ہڈی کو توڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ وہ شخص منہ کے بل گرا اور وہیں ٹھنڈا ہو گیا۔ گولی کی آواز سن کر ندیم کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ نجمی نے جھک کر سی آئی ڈی کے ہندو حوالدار کی لاش کو دیکھا۔ یہ نجمی کا پہلا قتل تھا۔ اسے یہ محسوس کر کے سخت تعجب ہوا کہ اس قتل کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس پر کسی قسم کا خوف یا دہشت طاری نہیں ہوئی تھی۔ قتل کی بڑی دہشت ہوتی ہے اور قاتل پر قتل کے فوراً بعد ایک ہیجان خیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ لیکن نجمی کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہندو بھی ان وحشی درندوں میں سے ایک تھا جو اس کی حیا باختگی کا باعث تھے۔ بلکہ الٹا نجمی کو تسکین سی ہو رہی تھی کہ اس نے اپنے پہلے دشمن سے بدلہ لے لیا ہے۔ وہ لاش پر سے ہٹ گئی۔ اس نے جھاڑیوں سے نکل کر کوارٹر کی طرف دیکھا۔ ندیم گھبراہٹ کے عالم میں جھاڑیوں کی طرف چلا آ رہا تھا۔ کیونکہ پستول کے فائر کی آواز اسی طرف سے آئی تھی۔ اپنے سامنے پستول ہاتھ میں لیے نجمی کو دیکھ کر وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ نجمی دوڑ کر اس کی طرف آئی اور لاش کی طرف اشارہ کر کے بولی: "یہ میرا تعاقب کر رہا تھا۔ یہ تمھیں پکڑوانے آیا تھا۔"

ندیم نے نجمی کو اپنے ساتھ لگا لیا پھر جلدی سے اسے کوارٹر کے اندر لے گیا۔ نجمی کا دل ندیم کو اس کے جسم میں جگہ جگہ دھڑکتا محسوس ہو رہا تھا۔ ندیم نے نجمی کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے تسلّی دی اور کہا: "جو ہونا تھا وہ ہو گیا مگر یہ کون تھا اور تم یہاں کیسے آ گئیں؟"

نجمی نے ندیم کو شروع سے لے کر آخر تک ساری کہانی کھول کر بیان کر دی۔ ندیم اٹھ کھڑا ہوا کہنے لگا: "تم نے جو کچھ کیا ہے تمھیں یہی کرنا چاہیے تھا۔ اب ہمیں اس شخص کی لاش اور پیچھے سڑک پہ کھڑی گاڑی دونوں کو ٹھکانے لگانا ہو گا۔ جبار سیٹھ ایک گھنٹے بعد یہاں جیپ لے کر آ جائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے اس قتل کا علم ہو۔"

"یہ جبار سیٹھ کون ہے ندیم؟" نجمی نے پوچھا۔ ندیم نے بھی اپنے فرار کی ساری داستان بیان کر

دی۔ نجمی نے پستول اپنی ساڑھی میں چھپا لیا تھا۔ کہنے لگی: "ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ لاش کو ٹیکسی میں ڈال کر کسی ٹیلے سے نیچے گرا دیا جائے گاڑی لاش سمیت جل کر راکھ ہو جائے گی۔ مگر ٹیکسی یہاں سے کافی دور سڑک پہ کھڑی ہے۔"

ندیم بولا: "خواہ کچھ بھی ہو۔ ہمیں لاش کو اٹھا کر گاڑی تک لے جانا ہو گا۔ یہ کام میں خود کروں گا۔ تم یہیں بیٹھی رہو۔"

پھر ندیم نے نجمی سے وہ جگہ پوری تفصیل سے دریافت کی جہاں ٹیکسی واپس کر کے یہ ہندو سی آئی ڈی والا بظاہر شہر کی طرف روانہ ہوا تھا۔ یقینی بات تھی کہ اس نے وہاں سے قریب ہی کسی جگہ گاڑی کھڑی کی ہو گی۔ ندیم نے لاش کو قریب سے دیکھا اس کی گردن پہ خون کے لوتھڑے جمے ہوئے تھے۔ گھاس پہ جہاں گردن پڑی تھی خون گول دائرے کی شکل میں جم گیا تھا اور مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ندیم نے لاش کی گردن پر مٹی ڈال کر جھاڑیوں کی ٹہنیاں باندھیں زمین پہ جہاں خون بکھرا ہوا تھا مٹی ڈال کر ایک ڈھیری سی بنا دی۔ لاش دبلی پتلی تھی۔ ریوالور ابھی تک لاش کے ہاتھ میں تھا۔ ندیم نے رومال سے پکڑ کر ریوالور لاش کی جیب میں ڈال دیا۔ ایسا ندیم نے اس لیے کیا تھا کہ اگر بدقسمتی سے کھڈ میں کار گرنے کے بعد نذرِ آتش نہ ہوئی تو ریوالور پہ اس کی انگلیوں کے نشان باقی نہ رہ جائیں لاش کے کپڑوں پہ ندیم کی انگلیوں کے نشانات ملنے کے امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ جنگل میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پرندے دوبارہ درختوں کی ٹہنیوں پر آ کر بیٹھ گئے تھے۔ ندیم نے ایک بار پھر کوارٹر میں آ کر نجمی کو کمرے کے اندر ہی بیٹھے رہنے کی تلقین کی۔ دروازہ بند کر کے باہر سے کنڈی لگائی لاش کو اٹھا کر کاندھے پہ ڈالا اور ٹیکسی کی طرف چل پڑا۔ شروع میں تو لاش ہلکی پھلکی لگی مگر ناریلوں کے باغ سے نکلتے نکلتے ندیم پسینے میں شرابور ہو گیا اور اس کی ٹانگیں تھک گئیں۔ ایک جگہ لاش کو زمین پہ رکھ کر ندیم تھوڑا سستایا اور دوبارہ لاش کو کاندھے پر ڈال کر سنبل اور تاڑ کے درختوں والے سلسلے میں داخل ہو گیا۔ اسے بس ایک ہی خطرہ تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ مگر ابھی تک کوئی کسان یا راہ گیر اس کی راہ میں نہیں آیا تھا۔ ندیم درختوں کے عقب میں ہو کر چل رہا تھا۔ چند قدم چل کر وہ رک جاتا لاش کو زمین پر ڈال دیتا چاروں طرف کا جائزہ لیتا اور لاش اٹھا کر دوبارہ روانہ ہو جاتا۔ ایک جگہ گھاس پر وہ لاش کو کافی دور

تک ٹانگوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا بھی لے گیا۔ آخر وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں سے اسے شہر کی طرف جاتی کچی سڑک نظر آنے لگی۔ ندیم نے لاش کو وہیں درختوں میں ڈالا اور خود سڑک پر آ گیا۔ چند قدم پیچھے اسے ایک جگہ سڑک سے اتر کر ٹیکسی کھڑی دکھائی دی۔

ٹیکسی خالی تھی۔ یہ کچی سڑک ایک جنگل کے کنارے پر واقع تھی اور عام گزرگاہ نہیں تھی لیکن یہاں پر دن نکلنے کے بعد وہ مزدور نظر آجاتے تھے جو آگے جنگل میں جا کر لکڑیوں کی کٹائی کرتے تھے۔ مگر ندیم کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں سے کوئی مزدور ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ ندیم ٹیکسی اسٹارٹ کر کے اسے آگے لے آیا۔ پھر بھاگ کر درختوں میں گیا۔ لاش جھاڑیوں میں پڑی تھی اسے اٹھا کر ٹیکسی کی پچھلی نشستوں پر رکھ کر اوپر جھاڑیاں وغیرہ توڑ کر رکھ دیں اور ٹیکسی کو اسٹارٹ کر کے ندیم آگے لے گیا یہ جگہ سطح مرتفع قسم کی تھی مگر کوئی اونچا ٹیلا کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی گہری کھڈ بھی وہاں پر موجود نہ تھی۔ ندیم نے گاڑی کچی سڑک سے اتار کر درختوں کے نیچے کھڑی کر دی۔ ادھر اُدھر سے خشک لکڑیاں ٹہنیاں گھاس پھوس جمع کر کے گاڑی کے انجن اور پٹرول والی ٹینکی کے نیچے ڈھیر لگا دیا اور پھر جیب سے ماچس نکال کر جلائی اور گھاس پھونس کو آگ لگا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹیکسی نے آگ پکڑ لی۔ ندیم دوڑ کر جنگل کے درختوں کے نیچے چلا گیا۔ اب وہ دھماکے کا انتظار کر رہا تھا جس نے ٹیکسی کو شعلوں میں تبدیل کر کے لاش کی ہڈیوں کو بھی جلا کر راکھ بنا دینا تھا۔ آگ جب پٹرول کی ٹینکی تک پہنچی تو ایک زوردار دھماکہ ہوا اور گاڑی کو زرد، سرخ اور نیلے شعلوں نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ہی ندیم اپنے کوارٹر کی طرف دوڑ پڑا۔

نجمی کوارٹر میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ ندیم اندر آیا تو اس نے کہا میں نے دھماکے کی آواز سن لی تھی۔ گاڑی کو پوری طرح آگ لگ گئی تھی نا۔" ندیم نے دروازہ بند کر دیا۔ اور چارپائی پر بیٹھتے ہوئے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا "ساری گاڑی آگ کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔"

نجمی اس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گئی اس نے ندیم کے ہاتھ کو پکڑ کر چوما پھر اپنی آنکھوں سے لگایا اور پھوٹ کر رونے لگی۔ ندیم نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے۔ وہ کہاں سے کہاں آ پہنچے تھے۔ اک ذرا سی ناسمجھی اور لغزش نے انھیں

کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے ہزاروں میل دور تھے۔ اس نے اپنی قمیض کے دامن سے نجمی کے آنسو پونچھے اور کہا "جبار میمھ سے میں نے ساری بات کر لی ہے تم میرے ساتھ چلو گی۔ وہ ہم دونوں کو مشرقی پاکستان پہنچا دے گا۔ بس کچھ دنوں کی بات ہے۔ بارڈر پر ان دنوں سیکورٹی سخت ہے حالات ٹھیک ہوتے ہی وہ ہمیں بارڈر کراس کرا دے گا۔ مشرقی پاکستان ہمارا پاکستان ہے ہم وہاں سے لاہور جا کر شادی کر لیں گے۔" نجمی نے ندیم کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا اس کی آنکھوں سے جیسے شعلے اور چنگاریاں سی نکلنے لگی تھیں۔ اس نے گہرا سانس لیا اور بولی۔

"ندیم! میں ان لوگوں سے ظلم کا بدلہ لیے بغیر یہاں سے واپس نہیں جا سکتی جنھوں نے میری زندگی کو برباد کیا ہے جنھوں نے میرے گوہر عصمت کو خاک و خون میں ملایا ہے جن کے ظلم و ستم کی وجہ سے آج میں اس حال تک پہنچی ہوں۔"

ندیم اس کا منہ تکنے لگا اسے یقین نہیں تھا کہ نجمی ایسی بات بھی کرے گی اس نے نجمی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا "نجمی! پھر تو سب سے پہلے تمھیں مجھ سے انتقام لینا چاہیے۔ مجھ سے بدلہ لینا چاہیے کیونکہ تمھاری بربادی کی اصل وجہ میں ہوں۔" نجمی نے ندیم کی طرف آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا اور بولی۔

"نہیں ندیم! جب میں تمھارے کہنے پر اپنے لاہور والے گھر سے نکل کر ریلوے اسٹیشن کی طرف چلی تھی تو اس میں میرا اپنا ارادہ بھی شامل تھا تم نے مجھے ورغلایا نہیں اور پھر میں تم سے شادی کرنے گھر سے نکلی تھی میری غلطی صرف اتنی تھی کہ جو کام مجھے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی رضامندی سے کرنا چاہیے تھا اسے میں نے خود انجام دینے کی کوشش کی تھی اور میں گھر سے بھاگ گئی جو کسی صورت میں کسی بھی لڑکی کو نہیں کرنا چاہیے لیکن یہاں میں جن لوگوں سے انتقام لینا چاہتی ہوں انھوں نے مجھے بے بس کر کے میرے ساتھ بربریت کا سلوک کیا ہے۔ مجھے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا ہے میرے سینے میں انتقام کا لاوا دہک رہا ہے۔ جب تک میں ان تمام لوگوں سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم و تشدد کا بدلہ نہیں لے لوں گی مجھے مرنے کے بعد بھی چین نصیب نہیں ہوگا۔"

ندیم کے لیے یہ ایک نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی اس نے نجمی کو بہت سمجھانے کی کوشش کی لیکن نجمی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ اس نے آخری بار بھی یہی کہا کہ میں جب تک اپنی عزت برباد کرنے والوں کی

لاشیں اپنے سامنے خاک و خون میں تڑپتی نہ دیکھ لوں گی یہ ملک چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔ ندیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر جنگل میں دور سے جیپ کی آواز سنائی دی۔ وہ چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور بولا ”جبار سیٹھ آ رہا ہے۔ تم پچھلے دروازے سے نکل کر درختوں میں کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ اسے تمھارا پتہ چلے وہ زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہرے گا جلدی کرو۔“

نجمی کمرے کے پچھلے دروازے سے گزر کر کچن اور باتھ روم کے درمیان سے ہوتی سنبل اور تاڑ کے اونچے اونچے درختوں میں آ گئی یہاں خود رَو جھاڑ جھنکاڑ کی بھرمار تھی۔ جھاڑیاں قدآدم تھیں نجمی کو بھی ان جنگلوں کا کافی تجربہ ہو چکا تھا وہ ایک جگہ چھپ کر بیٹھ گئی پستول ابھی تک اس نے ساڑھی میں ہی چھپا رکھا تھا اسے جیپ کے کھڑے ہونے اور پھر انجن بند ہونے کی آواز آئی۔ ندیم دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ جبار سیٹھ کل کی طرح کھانا اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس اپنے ساتھ لایا تھا۔ ندیم نے آگے بڑھ کر تھیلا اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ جبار سیٹھ نے سلک کی قمیض اور کالی کنی والی بنگالی دھوتی باندھ رکھی تھی کریون اے کی ڈبی اور سنہرا لائٹر اس کے ہاتھ میں تھا۔ گلے میں سونے کی زنجیریں تھیں اور وہ پان چبا رہا تھا اس نے اردگرد ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور پوچھا ”کوئی یہاں آیا تو نہیں؟“ ندیم نے کوارٹر کے اکیلے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

”یہاں کون آ سکتا ہے سیٹھ بھائی بس میں ہی یہاں اکیلا بیٹھا ہوں اور جانے ابھی کب تک یہاں بیٹھنا ہو گا۔“

ندیم نے نجمی کے جانے کے بعد اچھی طرح سے کمرے کا جائزہ لے لیا تھا کہ اس کی کوئی نشانی وہاں نہ رہ گئی ہو۔ نشانی کیا ہو سکتی تھی۔ نجمی تو سوائے بھرے ہوئے پستول کے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لائی تھی۔ اس نے تو خوشبو بھی نہیں لگا رکھی تھی جس کا ہلکا سا اثر کمرے کی فضا میں باقی رہ جاتا۔ ندیم سوچنے لگا نجمی کس قدر بدل چکی ہے۔ سیٹھ جبار کرسی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کا گل جھاڑ کر بولا۔

”آج میں تمھارے لیے دو طرح کی مچھلی بنوا کر لایا ہوں“ ٹھہرو میں کچن سے کل کے برتن اٹھا کر گاڑی میں رکھ دوں۔ ندیم نہیں چاہتا تھا کہ جبار سیٹھ کچن کی طرف جائے وہ جلدی سے اٹھا اور

بولا ”آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں میں برتن رکھے دیتا ہوں“ اور اس سے پہلے کہ جبار سیٹھ کچھ کہتا ندیم تیزی سے دروازہ کھول کر پیچھے کچن میں گیا وہاں تھیلے میں کل کے برتن اس نے باندھ کر رکھے ہوئے تھے۔ تھیلا اٹھا کر بوسیدہ چھت والے کچن سے نکلا تو اس کی نظر اپنے آپ درختوں کی طرف اٹھ گئی۔ درختوں اور جھاڑیوں میں کسی جگہ نجمی چھپی ہوئی تھی ندیم نے برتن لے جا کر جیپ میں رکھ دیئے اور تیز تیز قدم اٹھاتا جبار سیٹھ کے پاس آ گیا۔ ندیم نے ناشتہ کیا اور پھر تھرمس میں سے چائے گلاسوں میں ڈال کر پینے لگے۔ آج ندیم یہی چاہتا تھا کہ جبار سیٹھ وہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرے۔ جبار سیٹھ چائے پیتے ہوئے کہہ رہا تھا ”رات میں نے کالیے سے بات کی تھی۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ آج کل بارڈر پر بڑی سختی ہے ہمیں کچھ روز انتظار کرنا ہو گا اور وہاں میں نے تمھاری معشوق تک اپنے خاص آدمی کے ہاتھ یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ تم جیل سے فرار ہونے کے بعد خیریت سے ہو اور کلکتہ سے سو میل دور کسی خفیہ جگہ پر محفوظ ہو اس سے زیادہ تمھاری عورت کو کچھ نہیں بتایا گیا۔

ندیم نے دل میں سوچا اسے کیا معلوم کہ جس عورت کی وہ بات کر رہا ہے وہ عین اس وقت اسی کوارٹر کے پیچھے درختوں میں چھپ کر بیٹھی ہوئی ہے اس نے جبار سیٹھ کا شکریہ ادا کیا اور بولا ”سیٹھ صاحب میں یہی چاہتا ہوں کہ بارڈر کراس کرتے وقت اپنی ہونے والی بیوی کو بھی ساتھ ہی مشرقی پاکستان لیتا جاؤں وہاں جا کر میں اس سے شادی کر لوں گا۔“

جبار سیٹھ نے کہا ”یہ تو بڑا نیک ارادہ ہے چندا کی تو زندگی سنور جائے گی میں اس کام میں تمھارا پورا پورا ساتھ دوں گا بس کچھ روز تمھیں یہاں تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ستمبر کی جنگ کے بعد سرحدوں کی حالت پہلے جیسی نہیں رہی۔ بھارت کو اس جنگ میں بہت ہزیمت اٹھانی پڑی ہے اس لیے بارڈر پر سیکورٹی سخت کر دی گئی ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو کالیا بڑا تجربہ کار اور بااثر آدمی ہے۔ ذرا حالات ٹھیک ہوئے تو چٹکی میں تم دونوں کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ میں تمھاری چندا کو بھی کسی نہ کسی طریقے سے بارڈر پر پہنچا دوں گا بشرطیکہ وہ تیار ہو گئی تو۔“

ندیم نے اپنے گلاس میں تھرمس سے چائے ڈالتے ہوئے کہا ”وہ میرے ساتھ جانے پر ضرور راضی ہو جائے گی اس سے بڑھ کر اس کے لیے اور کیا بات ہو سکتی ہے۔“

مگر ندیم کے چہرے پر جو تاثرات اس وقت تھے وہ اس کے جملے کی تردید کر رہے تھے کیونکہ نجمی اپنے دشمنوں کی لاشیں خاک و خون میں تڑپائے بغیر اس کے ساتھ جانے پر راضی نہیں ہوئی تھی۔ ندیم بڑا حیران تھا کہ نجمی یہ کس طرف چل پڑی ہے۔ وہ ایسا کس لیے سوچتی ہے؟ شاید ندیم کو اس حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ عورت کے لیے اس کا گوہر آبرو کس قدر انمول اور نازک ہوتا ہے اور وہ اس گوہر بے مثل کے لیے اپنی جان تک کیوں قربان کر ڈالتی ہے۔ جبار سیٹھ نے دوسرا سگریٹ لائٹر سے جلاتے ہوئے ایک گہرا کش لگایا اور کہنے لگا "رات کو یہاں جنگل میں جانوروں کی آوازیں ضرور آتی ہوں گی۔ میں آج تمہارے لیے ایک کمانی دار چاقو لیتا آیا ہوں" اور جبار سیٹھ نے جیب میں سے کمانی دار چاقو نکال کر اسے کھولا تو اس میں سے کڑ کڑ کی آواز آئی۔ "اگر کوئی خطرناک جانور ادھر آجائے تو تم اس سے اپنی حفاظت کر سکو گے۔ خبردار رات کو باہر آگ کا الاؤ روشن مت کرنا" پھر جبار سیٹھ کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا "یہ چاقو تم اپنے پاس رکھو اور یہیں بیٹھو میں باہر جا کر جائزہ لیتا ہوں۔ ویسے اس علاقے میں کبھی کوئی نہیں آتا۔ یہ کوارٹر میں نے اپنے مال گودام کے لیے خرید رکھا ہے۔"

جبار سیٹھ اٹھ کر باہر نکل گیا ندیم گھبرایا کہیں جبار سیٹھ نجمی کو نہ دیکھ لے۔ وہ یہ کہتا ہوا باہر آگیا کہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ علاقہ بالکل سنسان ہے مگر جبار سیٹھ اتنی دیر میں سنبل کے درختوں کی طرف جا چکا تھا۔ ندیم بھی دوڑ کر اس کے پاس آگیا۔ جبار سیٹھ کا یہ سارا علاقہ دیکھا بھالا تھا پھر بھی وہ ایک ایک جھاڑی کو دیکھتا جا رہا تھا۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ نجمی کس جگہ چھپی ہوئی ہے پھر بھی اُسے یقین تھا کہ نجمی جہاں کہیں بھی ہے ان کی آوازیں بھی سن رہی ہو گی اور شاید انھیں دیکھ بھی رہی ہو وہ ضرور ان کی نظروں سے اوجھل رہنے کی کوشش کرے گی۔ نجمی کوارٹر کے عقبی درختوں کے پیچھے ایک جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھی تھی کہ اس نے ندیم اور سیٹھ جبار کو جنگل میں آتے دیکھا وہ باتیں بھی کر رہے تھے۔ نجمی جلدی سے رینگتی ہوئی دوسری طرف جھاڑیوں کے پیچھے چلی گئی۔ ندیم پریشان تھا کہ کہیں اچانک کسی جھاڑی کے پیچھے نجمی نظر نہ آجائے۔ وہ بار بار سیٹھ جبار کو واپس کوارٹر میں چلنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ جبار سیٹھ رک گیا ندیم کی طرف گھور کر دیکھا اور بولا "تم مجھے کچھ گھبرائے ہوئے سے لگتے ہو کیا بات ہے؟" ندیم نے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا "گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں سیٹھ صاحب آپ کے ہوتے ہوئے مجھے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو صرف اس لیے کہہ رہا تھا کہ کہیں ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔" سیٹھ جبار آگے بڑھتے ہوئے بولا "اسی لیے میں نے تمھیں کوارٹر میں رہنے کے لیے کہا تھا مجھے کوئی دیکھ بھی لے گا تو کوئی فرق نہیں پڑے گا" درختوں اور خود رو جھاڑیوں میں کچھ دیر گھومنے کے بعد جبار سیٹھ واپس ہو گیا کوارٹر میں جانے کی بجائے وہ اپنی جیپ کی طرف آیا اور بولا۔ "میں جاتا ہوں کل اسی وقت تمھارے لیے کھانا لے کر آؤں گا میرا خیال ہے تمھیں زیادہ سے زیادہ تین چار دن ہی یہاں رہنا پڑے گا کالیا تمھارے بارڈر کراس کروانے کا کوئی خاص بندوبست کر رہا ہے۔"

جبار سیٹھ جیپ میں بیٹھ گیا انجن اسٹارٹ کیا اور جیپ کو درختوں میں سے نکال کر غیر ہموار زمین پر ناریل کے درختوں کی طرف چل دیا۔ جب جیپ ندیم کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ بھاگ کر کوارٹر کے پیچھے آیا اس نے آہستہ سے نجمی کو آواز دی۔ نجمی جھاڑیوں میں سے نکل آئی۔ قریب آکر بولی "یہ ہے تمھارا سیٹھ؟ یہ تو میرا گانا سننے کبھی کبھی آیا کرتا ہے۔"

ندیم کو اس جملے سے بڑا دکھ ہوا اس کی قسمت میں یہ جملہ سننا بھی لکھا تھا کہ نجمی اسے یہ بتائے کہ فلاں سیٹھ اس کا گانا سننے آتا ہے وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ کوارٹر میں آکر اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا اور ایک بار پھر نجمی کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان چلی جائے کیونکہ سیٹھ جبار نے بھی وعدہ کر لیا ہے کہ اس کا آدمی ان دونوں کو بارڈر کراس کرا دے گا۔ نجمی نے ساڑھی میں چھپا ہوا چھوٹا پستول نکال کر میز پر رکھ دیا اور اس پر اپنے ہاتھ جما کر بولی "اس پستول سے میں ایک آدمی کا خون کر چکی ہوں یہ خون میں نے تمھاری زندگی بچانے کے لیے کیا ہے۔ اب مجھے کچھ خون اپنی زندگی کی تباہیوں کا بدلہ لینے کے لیے کرنے ہیں اور جب تک میں ان لوگوں کو خاک و خون میں نہلا نہیں دوں گی میں بھارت کی سرحد عبور نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" اور اس کے ساتھ ہی نجمی نے پستول اٹھایا اور اسے واپس اپنی ساڑھی میں چھپا لیا۔ ندیم خاموش ہو گیا وہ سمجھ گیا تھا کہ نجمی کو مزید سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں اس وقت ندیم کو نجمی ایک خونخوار وحشی ڈاکو لگ رہی تھی جو اپنے دشمنوں کا خون پینے کے لیے بے چین ہو

نجمی اٹھی اور کہنے لگی "اب میں جاتی ہوں کل آدھی رات کے بعد تم سے ملنے پھر آؤں گی۔" ندیم نے جلدی سے کہا "نجمی یہ غلطی مت کرنا ابھی تم اپنی جگہ پر ہی رہو۔ ہم انٹیلی جنس کے آدمی کا خون کر چکے ہیں۔ پولیس چوکس ہو گئی ہو گی۔ تمھیں اس وقت بھی بڑی ہوشیاری سے واپس جانا ہو گا۔" نجمی نے مسکرا کر ندیم کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ میں آہنی عزم کی جھلک نمایاں تھی کہنے لگی۔

"میں گناہ کی تاریک غاروں میں سے گزر کر یہاں تک پہنچی ہوں ندیم میں تو ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے ہاتھ میں اپنی جان لیے پھر رہی ہوں۔ تم فکر نہ کرو جب تک میں اپنے دشمنوں کو موت کے گھاٹ نہیں اتار لیتی خود نہیں مروں گی۔"

- - ٭ - -

نجمی نے ندیم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کہا۔

"میں کل آدھی رات کے بعد آنے کی پوری کوشش کروں گی۔ لیکن کیا تم میرے بغیر پاکستان چلے جاؤ گے۔"

ندیم نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

"میں تمھارے بغیر پاکستان کیسے جا سکتا ہوں نجمی میں تو آیا ہی تمھیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تھا۔"

پھر ندیم نے بڑی محبت سے نجمی کے ہاتھ کو چوم لیا اور کہا "میری بات مانو نجمی۔ جو تم سوچ رہی ہو اس میں کیا ہو گا؟ اس کا نتیجہ بڑا بھیانک بھی نکل سکتا ہے۔ تم اس پوزیشن میں نہیں ہو کہ ان سب لوگوں سے اپنی بربادیوں کا بدلہ لے سکو۔ تمھاری ساری زندگی پڑی ہے۔ میرے ساتھ واپس پاکستان چلی چلو۔ ہم وہاں جاتے ہی شادی کر لیں گے۔"

نجمی دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ فوراً پیچھے کھینچ لیا اور ندیم کی طرف دیکھ کر بولی "میرے دل کے زخموں کو تم نہیں سمجھ سکو گے ندیم میرے جسم کے ٹکڑوں کو جگہ جگہ کاٹ کر پھینکا گیا ہے مجھے بار بار قتل کیا گیا ہے۔ میرے اندر لاوا کھول رہا ہے تم پاکستان چلے جاؤ۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

یہ کہہ کر نجمی باہر نکل گئی۔ ندیم جیسے بے بسی کے عالم میں دروازے میں کھڑا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

نجمی ساڑھی کا پلو اپنی کمر کے گرد باندھے تیز تیز قدموں سے درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ نجمی کا انگ انگ جیسے انگاروں پر لوٹ رہا تھا۔ اس نے وہ

جگہ دیکھی جہاں اس نے اپنی زندگی کا پہلا قتل کیا تھا جہاں ہندو حوالدار کا خون گرا تھا وہاں ندیم نے مٹی کی ڈھیری بنا دی تھی مگر مکھیاں اب بھی اس ڈھیری پر بھنبھنا رہی تھیں۔ نجمی نے ٹھوکر مار کر ڈھیری منتشر کر دی اور ناریلوں کے باغ کی طرف نکل گئی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ انٹیلی جنس کے جس حوالدار کو اس نے قتل کر دیا ہے۔ اس کی جگہ لینے دن کے نو ساڑھے نو بجے دوسرا آدمی آئے گا۔ نجمی اس سے پہلے اپنے دریا والے بنگلے میں پہنچ جانا چاہتی تھی وہ جتنی تیز چل سکتی تھی چلتے ہوئے پکی سڑک پر آ گئی یہاں ٹیکسی کے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہ علاقہ شہر سے باہر جنگل کے ذخیروں کے قریب کا علاقہ تھا۔ نجمی سڑک کے کنارے چلتی چلی گئی۔ جب اسے دور سے ہگلی پار کے کارخانوں کی چمنیاں نظر آنے لگیں تو اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اسے پسینہ آ رہا تھا پستول ابھی تک اس کی ساڑھی میں چھپا ہوا تھا۔ آگے ایک چوراہا آ گیا۔ یہاں ٹریفک چل رہی تھی۔ خوش قسمتی سے اسے ایک خالی ٹیکسی مل گئی جس میں بیٹھ کر وہ اپنے پرانے بنگلے کے قریب دریائے ہگلی کی جانب آ گئی یہاں اس نے ٹیکسی چھوڑ دی اور دریا پر آ کر ادھر ادھر دیکھا دور کچھ ماہی گیر دریا میں کشتی اتار رہے تھے۔ نجمی نے یہاں دریا میں غسل کیا۔ سر دھویا اور پھر گیلے بالوں کو نچوڑتی لکھی بائی کے پرانے بنگلے کی طرف چل پڑی۔ بنگلہ چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا۔ نجمی نے اس مقصد کے لیے دریا میں غسل کیا تھا کہ وہ لکھی بائی سے یہ کہہ سکے کہ وہ صبح اٹھ کر دریا پر نہانے چلی گئی تھی اور اگر کوئی سی آئی ڈی والا اسے دیکھ بھی رہا ہو تو یہی سمجھے کہ چندا دریا پر نہانے چلی گئی تھی مگر وہاں مقتول سی آئی ڈی والے کی جگہ لینے ابھی دوسرا آدمی نہیں آیا تھا۔ بنگلے میں نجمی پہنچی تو لکھی بائی ابھی تک سو رہی تھی۔ نوکرانی سے نجمی چائے لانے کا کہتے ہوئے اپنے کمرے میں آ گئی اس سے کوئی دس پندرہ منٹ بعد تھانے سے انٹیلی جنس کا دوسرا آدمی مقتول حوالدار کی جگہ لینے ایک سادھو کے بھیس میں وہاں پہنچ گیا اسے اپنا ساتھی دکھائی نہ دیا تو اس کی تیز نگاہیں اردگرد کا جائزہ لینے لگیں۔ پھر یہ سی آئی ڈی والا سادھو کے بھیس میں سڑک پر اس مقام پر آ گیا جہاں انھوں نے کرائے کی ٹیکسی رات بھر کے لیے رکھی ہوئی تھی ٹیکسی وہاں موجود نہیں تھی۔ مگر اس کا ڈرائیور پریشانی کے عالم میں درختوں کے نیچے کھڑا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور انٹیلی جنس کے سارے سپاہیوں کو جانتا تھا۔ سادھو کے بھیس میں سی آئی ڈی والے نے ٹیکسی ڈرائیور سے

اس کی ٹیکسی اور اپنے ساتھی کے بارے میں پوچھا تو ڈرائیور نے کہا۔

”سر! منہ اندھیرے حوالدار صاحب میری ٹیکسی لے کر چلے گئے تھے۔ اور مجھے یہاں اتار گئے تھے۔“

سادھو اسی وقت تھانے پہنچ گیا۔ مقتول حوالدار کی تلاش شروع ہو گئی۔ مگر وہ کہاں مل سکتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر نے ٹیکسی ڈرائیور کو بلا کر اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی کہ حوالدار کے ساتھ دوسرا کوئی آدمی تو نہیں تھا؟ کیا وہ کسی عورت کے تعاقب میں گیا تھا؟ کیا آگے بھی کوئی ٹیکسی جا رہی تھی؟ ٹیکسی ڈرائیور نے یہی کہا کہ وہ نیند میں تھا۔ حوالدار صاحب نے اسے ٹیکسی سے باہر نکلنے اور اسی جگہ رہنے کی ہدایت کی اور خود ٹیکسی لے کر چلے گئے۔ عجیب معمہ بن گیا تھا۔ جسے انسپکٹر منجریکر بھی حل نہیں کر پا رہا تھا۔ اس کے حکم سے لکھی بائی کی دریائے ہگلی والی کوٹھی اور سوناگاچی والے کوٹھے کی نگرانی سخت کر دی گئی۔ سی آئی ڈی کے آدمیوں کی نفری میں بھی اضافہ کر دیا گیا۔ اس دوران مقتول حوالدار کی تلاش برابر جاری رہی لیکن اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا جس روز مقتول حوالدار گم ہوا تھا اسی شام کو انسپکٹر منجریکر لکھی بائی کے پرانے بنگلے پر آیا۔ وہ سفید کپڑوں میں تھا اور یہ معلوم کرنے آیا تھا کہ اس روز چندا گھر سے نکل کر تو نہیں گئی تھی؟ لکھی بائی نے انسپکٹر منجریکر کے لیے چائے اور پان منگوایا۔ نجمی اپنے کمرے میں بناؤ سنگھار کر رہی تھی کیونکہ آج رات کو اسے اس بنگلے کے تہہ خانے میں ان ”عزت دار“ امیر اور ادھیڑ عمر تماش بینوں کے آگے مجرا کرنا تھا جو سوناگاچی چندا بائی کے کوٹھے پر جا کر اس کا گانا نہیں سن سکتے تھے۔ انسپکٹر منجریکر ایک تجربہ کار پولیس آفیسر تھا۔ بنگلے میں داخل ہوتے ہی اس نے بوڑھی ملازمہ کو ایک طرف لے جا کر یہ معلوم کر لیا تھا کہ چندا صبح صبح دریا پر نہانے گئی تھی اور جب وہ واپس آئی تھی تو دن چڑھا ہوا تھا اور اس کے بال گیلے تھے۔ مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر لکھی بائی سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اس نے لکھی بائی کو یہی کہا کہ وہ یونہی اس سے ملنے آ گیا ہے۔ لیکن لکھی بائی ایک جہاندیدہ نائیکہ تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ انسپکٹر منجریکر کسی مار پر آیا ہے اور ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ نجمی نے بھی جب اپنے چھوٹے سے کمرے میں ساڑھی بدلتے وقت انسپکٹر کی آواز سنی تو اس کا دل ایک لمحے کے لیے بھی زور سے نہ دھڑکا۔ وہ خوب جانتی تھی کہ یہ بدمعاش انسپکٹر اسی خفیہ حوالدار کی گمشدگی کی

سراغ رسانی کرنے آیا ہے۔ جس کی ہڈیاں بھی شاید جل کر راکھ ہو چکی ہیں۔ نجمی نے کانوں میں سونے کے قیمتی بندے پہنے۔ گردن اور کانوں کے نیچے اعلیٰ کلون کا اسپرے کیا۔ ایک بار پھر آئینے میں اپنے حسن و جمال کا جائزہ لیا۔ اب نجمی کے چہرے پر وہ لاہور میں کالج کے زمانے والی معصومیت اور نورانی جمال نہیں رہا تھا جو پاکباز اور عفت شعار لڑکیوں کا طرہ امتیاز ہوتا ہے۔ اس کے چہرے کے نقوش قدرے گہرے اور کرخت ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں فطری حیا کی جگہ ایک بے باکی اُبھر آئی تھی لیکن اس کے باوجود وہ جوان تھی اور اس کے سراپا میں ایک ایسی دلکشی تھی کہ کلکتے کے موٹی موٹی توندوں والے سیٹھ اسے دیکھتے ہی اپنی توندیں سنبھالنے لگتے تھے۔ اس دوران نجمی نے یہ کام ضرور کیا تھا کہ اپنے کمرے میں آتے ہی دروازہ بند کر کے پستول کی نالی کو اچھی طرح سے صاف کر کے اس میں تھوڑا سا ے دیا تھا تاکہ بارود کی ہلکی سی بُو بھی باقی نہ رہے۔ یہ پستول اس نے لکھی بائی کی الماری میں وہیں رکھ دیا تھا جہاں وہ رات کو پڑا رہتا تھا۔ جب نجمی بن سنور کر باہر آئی تو انسپکٹر منجریکر اس کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں پر انگلی پھیرتے ہوئے نجمی کی طرف ہوس آلود نظروں سے تکتے ہوئے بولا ”لکھی بائی! چندا تو روز بروز سندر ہوتی جا رہی ہے۔“

لکھی بائی پان لگا رہی تھی مسکرا کر بولی ”یہ سب بھگوان کی کرپا ہے۔“

نجمی نے ہاتھ جوڑ کر بدمعاش مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کو نمسکار کیا اور لکھی بائی کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ لکھی بائی نے طشتری میں پان اور چھالیہ لگا کر نجمی کو دی۔ نجمی نے انسپکٹر منجریکر کو بڑے طوائفانہ سلیقے سے پان پیش کیا۔ انسپکٹر منجریکر نے پان اٹھاتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور کہا۔

”تم صبح دریا پر اشنان کرنے بھی جاتی ہو چندا۔“ نجمی اب وہ نجمی نہیں رہی تھی کہ پولیس انسپکٹر سے ایسی بات سن کر گھبرا جاتی یا اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا۔ جرائم پیشہ لوگوں، اسمگلروں اور قاتلوں کے ماحول میں رہتے ہوئے اسے ایک عرصہ بیت گیا تھا۔ وہ پولیس کے تمام ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف ہو چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ پولیس دل کا راز کیسے اگلواتی ہے۔ نجمی نے انٹیلی جنس کے ہندو حوالدار کو قتل کیا تھا اور اسے اس پر کوئی ندامت، گھبراہٹ اور پریشانی نہیں تھی وہ اگر زندہ ہو کر

اس کے سامنے آ جاتا تو وہ ایک بار پھر اس کا خون کر سکتی تھی۔ نجمی نے انسپکٹر منجریکر کی طرف گھور کر دیکھا اسے تو ابھی اس مرہٹہ انسپکٹر سے بھی بدلہ لینا تھا۔ اس کا بھی خون کرنا تھا۔ نجمی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

”کیوں؟ کیا میں صبح دریا پر اشنان کرنے نہیں جا سکتی؟“ انسپکٹر منجریکر چھالیہ منہ میں ڈالتے ہوئے مسکرایا۔

”کیوں نہیں چندا بائی۔ تم جہاں چاہو جا سکتی ہو۔“ لکھی بائی نے چندا کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”کیا تم صبح دریا پر اشنان کرنے گئی تھیں چندا؟“

”ہاں ماسی۔“ نجمی نے اپنے لیے پان لگاتے ہوئے کہا۔ ”صبح دریا پر نہانے کو بہت جی چاہ رہا تھا۔“

انسپکٹر منجریکر کو پتہ چل چکا تھا کہ چندا یعنی نجمی دریا پر صبح صبح نہانے گئی تھی مگر دن چڑھے واپس لوٹی تھی۔ مگر اس نے یہ بات وہاں نہ دہرائی۔ چندا سے اس وقت کچھ پوچھنا مناسب خیال نہ کیا اور تھوڑی دیر بیٹھ کر وہاں سے اٹھ آیا۔ انسپکٹر منجریکر کے جانے کے بعد لکھی بائی نے نجمی کو ہلکی سی ڈانٹ کے ساتھ کہا ”مت جایا کرو دریا پر صبح صبح۔ ایسی کونسی بات تھی۔ بہاری سے کہہ دیتیں وہ تمہیں جمنا کے پانی کی گاگر بھر کر یہاں لا دیتا۔ تمہیں معلوم نہیں پولیس والوں نے ہمارے پیچھے سی آئی ڈی والے چھوڑ رکھے ہیں بھگوان ہی ان کو سمجھے۔ میں تو بڑی کٹھنائی میں پھنس گئی ہوں۔“

نجمی نے دل میں کہا کہ لکھی بائی ابھی تم پر کٹھنائی آئی ہی نہیں۔ ابھی سے کیوں گھبرا رہی ہو۔ نوکر بہاری نے آ کر بتایا کہ سیٹھ کی گاڑی باہر آ گئی ہے۔ لکھی بائی نے چندا کو مجرے والے کمرے میں چل کر بیٹھنے کو کہا اور خود کلکتے کے مشہور جوہری کے سواگت کے لیے باہر کی طرف بڑھی۔

انٹیلی جنس کے حوالدار کا ٹیکسی سمیت گم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ کلکتے کی ساری پولیس حرکت میں آ گئی تھی۔ مضافات کے سارے ویران علاقوں کو چھانا پھٹکا جا رہا تھا۔ امجدیہ ہوٹل والا سیٹھ جبار بھی ندیم کو شہر کے ایک مضافاتی ویران علاقے میں چھپانے کے بعد غافل نہیں بیٹھا تھا اس نے اپنے خاص آدمی علاقے میں چھوڑ رکھے تھے۔ جبار سیٹھ نے اپنی اولاد کے جوان ہونے کے بعد اگرچہ منشیات کا دھندا ترک کر دیا تھا لیکن اس کا ان لوگوں سے ابھی تک رابطہ تھا جو پولیس کے مخبر تھے۔ ان مخبروں نے جبار سیٹھ کو خبر دی کہ کلکتہ انٹیلی جنس کا ایک حوالدار ٹیکسی سمیت غائب ہو گیا ہے وہ

ڈیوٹی پر تھا اور پولیس کو شبہ ہے کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے چنانچہ پولیس سفید کپڑوں میں شہر کے اندر اور باہر ویران علاقوں میں اپنے آدمی کو سرگرمی سے تلاش کر رہی ہے۔ جبار سیٹھ چوکس ہو گیا۔ اس نے دلی والے اپنے جگری یار احمد خان کی یاری نبھانے کے لیے ایسے مفرور قیدی ندیم کو اپنے ہاں پناہ دی تھی جس پر پاکستان کے جاسوس ہونے کا سنگین الزام تھا اگر ندیم کو پولیس مضافاتی جنگل والے کوارٹر سے برآمد کر لیتی ہے تو جبار سیٹھ اس کے نتائج کی سنگینی سے اچھی طرح باخبر تھا۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ پولیس اس نتیجے پر نہ پہنچے کہ "پاکستانی جاسوس" اور مفرور قیدی کو وہاں سیٹھ جبار نے چھپایا تھا۔ جبار سیٹھ نے اسی وقت ندیم کو کسی دوسری جگہ پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ اسی دن کی بات ہے جس دن صبح صبح نجمی ندیم سے جنگل میں مل کر آئی تھی دھوپ ڈھل چکی تھی۔ کلکتے کے بازاروں میں دفتروں سے واپسی کے باعث ٹریفک زوروں پر تھی۔ سیٹھ جبار نے اپنے اسی راز دار ڈرائیور کو بلایا جو ندیم کو جنگل والے کوارٹر میں چھوڑ کر آیا تھا اسے کچھ باتیں سمجھائیں اور جنگل کی طرف روانہ کر دیا۔ ڈرائیور ادھیڑ عمر مگر گٹھے ہوئے جسم کا بہاری مسلمان تھا اور ایک عرصے سے سیٹھ جبار کی خدمت کر رہا تھا۔ وہ جیپ لے کر فوراً جنگل کی طرف چل پڑا۔

جنگل کے درختوں میں شام ہو رہی تھی سائے اندھیروں میں ڈھلنے لگے تھے۔ درختوں پر پرندوں کا شور گونج رہا تھا۔ ندیم تھرمس میں سے گلاس میں چائے انڈیل کر کوارٹر کے اندر نیم وا کھڑکی کے پاس بیٹھا رات کے بڑھتے ہوئے اندھیروں میں آہستہ آہستہ گم ہوتے درختوں کو دیکھتے ہوئے چائے پی رہا تھا کہ اسے جیپ کی آواز سنائی دی۔ پھر اسے کچے راستے پر جیپ کوارٹر کی طرف آتی نظر آئی وہ حیران ہوا کہ اس وقت سیٹھ جبار کیسے آگیا ہے اسے تو صبح آنا تھا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ندیم نے چائے کا گلاس ایک طرف رکھ کر کھڑکی بند کر دی اور کمانی دار چاقو کھول کر اپنے ہاتھ میں لے لیا جو جبار سیٹھ اسے اپنی حفاظت کے لیے دے گیا تھا۔ یہ جیپ پولیس کی بھی ہو سکتی تھی۔ ندیم دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر باہر دیکھ رہا تھا۔ جیپ ناریل کے درختوں میں آ کر رک گئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس بجھی ہوئی تھیں۔ یہ سیٹھ جبار ہی کی جیپ تھی جب اس میں سے سیٹھ جبار کا ملازم ڈرائیور نکلا تو ندیم نے چاقو بند کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا ڈرائیور

لمبے لمبے ڈگ بھرتا سیدھا کوارٹر کے دروازے پر آگیا۔ ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور بولا "بابو... سیٹھ نے بولا ہے تمھیں یہاں سے ابھی ایک دوسری جگہ جانا ہوگا۔"

ندیم حوالدار کے قتل سے باخبر تھا۔ اس کی لاش کو ٹیکسی سمیت خود اس نے نذر آتش کیا تھا۔ ڈرائیور نے اسے جلدی جلدی صرف اتنا بتایا کہ اس علاقے میں پولیس کے چھاپے کا خطرہ ہے سیٹھ نے مجھے تمھیں یہاں سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے بھیجا ہے۔ ندیم فوراً تیار ہو گیا۔ ویسے بھی خفیہ پولیس والے کے قتل کے بعد یہ جگہ اب محفوظ نہیں رہی تھی۔ ڈرائیور نے جلدی جلدی کھانے کے برتن کپڑے میں باندھے تھرمس گلاس اور دوسری چیزیں اٹھا کر جیپ میں رکھیں۔ چارپائی پر بچھا ہوا بستر بھی اٹھا لیا۔ فرش پر گرے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے بھی صاف کر دیے۔ کوارٹر کے دروازے کو تالا لگایا اور ندیم کو جیپ میں بٹھا کر واپس روانہ ہو گیا۔ سمجھدار ڈرائیور نے ندیم کو بند جیپ کے اندر بٹھایا تھا۔ جیپ جنگل سے نکل کر ایک کشادہ سڑک پر آ کر مغرب کی طرف دوڑنے لگی۔ ندیم نے کینوس کا پردہ ذرا سا ہٹا کر باہر دیکھا دور کلکتہ شہر کی روشنیوں کے جھرمٹ نظر آرہے تھے جیپ شہر کی طرف جا رہی تھی۔

جیپ مختلف سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی اب شہر میں داخل ہو گئی تھی رات ہو چکی تھی کلکتہ شہر روشنیوں میں جگمگا رہا تھا۔ ندیم جیپ کے اندر سیٹ پر خاموش بیٹھا اپنے ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچ رہا تھا کبھی کبھی اسے گمان ہونے لگتا کہ اب وہ کبھی نجمی کو ساتھ لے کر واپس لاہور نہیں جا سکے گا۔ جیپ ایک بار پھر شہر کے گنجان علاقے سے نکل کر نسبتاً غیر آباد علاقے میں داخل ہو گئی۔ ندیم نے کینوس کا پردہ ہٹا کر باہر دیکھا۔ ایک میدان بائیں جانب تھا جس کے کنارے کنارے کھمبوں پر ٹیوب لائٹس روشن تھیں۔ جیپ ایک ڈھلان اتر کر دائیں جانب گھوم گئی یہاں اونچی ڈھلانی چھتوں والے مال گوداموں سے بنے ہوئے تھے ایک گاڑی تیزی سے پیچھے کی طرف گزر گئی۔ یہاں فضا میں دریائی سرکنڈوں کی مرطوب بو رچی ہوئی تھی۔ یقیناً یہ دریا کے ساحل کا علاقہ تھا۔ اور دریائے ہگلی یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جیپ ان گوداموں کے درمیان ایک تنگ سی گلی میں داخل ہو کر ایک طرف دیوار کے ساتھ رک گئی۔ ڈرائیور جلدی سے نیچے اترا۔ اس نے ندیم کو ساتھ

لیا اور ایک مال گودام کے بڑے دروازے کے پہلو میں چھوٹے دروازے کا تالا کھول کر ندیم کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یہ علاقہ نیم اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور بالکل سنسان تھا کونے میں ایک مال گودام کی دیوار کے اوپر ایک کمزور روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ ڈرائیور نے اندر آکر جیب سے موم بتی نکال کر جلائی اور اسے ایک خالی کھوکھے کے اوپر لگا دیا۔ ندیم نے دیکھا کہ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں خالی کھوکھوں کا ڈھیر لگا پڑا تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس کی ایک خالی چارپائی پڑی تھی جس پر دری لپیٹ کر ایک طرف رکھ دی گئی تھی۔ ندیم چارپائی پر بیٹھ گیا ڈرائیور نے ایک چھوٹا سا دروازہ کھول کر کہا۔

"یہ سنڈاس (ٹائلٹ) ہے۔"

اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور نے موم بتیوں کا پیکٹ اور ماچس ندیم کے سامنے کھوکھے پر رکھ دی اور بولا "رات کے وقت سیٹھ خود آکر تمھیں سب کچھ سمجھا دیں گے۔ تم اندر کسی قسم کی آواز پیدا نہ کرنا۔ میں باہر سے تالا لگا کر جا رہا ہوں۔ فکر نہ کرو موم بتی کی روشنی باہر نہیں جائے گی۔ ویسے تم موم بتی کو سنڈاس میں جلا کر اس کا دروازہ تھوڑا سا کھول دو تو زیادہ اچھا ہوگا"

اتنا کہہ کر ڈرائیور تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ بند کر دیا گیا پھر ندیم کو باہر تالا لگانے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز کچھ دور جا کر ختم ہو گئی۔ ندیم کو محسوس ہونے لگا کہ اب شاید اس کی ساری زندگی مفرور حالت میں ہی گزرے گی اور وہ کبھی آزاد فضا میں اپنی مرضی کے مطابق نہ رہ سکے گا۔ ڈرائیور کے جانے کے بعد ندیم نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے موم بتی کھوکھے پر سے اٹھا کر باتھ روم کا ذرا سا دروازہ کھولا اور اس کے اندر پڑی اینٹ پر لگا دی۔ اب موم بتی کی روشنی براہ راست کمرے میں نہیں پڑ رہی تھی۔ یہ کمرہ نہیں بلکہ ایک ڈبہ سا بنا ہوا تھا جس میں صرف ایک ہی ہوادان تھا جو چھت کے قریب دیوار میں بنا تھا۔ حبس کے مارے ندیم کو پسینے آنے لگے مگر وہ اندر بیٹھے رہنے پر مجبور تھا۔ خدا جانے رات کتنی گزر گئی تھی کہ کسی کے قدموں کی چاپ گودام کے دروازے کی طرف بڑھی۔ ندیم چارپائی پر بیٹھا اخبار کے ایک پرانے صفحے سے اپنے آپ کو پنکھا جھل رہا تھا۔ اس کا ہاتھ رک گیا۔ باہر سے کسی نے تالا کھولا۔ ندیم اٹھ کر باتھ روم کی طرف ہو گیا۔ دروازہ آہستہ سے کھلا۔ یہ جبار سیٹھ تھا۔

اس کے ہاتھ میں پلاسٹک کا تھیلا تھا۔ اندر آتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔ تھیلا چارپائی کے پاس رکھا اور بولا "تمھیں یہاں تکلیف ضرور ہوگی مگر میں اس کا بھی انتظام کر دوں گا۔ کل تمھیں ایک چھوٹا ٹیبل فین بھی پہنچا دوں گا۔ یہاں بجلی ہے مگر بلب ٹوٹا ہوا ہے۔ بلب تمھیں جلانا بھی نہیں چاہیئے۔ لو کھانا کھا لو۔ میں چائے بھی لایا ہوں۔"

جبار سیٹھ نے کھانا نکال کر ندیم کے آگے رکھا اور اسے بتایا کہ خدا جانے پولیس والوں کا ایک خفیہ حوالدار کہاں غائب ہو گیا ہے کہ پولیس اس کی تلاش میں جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے۔ "میں نے تمھیں اسی لیے یہاں پہنچا دیا ہے۔ پولیس اس جنگل میں بھی پہنچ گئی تھی۔ سنا ہے کہ وہاں کسی جگہ انھیں ٹیکسی کا جلا ہوا ڈھانچہ ملا ہے جس میں کسی انسان کی ہڈیاں بھی پائی گئی ہیں۔ اس بارے میں تمھیں تو کچھ معلوم نہیں؟"

ندیم نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے کچھ معلوم نہیں سیٹھ صاحب میں تو اس روز سے کوارٹر میں بند تھا۔ کسی نے دشمنی میں آکر اس آدمی کو ٹیکسی میں قتل کر کے آگ لگا دی ہو۔"

جبار سیٹھ کہنے لگا "بدبخت کو اسی جگہ قتل کرنا تھا۔ وہ سارا علاقہ پولیس کی تفتیش میں آگیا ہے خیر یہ جگہ بہت محفوظ ہے پنکھے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔"

ندیم نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ بھوک سے اس کا برا حال ہونے لگا تھا۔ چائے گلاس میں ڈال کر اس نے سگریٹ سلگایا اب اسے یاد آگیا کہ نجمی نے جاتے ہوئے اسے کہا تھا کہ وہ اگلی رات کو اس سے ملنے آئے گی یہ انتہائی خطرناک بات تھی! ندیم کسی طرح سیٹھ جبار کے واسطے سے نجمی تک یہ پیغام پہنچانا چاہتا تھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے جنگل کا رخ نہ کرے وہ سیٹھ کو یہ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا کہ نجمی اس سے ملنے آئی تھی اور رات کو دوبارہ آنے کا وعدہ کر گئی ہے۔ کافی دیر سوچ بچار کرنے کے بعد ندیم نے باتوں ہی باتوں میں جبار سیٹھ سے کہا۔

"سیٹھ جی! چندا کس حال میں ہے؟ کیا آپ اس دوران اس سے ملے تھے؟"

جبار سیٹھ کہ یوں لے سگریٹ کا کش لگا کر بولا "چندا تو سوناگاچی میں رہتی ہے اور میں نے وہاں جانا اب چھوڑ دیا ہے۔ تمھاری خیریت کی اطلاع اسے پہنچا دی گئی تھی۔ کوئی اور پیغام دینا ہو تو وہ بھی بتا دو۔"

ندیم نے فوراً کہا "سیٹھ جی مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ میری تلاش میں گھر سے نکل نہ پڑے۔ بس اسے منع کروا دیجئے گا۔ سرحد پہ حالات معمول پر آئے تو میں خود ہی اسے اطلاع کروا دوں گا۔" جبار سیٹھ نے چائے کا گھونٹ پیتے ہوئے کہا "برخوردار تمہیں اپنی چندا کے بارے میں کچھ زیادہ ہی غلط فہمی ہے وہ ٹھیک ہے وہ کبھی تمہاری معشوقہ رہی ہو گی مگر اب تو وہ سونا گاچی کی سب سے خوبصورت اور دولتمند طوائف ہے میرا نہیں خیال کہ وہ اتنی دولت، شہرت اور گہما گہمی کی زندگی چھوڑ کر تمہارے ساتھ یہاں سے بھاگنے پہ تیار ہو جائے گی۔ ویسے میں تمہارا پیغام اس کو پہنچا دوں گا۔"

ندیم نے سیٹھ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا وہ اسے کیسے بتاتا کہ نجمی یعنی چندا ان خطرناک حالات میں بھی جان کی بازی لگا کر اس سے ملنے جنگل والے کوارٹر میں آ گئی تھی اور صرف اپنے محبوب کی جان بچانے کے لیے اس نے سی آئی ڈی والے ہندو حوالدار کا خون بھی کر دیا تھا۔ ندیم نے سیٹھ جبار سے صرف اتنی گزارش ضرور کی کہ وہ اسے وقت دیکھنے والا کوئی چھوٹا ٹائم پیس ضرور لا دے تاکہ اسے پتہ چل سکے کہ رات یا دن کا کیا بجا ہے۔ جبار سیٹھ نے کہا "کل میں خود دن کے وقت آؤں گا اب میں جاتا ہوں۔ آج کی رات جس طرح بھی ہو سکے گزار لو۔"

جبار سیٹھ باہر تالا لگا کر چلا گیا۔ باتھ روم میں ایک ٹوٹا ہوا شیشہ دیوار کے ساتھ لگا تھا۔ ایک پرانی قینچی بھی وہاں پڑی تھی۔ ندیم نے موم بتی کی روشنی میں اپنا چہرہ دیکھا اس کی داڑھی مونچھ اور سر کے بال کافی بڑھ گئے تھے۔ یہ بڑی اچھی بات تھی۔ وہ اتنی آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا تھا۔ ندیم نے قینچی سے اپنی مونچھوں کو ہونٹوں کے اوپر تراش ڈالا۔ پھر چارپائی پہ آ کر لیٹ گیا۔ اب مچھروں نے یلغار کر دی۔ اس نے ایک پتلی سی چادر اوپر کر لی مگر اس میں گرمی لگنے لگی۔ بڑی مشکل سے پہلو بدلتے مچھروں سے جنگ کرتے کبھی جاگتے کبھی سوتے اس نے رات گزار دی چھت والے چھوٹے سے روشندان میں سے دن کی گلابی روشنی اندر آنے لگی۔ اس کے اندازے کے مطابق کوئی دو اڑھائی گھنٹے کے بعد اسے ایک بار پھر باہر کسی کے قدموں کی آواز سنائی دی۔ تالا کھلا اور جبار سیٹھ کی جگہ اس کا ڈرائیور کھانا اور چائے لے کر اندر داخل ہوا۔ ایک چھوٹا ٹیبل فین بھی اس نے اٹھا رکھا تھا۔ دروازہ فوراً بند کر کے اس نے ٹیبل فین اینٹوں کے اوپر رکھ کر دیوار میں اس کا

پلگ لگا دیا۔ ٹیبل فین چلنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا ندیم کو لگی تو اسے جیسے ہوش آ گیا۔ ڈرائیور نے تھیلے میں سے کالے رنگ کا چھوٹا سا ٹائم پیس بھی نکال کر ندیم کو دیا۔ اس وقت دن کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ ڈرائیور نے کہا "سیٹھ جی نے کہلا بھیجا ہے کہ فکر کی کوئی بات نہیں وہ کل آئیں گے۔ میں جاتا ہوں۔"

ڈرائیور نے تازہ کھانے کا لفافہ وہاں رکھ دیا اور رات والے خالی برتن تھیلے میں ڈال کر جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا اور جاتے ہوئے باہر پھر تالا لگا گیا۔ ندیم ایک طرح سے قید تنہائی میں پڑ گیا تھا۔ مگر وہ باہر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ اب تو مقتول حوالدار کی جلی ہوئی لاش کا ڈھانچہ بھی پولیس کو مل چکا تھا۔ پولیس پہلے سے زیادہ چوکس ہو گئی ہو گی۔ کھانے میں نان مچھلی اور ساگ کا سالن تھا۔ یہ امجدیہ ہوٹل کا ہی کھانا لگتا تھا۔ چائے کا تھرمس بھی ساتھ تھا۔ ندیم نے کھانا کھا کر چائے پی اور سگریٹ سلگا کر چارپائی پہ نیم دراز ہو گیا۔ ٹیبل فین کی ٹھنڈی ہوا اس کے سارے جسم پہ پڑ رہی تھی جس سے اسے بے حد فرحت مل رہی تھی۔ وہ دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ سرحد پہ سیکورٹی کم ہو اور نجمی اس کے ساتھ سرحد پار کرنے پر راضی ہو جائے۔

یہ اسی دن کی رات کا ذکر ہے۔ ندیم کلکتہ شہر کے باہر والے ویران علاقے کے ایک گودام کے تنگ و تاریک کمرے میں چارپائی پہ لیٹا نجمی کے تصور میں گم تھا۔ دوسری طرف اس کی کالج کے زمانے کی محبوبہ نجمی اور کلکتہ کی چندا بائی رقاصہ سونا گاچی والے اپنے چوبارے میں شہر کے کروڑپتی اوباش ہندو ٹھیکیدار بھٹا چاریہ جی کے سامنے محو رقص تھی۔ شراب اڑ رہی تھی۔ موٹا ہندو بنگالی سیٹھ چندا پہ سو سو کے نوٹ نچھاور کر رہا تھا جنہیں چندا ناز و ادا سے اٹھا اٹھا کر نکھی بائی کے حوالے کیے جا رہی تھی۔ ہارمونیم بج رہا تھا۔ طبلے پہ تال پڑ رہی تھی۔ چندا رقص کر رہی تھی۔

کمرہ بجلی کی روشنی میں جگ مگ کر رہا تھا۔ سارنگی بجانے والا جھوم جھوم کر سارنگی بجا رہا تھا۔ آج کئی دنوں کے بعد ٹھیکیدار سیٹھ گانا سننے آیا تھا۔ اسے ٹھیکیدار سیٹھ سے انعام پانے کی امید تھی۔ چندا خود جام بنا کر موٹے بنگالی سیٹھ کو پیش کرتی۔ سیٹھ کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کا باڈی گارڈ بھی نشے میں جھوم رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ سونا گاچی کے بازار میں اب پہلے جیسی رونق نہیں رہی تھی۔ صرف بند کوٹھوں کے اندر ہی مجرہ ہو رہا تھا۔ جہاں شریف تماش بین اور وہ

لوگ جنھوں نے بعض طوائفوں کو داشتہ بنا کر رکھا ہوتا ہے اور ہر ماہ بھاری رقم خرچ کے لیے دیتے ہیں صرف وہی آدھی رات کے بعد سونا گاچی میں آتے ہیں۔ سیٹھ بھٹا چاریہ بھی چندا کو ہر ماہ پانچ ہزار روپے خرچ کے طور پر دیتا تھا۔ آج وہ اس کا مجرہ سننے آیا تھا تو کوٹھے کا دروازہ اندر سے بند کر دیا گیا تھا۔ اب دوسرا کوئی تماش بین وہاں نہیں آ سکتا تھا۔ لکھی بائی کی دوسری زرخرید طوائف اور نجمی یعنی چندا بائی رقاصہ کی سہیلی کرشنا کا اوپر والی منزل میں مجرہ ہو رہا تھا۔ وہاں لکھی بائی کا باڈی گارڈ دھومل بدمعاش نگرانی پر مامور تھا۔ نجمی ایک گھٹیا سی پرانی اردو کی کوئی غزل گاتے ہوئے مجرہ کر رہی تھی۔ سیٹھ جھوم جھوم کر سوسو کے نوٹ نچھاور کیے جا رہا تھا کہ بازار میں لکھی بائی کے کوٹھے کے نیچے دو جیپیں آ کر رکیں۔ اوپر طبلے اور گھنگروؤں کے شور میں ان جیپوں کے رکنے کی آواز سنائی نہ دی۔ لکھی بائی خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔ سیٹھ پانچ ہزار تو ہر مہینے بھجوا ہی دیتا تھا۔ مگر آج رات وہ دھڑا دھڑ دولت لٹا رہا تھا اور لکھی بائی دونوں ہاتھوں سے سمیٹے جا رہی تھی۔ چندا رقص کرتے ہوئے بدشکل ادھیڑ عمر بنگالی سیٹھ کے قریب آئی تو اس نے اسے کلائی سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ چندا نے ایک کافرانہ ادا سے کلائی کھینچی تو موتیے کے پھولوں کا گجرا ٹوٹ کر سیٹھ کے ہاتھ میں رہ گیا۔ سیٹھ نے ہائے مار ڈالا ظالم کا نعرہ لگایا اور نوٹوں کی گڈی کھول کر چندا پر نچھاور کر دی۔ نوٹ چاندنی پر بارش کی طرح گرنے لگے۔ عین اس وقت سیڑھیوں میں بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ طبلے گھنگروؤں اور ہارمونیم کے شور میں بھی گرگ باراں دیدہ لکھی بائی نے یہ آواز سن لی۔ فوراً سمجھ گئی کہ یہ کسی تماش بین کے قدموں کی آواز نہیں ہے۔ اس آواز میں بے باکی تھی۔ لکھی بائی کو پولیس کا خیال آ گیا مگر وہ تو پولیس کو ہر روز ان کا کمیشن باقاعدگی سے پہنچا دیتی ہے۔ پھر یہ کون ہو سکتا ہے۔

دروازے پر باہر سے کسی نے زور سے ہاتھ مارا۔ ساتھ ہی بھاری آواز میں کسی نے تحکمانہ انداز میں کہا "دروازہ کھولو لکھی بائی۔"

نجمی نے رقص کرتے کرتے لکھی بائی کی طرف اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ یہ کون بدتمیز ہے اسے جا کر سنبھالو باہر ہی سے رخصت کر دو۔ موٹے سیٹھ نے یہ آواز سنی تو چڑھی ہوئی آنکھوں سے بند دروازے کی طرف دیکھ کر غرایا "لکھی بائی یہ کون حرامی اس وقت آیا ہے؟"

باہر سے کسی نے لات مار کر دروازے کی کنڈی اکھاڑ ڈالی۔ دروازہ دھڑاک سے کھل گیا اور

لکھی بائی کا رنگ فق ہو گیا۔ دروازے میں چہرے پر ڈھاٹا باندھے ہاتھوں میں اسٹین گن لیے مان سنگھ ڈکیٹ کھڑا تھا۔ لکھی بائی آسام کی سرحد پر قتل و غارت کرنے والے اس خونی ڈاکو کو جانتی تھی۔ نجمی رقص کرتے کرتے رک گئی اور اپنا لباس درست کرتے ہوئے لکھی بائی کے قریب آ گئی۔ موٹے بنگالی ہندو سیٹھ نے ایک عجیب و غریب بھیانک چہرے اور موٹی مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والے آدمی کو سامنے دیکھا تو اس کی گھگھی بندھ گئی۔ اس کے باڈی گارڈ کا بھی رنگ اڑ گیا۔ مان سنگھ نے اسٹین گن کا رخ موٹے سیٹھ کی طرف کر دیا اور کڑک کر بولا "کتے کے بچے تو نے مان سنگھ کو حرامی کہا؟"

اس کے ساتھ ہی اسٹین گن کی نالی میں سے شرارے کوندے تڑاتڑاتی آوازوں کے ساتھ چھ سات گولیاں موٹے بنگالی سیٹھ کے پیٹ میں گھس گئیں اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ خون کے فوارے چلنے لگے۔ لکھی بائی نے چیخ ماری۔ مان سنگھ کے پیچھے اس کا ساتھی داسو بھی تھا۔ اب اس نے برین گن کا ایک برسٹ مارا اور لکھی بائی، سیٹھ کے باڈی گارڈ اور ہارمونیم والے ماسٹر کو بھون کر رکھ دیا۔ سارنگی والا یہ خونیں منظر دیکھ کر وہیں بے ہوش ہو گیا۔

نجمی اوپر جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑی تو مان سنگھ نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا اور داسو کی طرف دھکیل کر بولا "ارے داسو! اس چم چم کو نیچے لے جا رے۔"

داسو نے نجمی کو بالوں سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا سیڑھیوں میں لے گیا۔ مان سنگھ ڈکیٹ اب اوپر جانے والے زینے کی طرف گیا۔ اوپر والے کوٹھے میں مجرا بند ہو گیا تھا۔ نیچے گولیاں چلنے کی آواز سن کر تماش بین چھت پر بھاگ گئے تھے اور رقاصہ کرشنا غسل خانے میں چھپ گئی تھی۔ مان سنگھ نے اسٹین گن کا رخ اوپر والے دروازے کی طرف اٹھا کر ایک برسٹ مارا اور لکھی بائی، سیٹھ بھٹا چاریہ اس کے باڈی گارڈ اور ہارمونیم بجانے والے کی خون میں نہائی ہوئی لاشوں کو دیکھتا ہوا سیڑھیاں اتر کر بازار میں آ گیا۔ بازار پہلے ہی سنسان تھا گولیوں کی آواز سے جو دو چار پولیس والے تھے وہ بھی جان بچانے کی فکر میں رفو چکر ہو گئے تھے۔ مان سنگھ ڈکیٹ کے دوسرے ڈاکو ساتھی دونوں جیپوں کے باہر برین گنیں اٹھائے پوزیشنیں لیے کھڑے تھے۔ مان سنگھ کا خاص ساتھی داسو نجمی کو جیپ میں لیے بیٹھا تھا اس نے نجمی کے منہ پر کپڑا ٹھونس کر اس کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے تھے۔ اپنے سردار

مان سنگھ کو آتے دیکھ کر ڈاکو جیپوں میں سوار ہو گئے۔ مان سنگھ بھی جیپ میں بیٹھا اور دونوں گاڑیاں ایک زناٹے سے بازار سے نکل گئیں۔

یہ سب کچھ اتنا جلدی ہو گیا تھا کہ نجمی ابھی تک اپنے حواس کو مجتمع نہیں کر سکی تھی۔ اسے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ بھاری مونچھوں اور خونخوار آنکھوں والا قوی ہیکل آدمی کون ہے جو اسے اغوا کر کے لیے جا رہا ہے اور جس نے آناً فاناً نکھی بائی اور تین دوسرے انسانوں کا خون کر ڈالا ہے۔ نکھی بائی مان سنگھ ڈکیٹ کو جانتی تھی لیکن نجمی نے مان سنگھ کو وہاں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا نکھی بائی کی موت کا نجمی کو افسوس ہوا تھا اس لیے کہ وہ اس بدکار اور معصوم لڑکیوں کی عزّت کے سودے کرنے والی مکروہ عورت کو خود ہلاک کرنا چاہتی تھی۔ سب سے بڑی پریشانی اسے یہ تھی کہ یہ ڈاکو لوگ اسے اغوا کر کے کہاں لے جا رہے ہیں؟ یقیناً اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا جائے گا۔ نجمی کو ندیم کا خیال آ گیا۔ خدا جانے اسے اس کے اغواء کی خبر بھی ملے گی یا نہیں معلوم نہیں اب ندیم سے کب ملاقات ہو۔ نجمی کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا، ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے اور داسو ڈاکو نے اسے جیپ کے فرش پر اوندھا ڈال کر اس کی گردن پر اپنا پاؤں رکھا ہوا تھا۔

جیپیں کلکتہ کی جگمگاتی ہوئی مگر ویران کشادہ سڑکوں پر تیزی سے بھاگتی چلی جا رہی تھیں۔ آگے آگے مان سنگھ ڈکیٹ کی جیپ تھی جسے وہ خود چلا رہا تھا یہ رات کے ڈیڑھ یا پونے دو بجے کا وقت ہو گا۔ ڈاکوؤں کی دونوں جیپیں پوری رفتار سے جا رہی تھیں۔ مان سنگھ کو معلوم تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ کئی ایک سڑکوں پر سے گزرنے کے بعد جیپیں دریا پار کر کے ایسے علاقے میں آ گئیں جہاں آبادی کہیں کہیں تھی۔ گنجان شہر پیچھے رہ گیا تھا۔ سڑک پکی نہیں رہی تھی اور یہاں ایک جانب پٹ سن کے کھیتوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کھیتوں کو پیچھے چھوڑ کر مان سنگھ نے جیپ کو ایک ذیلی سڑک پر ڈال دیا۔ یہاں گہرا اندھیرا تھا۔ جیپوں کی بتیاں روشن تھیں۔ یہ ایک کچا راستہ تھا جو آم کے وسیع و عریض باغ میں سے گزرتا تھا۔ آگے بانس کی بنی ہوئی دس بارہ جھگیاں روشنی میں ایک بار دکھائی دے کر غائب ہو گئیں۔ ان غیر آباد ویران علاقوں میں رات کے اندھیرے میں کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ڈاکوؤں کی جیپیں ایک گھنے جنگل میں داخل ہو گئیں گاڑیوں کی رفتار کم ہو گئی تھی۔ کیونکہ یہاں اونچی اونچی گھنی خودرو جنگلی جھاڑیوں اور سرکنڈوں کی بھرمار تھی

مگر جیپیں ان جھاڑیوں، سرکنڈوں اور چھوٹے چھوٹے ندی نالوں میں سے گزرتی جنگل میں آگے ہی آگے چلی جا رہی تھیں۔ اس جنگل میں جیپوں کا سفر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ جاری رہا۔ جنگل ذرا کم گھنا ہوا تو چھوٹے بڑے اونچے نیچے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک جگہ تالاب کے کنارے کسی قدیم مندر کا کھنڈر تھا۔ جیپیں اس کھنڈر کے پاس آ کر رک گئیں۔ مان سنگھ جیپ سے نیچے اتر کر بولا "ارے رامو اور بھیکو۔ گاڑیوں کو پیچھے لے جاؤ۔" نجمی کا بند منہ دکھنے لگا تھا۔ جیپ کے فرش پر اوندھے پڑے پڑے اس کا بدن لکڑی کی طرح ہو گیا تھا۔ اسے مان سنگھ نے بازو سے پکڑ کر جیپ سے نکالا اور منہ میں سے کپڑا کھینچ کر بولا "اری چندا رانی! تیری بڑی تعریف سنی تھی۔ اب میرا گھر بسائے گی ری۔" نجمی نے کوئی جواب نہ دیا اس کا حلق بے حد خشک ہو رہا تھا۔ ڈاکو اب اسے لے کر اونچی نیچی ٹیکریوں اور ٹیلوں کی طرف پیدل چل پڑے۔ وہ کئی گھاٹیوں اور پہاڑیوں کے دروں میں سے گزر کر آخر کار ایک اونچے ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگے۔ یہ ٹیلا آس پاس کے تمام ٹیلوں سے بلند تھا اور اس کی چوٹی پر سے باقی تمام ٹیلوں اور گھاٹیوں وادیوں کا بخوبی جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ ٹیلے کی چوٹی پر زمین ہموار تھی۔ یہاں چھ سات ڈاکو پہلے ہی سے رائفلیں اور برین گنیں لیے اپنے سردار کا انتظار کر رہے تھے۔ نجمی کے تمام زیور مان سنگھ ڈکیٹ نے اتار لیے اور اسے ایک غار میں دھکیل کر غار کے منہ پر لگا ہوا بانس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ باہر ایک ڈاکو رائفل گود میں لے کر ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔ نجمی کو غار میں دھکیلنے سے پہلے اس کے ہاتھ کھول دیئے گئے تھے۔ اپنے ہاتھوں کو سہلاتے ہوئے وہ غار کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور اپنا سر گھٹنوں پر رکھ دیا اور سوچنے لگی کہ کیا وہ کبھی یہاں سے آزاد ہو سکے گی؟

٭ ٭ ٭

کلکتے کی ہیرا منڈی سونا گاچی میں چار انسانوں کے خون سے دہشت پھیل گئی تھی۔ انسپکٹر منجریکر پولیس کی گاڑی لے کر وقوعہ کے آدھ گھنٹہ بعد پہنچا۔ لکھی بائی کی لاش سمیت چاروں لاشیں ویسے ہی پڑی تھیں۔ عینی شاہد صرف سارنگی نواز بوڑھا ہی تھا جو برین گنوں کے برسٹ سے انسانی جسموں کو چھلنی ہوتے دیکھ کر غش کھا گیا تھا۔ وہ ابھی تک اپنے حواس میں نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے اس نے انسپکٹر منجریکر کو بتایا کہ مجرا ہو رہا تھا چندا رقص کر رہی تھی کہ دو ڈاکو ایسی شکلوں والے آدمی دروازہ توڑ کر اندر آ گئے انھوں نے آتے ہی فائرنگ شروع کر دی اور میں بے ہوش ہو گیا سارنگی نواز بوڑھے نے ڈاکوؤں کا حلیہ یہی بتایا کہ انھوں نے ڈھاٹے باندھ رکھے تھے اور ایک ڈاکو کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس نے پہلے گولیاں چلائیں۔"

سارنگی نواز کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ڈاکو چندا کو اغوا کر کے لے گئے تھے اس وقت وہ بے ہوش تھا۔ انسپکٹر منجریکر نے جائے واردات کا معائنہ کیا رپورٹ تیار کی اور لاشوں کو اٹھوا دیا۔ آئی جی پولیس نے انسپکٹر منجریکر سے رپورٹ طلب کی۔ انسپکٹر منجریکر نے آئی جی کو بتایا کہ یہ واردات مان سنگھ ڈکیت کی لگتی ہے۔ کیونکہ ان دنوں وہی مدھیہ پردیش سے بنگال کے سرحدی علاقے میں آ کر قتل اغوا اور ڈاکہ زنی کی وارداتیں کر رہا ہے۔ انسپکٹر منجریکر نے رپورٹ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ڈکیت مان سنگھ کو قتل اور اغوا کے اس کیس میں ملوث کر کے انسپکٹر منجریکر نے اپنی جان بچائی تھی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ مان سنگھ قتل اغوا اور ڈاکہ زنی کی ان گنت وارداتوں میں مدھیہ پردیش اور بنگال کی پولیس کو مطلوب تھا اور آج تک کوئی اسے گرفتار نہیں کر سکا تھا۔ پولیس نے اب اپنا وطیرہ بنا لیا تھا کہ اس ضمن میں درج مقدمے کی تھوڑی دیر تفتیش کرنے کے بعد اسے داخل

دفتر کر دیا جاتا۔ بنگال کے آئی جی سمیت کوئی پولیس والا مان سنگھ ڈکیت کے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو البتہ چندا کے اغواء کا ضرور افسوس تھا۔

لکھی بائی کے قتل اور چندا کے اغواء کی خبر دوسرے روز صبح صبح ہی جبار سیٹھ کو مل گئی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ ندیم پر اس خبر کا کیا اثر ہوگا۔ چندا اس کی محبوبہ تھی اور وہ اس کی تلاش میں بھارت آیا تھا اسی کی خاطر اتنی اذیتیں اور تکلیفیں برداشت کی تھیں۔ جبار سیٹھ نے کھانے کا ٹفن تیار کیا اور جیپ میں بیٹھ کر شہر کے باہر والے اس گودام کی طرف چل پڑا جہاں ندیم تنگ و تاریک کمرے میں ٹیبل فین کے سامنے چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس عذاب سے اس کی جان کب چھوٹے گی۔ جبار سیٹھ نے جیپ کچھ فاصلے پر بڑے مال گودام کی عقبی دیوار کے ساتھ کھڑی کی اور پیچھے سے ہو کر پیدل چلتا ہوا ندیم والے گودام کے چھوٹے کمرے والے دروازے پر آ کر رک گیا ایک نظر ڈال کر اپنے دائیں بائیں دیکھا اور پھر تالا کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ ندیم اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا جبار سیٹھ نے ٹفن کیریئر چارپائی کے پاس رکھ دیا اور گہرا سانس لے کر بولا۔ "پہلے تم ناشتہ وغیرہ کر لو۔"

ندیم نے کہا: "سیٹھ جی آج آپ بڑی جلدی آ گئے ہیں خیریت تو ہے نا؟"

جبار سیٹھ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔"

"بالکل خیریت ہے دراصل آج مجھے نو بجے ایک ضروری کام سے جانا تھا۔ اور ہاں آج رات میری کالیہ سے پھر ملاقات ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمھارے بارڈر کراس کروانے کا انتظام ہونے والا ہے۔"

ندیم نے ناشتہ کیا۔ پھر وہ گلاسوں میں چائے ڈال کر پینے لگے۔ اب جبار سیٹھ نے ندیم کو ایک ہی سانس میں بتا دیا کہ رات لکھی بائی کا کسی نے خون کر دیا ہے اور چندا اغواء ہو گئی ہے۔ ندیم بھونچکا سا ہو کر رہ گیا اس نے چائے کا گلاس زمین پر رکھ دیا جبار سیٹھ نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ پولیس جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے وہ چندا کو دو ایک روز میں برآمد کر لے گی۔"

ندیم نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا: "سیٹھ" مگر... مگر وہ لوگ کون تھے؟" جبار سیٹھ نے سگریٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"پولیس کا تو خیال ہے کہ یہ واردات مان سنگھ ڈکیٹ نے کی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مان سنگھ کو جنگل سے نکل کر سونا گاچی میں آ کر واردات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرے خیال میں یہ علاقے کے کسی بدمعاش کی واردات ہے جو لکھی بائی سے بدلہ لینا چاہتا ہوگا۔"

ندیم سر جھکا کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پولیس کی تفتیش کے معمول سے وہ کافی حد تک واقف ہو چکا تھا اسے معلوم تھا کہ نجمی کو پولیس اب شاید ہی برآمد کرنے میں کامیاب ہو اور اگر یہ کسی ڈاکو کی واردات ہے تو پولیس اس کیس میں کبھی ہاتھ نہیں ڈالے گی اور ایسی صورت میں نجمی کے واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جبار سیٹھ نے ندیم کے کاندھے کو آہستہ سے تھپتھپایا اور کہا۔

برخوردار فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں سونا گاچی میں اس قسم کی وارداتیں ہوتی ہی رہتی ہیں۔ پولیس چندا کو جلد برآمد کرے گی۔ ویسے بھی پولیس چندا کو ہاتھ سے نہیں جانے دے گی کیونکہ پولیس کو یقین ہے کہ چندا کا پاکستانی جاسوسوں کے گروہ سے رابطہ ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ پوری کی پوری بنگال پولیس حرکت میں آ گئی ہوگی اور کل یا پرسوں تک چندا ضرور برآمد کر لی جائے گی۔"

ندیم اداس اور پریشان ہو گیا تھا جبار سیٹھ کی تسلیوں کے باوجود اس کی پریشانی اور اداسی میں کمی نہ آئی۔ اس کا سارا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا تھا وہ تو صرف نجمی کو جہنم سے نکالنے وہاں آیا تھا۔ اس نے اس قدر شدید مصائب صرف اس لیے جھیلے تھے کہ وہ ایک نہ ایک روز نجمی کو وہاں سے نکال کر پاکستان لے جائے گا جہاں پہنچ کر وہ اس سے شادی کر کے اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی کوشش کرے گا لیکن تقدیر نے اس کے ساتھ ایک ایسا مذاق کیا تھا جس کا ندیم کو وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ نجمی کو کوئی اغواء کر کے بھی لے جائے گا۔ یہ حقیقت اس سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ پولیس کسی طوائف کے اغواء کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ طوائف کو معاشرے میں وہ مقام ہی حاصل نہیں ہوتا کہ اس کے اغواء کے خلاف پریس بھی آواز بلند کرے چنانچہ پولیس ضابطے کی کارروائی کرنے کے بعد کیس کو داخل دفتر کر دیتی ہے اور محض دکھاوے کے لیے برائے نام تفتیش جاری رکھتی ہے اور جیسا کہ جبار سیٹھ نے بتایا ہے کہ چندا کو کسی مان سنگھ نامی ڈاکو نے اغواء کیا ہے تو ان حالات میں پولیس کبھی اپنے آپ کو خطرے میں نہیں ڈالے گی۔ ندیم یہ سوچ کر مزید پریشان

ہو گیا وہ نجمی کے بغیر واپس پاکستان جانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے ہر حالت میں نجمی کو ساتھ لے کر جانا تھا اس نے جبار سیٹھ سے پوچھا۔

"یہ مان سنگھ ڈاکو کہاں ہوتا ہے؟"

جبار سیٹھ نے طنزیہ ہنسی کے بعد جواب دیا۔

"مان سنگھ کوئی وکیل نہیں کہ مجھے اس کا ایڈریس معلوم ہو۔ وہ ایک خونخوار ڈاکو ہے اس کے نام سے پولیس کے بڑے سے بڑے افسر کا خون خشک ہو جاتا ہے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابھی کسی کو یقین نہیں کہ یہ اغواء اور قتل مان سنگھ ڈکیٹ ہی نے کیے ہیں اور اگر یہ واردات مان سنگھ ہی کی ہے تو کیا تم اس کی تلاش میں جاؤ گے؟ پاگل نہ بنو برخوردار.... آج رات میں کلو لیہ سے ملنے والا ہوں۔ خود اس نے مجھے بلایا ہے میرا خیال ہے کہ تمہارے سرحد پار کرانے کا کوئی بندوبست ہو گیا ہوگا۔ میں تمہیں یہی کہوں گا کہ جس طرح بھی ہو سکے یہاں سے اپنی جان بچا کر نکل جاؤ ہاں یہ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر چندا بعد میں واپس آ گئی اور وہ راضی ہوئی تو میں اسے بھی سرحد پار کرا کے مشرقی پاکستان بھجوا دوں گا۔"

ندیم کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ نجمی جب اسے جنگل والے کوارٹر میں ملنے آئی تھی تو اس نے ندیم کو بتایا تھا کہ گناہ کے اس ماحول میں صرف کرشنا ایک ایسی لڑکی ہے جو اس کی رازدار بھی ہے اور اس کی ہمدرد بھی ہے وہ بھی طوائف ہے مگر اس کا دل بہت پاک صاف ہے۔ ندیم کو نجمی نے یہ بھی بتایا تھا کہ کرشنا طوائف سونا گاچی میں لکھی بائی کے کوٹھے پر ہی مجرا کرتی ہے اور اس نے کرشنا کو ندیم کے بارے میں سب کچھ بتایا ہے۔ ندیم نے سوچا کہ اسے کسی طریقے سے سونا گاچی جا کر کرشنا طوائف سے ملاقات کرنی چاہیئے وہ چونکہ علاقے کے تمام جرائم پیشہ لوگوں کو جانتی ہوگی اس لیے شاید اسے بتا سکے کہ چندا کو کس نے اغواء کیا ہے ہو سکتا ہے کہ کرشنا نے اس آدمی کو دیکھ بھی لیا ہو مگر پولیس کے خوف کی وجہ سے اپنی زبان بند رکھی ہو۔ ندیم نے اپنے دل کا حال جبار سیٹھ پر ظاہر نہ کیا تھا بظاہر وہ یہی کہتا رہا اب جو اللہ کو منظور ہوگا وہی ہوگا پھر جبار سیٹھ سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا۔

"لکھی بائی کا کوٹھا تو بند ہو گیا ہوگا۔"

جبار سیٹھ نے سر کے بالوں کو کھجاتے ہوئے کہا۔

"ان کا دھندا تو چلتا ہی رہتا ہے اس کے ڈیرے میں دوسری طوائفیں بھی ہیں خاص طور پر کرشنا نام کی طوائف چندا کے بعد سب سے زیادہ مشہور ہے پہلے بھی وہ اوپر والے کوٹھے میں مجرا کرتی تھی۔ لکھی بائی کی موت کے بعد یقیناً بدمعاش دھول نے سارا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہوگا۔ وہ لکھی بائی کا خاص آدمی ہے۔ ایک دو روز کاروبار ضرور بند رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ پرسوں یا چوتھ کوٹھے پر کرشنا بائی کا مجرا شروع ہو جائے گا۔"

تھوڑی دیر مزید باتیں کرنے کے بعد جبار سیٹھ اگلے روز آنے کا کہہ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد ندیم بے چین ہو کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا کمرے کے دروازے تک گیا پھر واپس آیا دوبارہ چارپائی پر بیٹھ گیا نجمی کے اغواء نے اس کے اندر ایک ایسا طوفان برپا کر دیا تھا جس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔ سب سے پہلے یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ نجمی کو اغواء کرنے والا کون ہے یہ معلوم ہو جانے کے بعد ہی ندیم نجمی کی تلاش میں نکل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا تھا تو وہ صرف کرشنا ہی تھی۔ جس وقت لکھی بائی کو قتل کر کے نجمی کو اغواء کیا گیا اس وقت کرشنا بائی کوٹھے پر موجود تھی ویسے بھی چونکہ وہ اس دھندے میں عرصے سے زندگی بسر کر رہی تھی اس لیے اسے ایسے مشتبہ لوگوں کا ضرور معلوم ہوگا جو اس قتل اور اغواء میں ملوث ہو سکتے ہیں۔ اس امر کا یہی امکان تھا کہ کرشنا نے اغواء کرنے والوں کو دیکھا ہو۔ کرشنا سے ملنا ضروری ہو گیا تھا اب ندیم یہ غور کرنے لگا کہ وہ کرشنا سے ملاقات کرنے سوناگاچی کس بھیس، کس حلیئے میں جائے داڑھی اور سر کے بال تو پہلے ہی اس کے بڑھے ہوئے تھے۔ وہ سادھو کے بھیس میں بھی جا سکتا تھا لیکن ایک سادھو کو سوناگاچی ایسے بدنام علاقے میں دیکھ کر لوگوں کی نظریں خواہ مخواہ اس کی طرف اٹھ سکتی تھیں۔ نہیں نہیں ندیم نے سوچا اسے ایک عام بنگالی کے لباس میں جانا چاہیئے اسے انسپکٹر منجریکر کا ڈر تھا کیونکہ صرف اس کی زیرک نظریں ندیم کو پہلی نظر میں پہچان سکتی تھیں۔ باقی پولیس والے اتنی جلدی اسے داڑھی سر کے بڑھے ہوئے بالوں کے ساتھ شناخت نہیں کر سکتے تھے۔ سوناگاچی میں پولیس اور سی آئی ڈی کے آدمی ضرور پھیلے ہوئے ہوں گے لیکن ندیم کو ان کی اتنی زیادہ فکر نہیں تھی خطرہ اسے صرف

انسپکٹر منجریکر سے تھا اور اس کے بارے میں بھی اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ سوناگاچی کے علاقے میں موجود نہیں ہوگا۔

ندیم کو جبار سیٹھ نے اس کی امانت ایک ہزار روپے واپس دے دی تھی۔ جو ندیم نے اپنے پاس ہی چھپا کر رکھے تھے۔ اس کا لباس ایک پرانی پتلون اور بش شرٹ پر مشتمل تھا جو کافی خستہ حالت میں تھی۔ رات ندیم نے اس ادھیڑ بن میں گزار دی کہ کرشنا سے ملاقات کرنے اسے کب سوناگاچی جانا چاہیئے۔ اور وہ رات کو کیسے جائے گا۔ کیونکہ جبار سیٹھ تو باہر سے تالا لگا کر جاتا ہے۔ اس کا بھی ندیم نے ایک حل سوچ لیا۔ دوسرے روز بھی جبار سیٹھ صبح صبح آ گیا۔ وہ بڑا خوش تھا۔ آتے ہی ٹفن کیریئر چارپائی کے پاس رکھتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے خوشخبری لایا ہوں۔ کالیے نے تمہارے بارڈر کراس کرانے کا انتظام کر لیا ہے بس تم تیاری پکڑلو۔ پرسوں آدھی رات کو تمھیں میرے ساتھ یہاں سے نکل چلنا ہوگا۔"

ندیم کے ذہن میں نجمی کی سراغرسانی کا جو منصوبہ تھا اس کے بارے میں وہ جبار سیٹھ کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا لیکن اس نے اتنا ضرور کہا کہ چندا کے بغیر اُسے پاکستان واپس جانا عجیب سا لگتا ہے۔ سیٹھ فوراً بولا "بھائی تم پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو تم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے۔ پولیس نے اخباروں میں تمھاری تصویریں چھاپ رکھی ہیں۔ وہ تمھیں زندہ یا مردہ پکڑنے کے لیے جگہ جگہ چھاپے مار رہی ہے اور تم کو چندا کی فکر کھائے جا رہی ہے۔ برخوردار یہ موقع تمھیں پھر کبھی نہیں ملے گا۔ جیسے بھی ہو یہاں سے اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔ چندا برآمد ہو گئی تو میں اسے بھی بارڈر کراس کروا دوں گا۔"

ندیم نے اپنے لباس پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بنگالی لباس میں بارڈر کراس کروں۔ میں آپ کو پیسے دیتا ہوں میرے لیے دھوتی کرتا اور نئی چپل منگوا دیں۔"

سیٹھ جبار ندیم کے رضامند ہو جانے سے بڑا خوش تھا۔ اس کے سر پر سے ایک بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ جب سے ندیم اس کے پاس آیا تھا سیٹھ کی جان بھی عذاب میں تھی مگر دوست کی دوستی نبھانی بھی ضروری تھی۔ اس نے کہا "میں کل ہی تمھارے لیے بنگالی کپڑے لے آؤں گا۔ تم بالکل فکر نہ کرو۔

اور ہاں۔ وہ کمانی دار چاقو ....." مجھے واپس کر دو۔" اب تمھیں اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

ندیم چاقو واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نجمی کی تلاش میں نکلنے کے بعد ندیم کو اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اس نے کہا۔

"سیٹھ جی! ابھی تو میں یہیں ہوں۔ چاقو میرے پاس ہی رہنے دیں۔ جاتی دفعہ آپ کو دیتا جاؤں گا۔"

جبار سیٹھ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اب مسئلہ دروازے کو باہر سے تالا لگا کر جانے کا تھا۔

ندیم ناشتہ کرتے ہوئے یہی سوچ رہا تھا۔ سیٹھ جبار ناشتے کے علاوہ معمول کے مطابق دوپہر اور رات کا کھانا بھی ٹفن کیریئر میں بند کر کے لایا تھا۔ اس نے واقعی دلی جیل میں بند فقیر کی دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس گئے گزرے زمانے میں اس کی دوستی کی مثال قابل تقلید اور ہمیشہ زندہ رہنے والی تھی۔ ندیم نے موقع ملتے ہی کہا۔

"سیٹھ جی! یہ جو باہر سے آپ تالا لگا جاتے ہیں اس سے مجھے بہت زیادہ گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ لگتا ہے میں سچ مچ کہیں قید کر دیا گیا ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں آتا۔ بالکل ویران جگہ ہے۔ آپ دروازہ کھلا ہی رکھ جائیں تو کوئی قباحت نہیں ہو گی۔ ویسے بھی کبھی آدھی رات کے بعد باہر ذرا سی چہل قدمی کر لیا کروں گا۔"

جبار سیٹھ نے کچھ دیر غور کیا پھر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا " دن کے وقت گودام کے اس کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا مناسب نہیں۔ ایسا کرتا ہوں کہ ابھی تو میں باہر سے تالا لگا جاتا ہوں۔ رات دس بجے میں ڈرائیور کو بھیجوں گا وہ آ کر تالا کھول دے گا۔ تم باہر نکل کر ٹہل لینا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ تالا لگا کر واپس چلا جائے گا۔" یہ تجویز ندیم کے لیے کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں تھی اس نے مسکراتے ہوئے کہا "سیٹھ یہ تو قیدیوں کو ٹہلائی کروانے والی بات ہو گی۔ نہیں نہیں آپ بے شک تالا لگا دیا کریں۔" پھر اسکیم کے مطابق دوسرے لمحے بولا۔

"سیٹھ جی! مجھ پر آپ کے اتنے احسان ہیں کہ میں زندگی بھر ان کا بدلہ نہیں چکا سکتا لیکن اگر آپ ایسا انتظام کر دیں کہ یہ جو دو دن باقی رہ گئے ہیں ان میں ڈرائیور شام کو آ کر تالا کھول جایا کرے اور منہ اندھیرے آ کر دوبارہ لگا جایا کرے تو اس میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔

دراصل یہاں پڑے پڑے میری ٹانگیں درد کرنے لگی ہیں کہیں میں بیمار نہ پڑ جاؤں۔"

سیٹھ جبار نے اس تجویز کو منظور کر لیا اور حامی بھری کہ اس کا خاص ڈرائیور آج ہی شام اندھیرا ہونے کے بعد آ کر تالا کھول جائے گا اور رات کے پچھلے پہر واپس آ کر تالا پھر سے لگا دے گا۔

ندیم یہی چاہتا تھا۔ اب اس کے سامنے سوناگاچی میں کرشنا بائی کے کوٹھے تک راستہ کھلا تھا ندیم نے لکھی بائی کے قتل کی باتیں شروع کر دیں اور یہ پوچھا کہ یہ سوناگاچی میں مجرے کا دھندا کب تک جاری رہتا ہے۔ جبار سیٹھ نے ہنس کر کہا " ارے بھائی! سوناگاچی کا کیا پوچھتے ہو۔ وہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ ساری ساری رات بعض کوٹھوں پر مجرا جاری رہتا ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تمھارے لیے دھوتی، کرتا، چپل خریدنا ہیں اور ہاں میرا ڈرائیور آج ہی رات تالا کھولنے آئے گا تو تمھارے کپڑے اس کے ہاتھ بھجوا دوں گا۔ تمھارے سائز کا مجھے پتہ ہے۔"

ندیم نے سیٹھ جبار کو ہزار روپے میں سے دو سو روپے دینا چاہے تو سیٹھ نے ندیم کا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کہا۔

"جب پاکستان پہنچ جاؤ گے تو اس خوشی میں ان پیسوں کی مٹھائی اپنے دوستوں میں بانٹ دینا۔ تم لوگوں کو ابھی معلوم ہی نہیں ہے کہ ہمیں پاکستان سے کس قدر محبت ہے اور ہم اس کی سلامتی کے لیے کتنی دعائیں مانگتے ہیں۔"

ندیم کا دل وفور جذبات سے لبریز ہو گیا۔ جبار سیٹھ چلا گیا۔ ندیم سارا دن سوناگاچی جانے کی اسکیمیں بناتا رہا کہ وہ کس طرف سے جائے گا۔ کہاں سے اسے ٹیکسی پکڑنی ہو گی۔ ٹیکسی والے کو کیا کہے گا۔ سوناگاچی ندیم کے لیے اجنبی تھا۔ وہ ابھی تک کلکتے کے اس علاقے میں نہیں گیا تھا مگر یہ اتنا بدنام اور مشہور علاقہ تھا کہ کوئی بھی ٹیکسی والا اسے نام سنتے ہی وہاں پہنچا سکتا تھا۔ شام ہوئی تو ندیم نے نئی موم بتی روشن کر کے باتھ روم میں پڑی اینٹ پر جما دی اب اسے سیٹھ کے ڈرائیور کا انتظار تھا۔ ندیم نے گھڑی دیکھی۔ شام کے سات بجنے والے تھے۔ دروازے کی جھری میں سے اس نے باہر جھانک کر دیکھا ابھی باہر شام کی مدہم مدہم روشنی باقی تھی ٹھیک آٹھ بجے باہر سے تالا کھلنے کی آواز آئی۔ یہ ڈرائیور ہی تھا وہ اپنے ساتھ ایک پیکٹ بھی لایا

تھا۔ اس میں بادامی رنگ کے کھدر کا دھوتی کرتا اور ایک چپل بند تھی۔ ڈرائیور نے تالا اور چابی ندیم کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔

"بابو یہ تم اپنے پاس ہی رکھو۔ میں منہ اندھیرے واپس آ کر پھر سے تالا لگا جاؤں گا۔ بازار سے کچھ منگوانا تو نہیں؟"

یہاں ندیم کو یہ پوچھنے کا موقع مل گیا کہ وہاں سے بازار کتنی دور ہے اور یہ کلکتہ کا کونسا علاقہ ہے۔ ڈرائیور جانتا تھا کہ ندیم کو آس پاس کے علاقے سے باخبر کرنے میں کوئی نقصان نہیں ہے چنانچہ وہ بولا۔

"یہ کالی گھاٹ کا علاقہ ہے بابو، مگر یہ جگہ کالی گھاٹ کی بستی سے دور ہے۔ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر وہ سڑک ہے جو کالی گھاٹ بستی کو جاتی ہے۔ اس کے آگے ایک چوراہا آتا ہے جس کی ایک سڑک خضر پور جیٹی کی طرف ایک سڑک ٹالی گنج کی طرف اور ایک سڑک ڈلہوزی اسکوائر کی طرف جاتی ہے۔ وہاں سے میٹرو سینما کے قریب سے ہو کر ہم لوئر چیت پور روڈ کی طرف نکل جاتے ہیں۔ اگر تم نے سگریٹ، پان منگوانا ہو تو مجھے بتا دو۔ میرے پاس جیپ ہے جو میں نے یہاں سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی ہے۔"

ندیم جو معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا اسے مل گئی تھیں۔ سگریٹ کے چھ پیکٹ ابھی اس کے پاس محفوظ پڑے تھے اور پان وہ کھاتا نہیں تھا۔ اس نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ان کپڑوں کے لیے میری طرف سے سیٹھ صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا۔ ڈرائیور تالا اور چابی ندیم کے حوالے کر کے واپس چلا گیا۔ ندیم کو اس سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سونا گاچی کو وہاں سے کونسا راستہ جاتا ہے۔ وہ صرف قریبی سڑک کا حدود اربعہ معلوم کرنا چاہتا تھا اور وہ اس نے معلوم کر لیا تھا۔ ڈرائیور کے جاتے ہی اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور بنگالی دھوتی کرتا باندھ کر اپنے سراپا کو دیکھا۔ وہ بالکل بنگالی معلوم ہوتا تھا۔ باتھ روم میں جا کر اس نے ٹوٹے شیشے میں موم بتی اونچی کر کے اپنی شکل دیکھی۔ انگشت بھر بڑی بڑی داڑھی، ذرا ذرا تراشی ہوئی مونچھیں اور گردن تک گئے ہوئے لمبے بال۔ ندیم کو اپنے اوپر کسی بنگالی اسکول ٹیچر کا گمان ہوا۔ اس نے ایک بنگالی اسکول میں ایسا ہی اسکول ماسٹر دیکھا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ

اس نے چھتری کاندھے سے لٹکا رکھی تھی اور ندیم کے پاس چھتری نہیں تھی۔

ندیم کے پاس صرف آج، کل اور پرسوں کی رات تھی۔ اس سے اگلی رات کو سیٹھ جبار اسے وہاں سے نکال کر کالیے کے پاس لے جانے والا تھا جس نے اسے سرحد پار کروانی تھی۔ اگرچہ ندیم نجمی کے بغیر مشرقی پاکستان کسی صورت میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود اس کا کرشنا بائی سے ملنا از حد ضروری تھا کیونکہ تین راتوں کے بعد جب اس نے سیٹھ جبار سے کہہ دیا کہ وہ نجمی کے بغیر انڈیا کا بارڈر کراس نہیں کرے گا تو لازمی بات ہے کہ سیٹھ جبار اسے اپنے پاس رکھ کر مزید خطرہ مول لینے کو تیار نہیں ہوگا کیونکہ یہ اس کی ذمہ داری میں شامل نہیں تھا کہ وہ انڈیا میں ندیم کے مفادات کی حفاظت کرے۔ احمد خاں نے اسے یہی لکھا تھا کہ کسی طریقے سے ندیم کو بارڈر کراس کرا کے مشرقی پاکستان بھجوا دیا جائے اور اس کے لیے ہی جبار سیٹھ ساری تگ و دو کر رہا تھا۔ جب ندیم نے مشرقی پاکستان جانے سے انکار کر دیا تو پھر اس کا جبار سیٹھ کے پاس اور اس کے تحفظ میں رہنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔ ندیم نے فیصلہ کیا کہ اسے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے اور آج رات ہی سونا گاچی پہنچ کر کرشنا بائی سے ملاقات کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے کیونکہ جوں جوں وقت گزر رہا تھا ندیم کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی نجمی اس سے دور سے دور تر ہوتی جا رہی ہے۔ اس فیصلے کے ساتھ ہی ندیم کے اندر جیسے ایک نئی طاقت امڈ آئی اس کو احساس ہوا جیسے وہ ایک انتہائی اہم مشن کا آغاز کرنے والا ہے۔ تھرمس میں چائے موجود تھی۔ اس نے گلاس میں چائے ڈالی اور چائے پینے لگا۔ چائے ابھی تک گرم تھی۔ گرم گرم چائے نے ندیم کے سوچنے کی طاقت کو سہ چند کر دیا۔ اسی وقت رات کے سوا آٹھ بج رہے تھے۔ سونا گاچی کا علاقہ ساری رات جاگتا تھا۔ اس کے لیے رات بارہ بجے کا وقت موزوں رہے گا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں کرشنا بائی گانا بجانا بند کر کے چلی نہ گئی ہو۔ تو کیا وہ رات کے دس بجے جائے؟ اتنی جلدی جانا ٹھیک نہیں تھا۔ اس وقت پولیس وہاں ضرور موجود ہوگی اور وہ پولیس سے جس قدر ممکن ہو بچنا چاہتا تھا۔ آخر سوچ سوچ کر اس نے رات گیارہ بجے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ سرہانے کے نیچے سے ایک ہزار کے نوٹ ویسے کے ویسے پڑے تھے۔ ان میں زیادہ نوٹ سو سو کے تھے۔ ندیم نے چار نوٹ سو سو کے اور دو نوٹ پچاس پچاس کے نکال کر اپنی جیب

میں رکھ لیے اس کے ساتھ ہی کمانی دار چاقو بھی بند کر کے جیب میں ڈال لیا۔ کونے میں نسواری رنگ کا بڑا رومال پڑا تھا۔ اس میں ایک بار سیٹھ جبار کھانا باندھ کر لایا تھا اور پھر اسے وہیں بھول گیا تھا۔ ندیم نے رومال کو اٹھا کر جھاڑا اور اسے اپنے گلے میں لپیٹ لیا۔ اس رومال سے اس کا حلیہ مزید کسی حد تک بدل گیا تھا وہ سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا اور رات کے گیارہ بجنے کا انتظار کرنے لگا۔ گھڑی کی سوئیاں بڑی دھیمی رفتار سے چل رہی تھیں تو بجے ندیم نے ٹفن کیریئر میں سے تھوڑے سے چاول نکال کر کھائے۔ پھر تھرمس والی چائے گلاس میں ڈالی اور پینے لگا۔ چائے پی کر اس نے باتھ روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا رومال سے چہرہ پونچھا۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں ایک بار پھر اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ وہ پہلی نظر میں واقعی نہیں پہچانا جاتا تھا۔ باہر نکل کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ پیتے ہوئے غور کرنے لگا کہ کیا اتنی رات گئے اسے سڑک پر ٹیکسی مل جائے گی؟ کیوں نہیں ملے گی؟ یہ کوئی معمولی شہر نہیں ہے۔ انڈیا کا ایک بہت بڑا شہر ہے۔ یہاں تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی ٹیکسی ضرور مل جاتی ہو گی۔ جب گھڑی نے پورے گیارہ بجائے تو ندیم جلدی سے اٹھا۔ تالا چابی ہاتھ میں لی اپنے آپ کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اللہ کا نام لے کر دروازہ کھول کر باہر تازہ ہواؤں میں نکل آیا۔ اتنے دنوں کے بعد رات کی ٹھنڈی تازہ ہوائیں آنے سے اس کے دماغ پر بہت خوشگوار اثر پڑا اور وہ اپنے آپ کو آنے والی مشکلات کے مقابلے کے لیے تازہ دم محسوس کرنے لگا۔

کلکتے کا دھندلا آسمان ستاروں سے بھرا ہوا تھا۔ فضا میں اوس کی رطوبت رچی ہوئی تھی۔ کوئی پچاس قدموں کے فاصلے پر گودام کے کونے میں جو بلب جل رہا تھا اس کی روشنی صرف چند فٹ تک ہی محدود تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ گودام کی دیوار بہت اونچی تھی۔ ندیم نے جلدی سے دروازے کو تالا لگایا۔ چابی جیب میں ڈالی اور دل ہی دل میں خداوند کریم سے دعا مانگتا کچی پگڈنڈی پر اس طرف چل پڑا جدھر اسے فاصلے پر روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ روشنیاں کافی دور تھیں اور ضرور کالی گھاٹ کی آبادی کی روشنیاں ہی تھیں۔ جس کچی پگڈنڈی پر وہ چلا جا رہا تھا وہ سکریپ اور کاٹھ کباڑ کے اونچے ڈھیروں میں سے گزرتی تھی آگے بانس کا ایک چھوٹا سا پل آ گیا۔ اس پل کے نیچے نالہ بہہ رہا تھا جس کا پانی اندھیرے کی وجہ سے ندیم کو نظر نہ آیا۔

پل کے آگے ایک بنجر میدان تھا۔ یہاں کٹی ہوئی لکڑیوں اور بانس کے ڈھیر پڑے تھے۔ ندیم تیز تیز چلتا یہاں سے بھی گزر گیا۔ وہ بارہ بجے رات سے پہلے پہلے سوناگاچی پہنچ جانا چاہتا تھا۔ وہ ایک کچی سڑک پر آ گیا جس کی ایک جانب پانی کھڑا تھا اور جھینگر بول رہے تھے۔ یہاں بجلی کا ایک بھی کھمبا نہیں تھا جس کی وجہ سے اندھیرا تھا۔ مگر ستاروں کی دھندلی روشنی میں سڑک دکھائی دے رہی تھی۔ ندیم کی نگاہ دور کالی گھاٹ والی آبادی کی روشنیوں پر لگی تھی۔ یہ راستہ ایک کھلی پکی سڑک سے جا کر مل گیا۔ یہاں درختوں کے بیچ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے بلب روشن تھے۔ ایک ٹرک شور مچاتا گزر گیا۔ ندیم کو امید تھی کہ یہاں کوئی نہ کوئی آتی جاتی ٹیکسی اسے ضرور مل جائے گی۔ مگر وہ کسی جگہ رکے بغیر کالی گھاٹ کی طرف چلتا گیا۔ ندیم کو اب اتنی بنگلہ زبان آ گئی تھی کہ وہ دوسروں کو اپنا مطلب سمجھا سکتا تھا۔ پیچھے سے کسی گاڑی کی روشنیاں نظر آئیں تو ندیم کھڑے ہو کر اسے ہاتھ کا اشارہ کرنے لگا کہ شاید لفٹ مل جائے یہ بھی کوئی مال سے لدا ہوا ٹرک تھا۔ جو تیزی سے گزر گیا۔ ندیم پھر آگے چلنے لگا۔ آگے ایک چوک آ گیا جس کے وسط میں بڑے کھمبے پر چار بتیاں روشن تھیں۔ جو سڑک کالی گھاٹ والی روشنیوں کی طرف جاتی تھی ندیم اس سڑک پر آ گیا وہ دو قدم ہی چلا ہو گا کہ اسے اپنے پیچھے گاڑی کے انجن کی آواز سنائی دی۔ یہ خالی ٹیکسی تھی کیونکہ اس کی چھت پر لگا سرخ بلب روشن تھا۔ ندیم سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر زور زور سے بازو ہلانے لگا۔ گاڑی قریب آ کر رک گئی۔ یہ خالی ٹیکسی ہی تھی اور اسے ایک سکھ ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس نے سر باہر نکال کر خفگی سے کہا۔ ”اوئے وچکار کھلوتا ایں مرنا ایں بد دیا پترا۔“ ندیم نے قریب آ کر اردو میں کہا ”سردار جی مجھے سوناگاچی لے چلو بڑا ضروری کام ہے“ سکھ نے ہنس کر کہا ”اوئے ہم کو معلوم ہے تمھیں کیا ضروری کام ہے۔ پر میں سو روپیہ لوں گا۔“ ندیم نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر سکھ ڈرائیور کی طرف بڑھایا اور کہا ”یہ لو سو روپیہ سردار جی بس جلدی سے مجھے سوناگاچی پہنچا دو میرا بھائی وہاں کھو کھا لگاتا ہے۔ وہ بہت بیمار ہے۔“ سکھ ڈرائیور نے سو روپے لے کر صدری کی جیب میں رکھا اور کہا ”بہہ جا اوئے اندر“ ندیم دروازہ کھول کر پچھلی نشست پر ذرا نیچے ہو کر بیٹھ گیا اور ٹیکسی چل پڑی۔ کلکتے میں ٹیکسی ڈرائیور عام طور پر سکھ ہی ہوتے ہیں

برمی ڈرائیوروں کی طرح یہ بھی تیز رفتاری میں بہت بدنام ہیں۔ جب ندیم نے اسے بتایا کہ اس کے بڑے بھائی کی حالت ٹھیک نہیں اور جلد اس کے پاس پہنچنا چاہتا ہے تو سکھ ڈرائیور نے رفتار مزید تیز کر دی۔ ویسے بھی آدھی رات کے وقت سڑک خالی تھی چنانچہ منٹوں کے بعد ٹیکسی کالی گھاٹ میں سے گزر رہی تھی۔ یہاں سے نکل کر گاڑی شہر کی روشن کشادہ مگر خالی سڑکوں پر آ گئی۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس علاقے میں سے گزر رہا ہے۔ سکھ ڈرائیور نے شاید پی رکھی تھی۔ وہ گاڑی بھی چلا رہا تھا اور اپنے آپ سے پنجابی میں باتیں کر رہا تھا۔ ٹیکسی اتنی تیز رفتار پہ جا رہی تھی کہ اس کا انجر پنجر کھڑکھڑا رہا تھا۔ ندیم ڈرنے لگا کہ کہیں گاڑی الٹ ہی نہ جائے۔ اس نے اونچی آواز میں ڈرائیور کو رفتار کم کرنے کے لیے کہا۔ سکھ ڈرائیور نے درشتگی سے کہا "بھن کج نہیں ہو سکدا بادشاہو، گڈی میرے ہتھوں نکل چکی اے۔"

ندیم تو دھک سے رہ گیا کہیں گاڑی کے بریک تو فیل نہیں ہو گئے مگر ایسی بات نہیں تھی۔ سڑک کا موڑ کاٹتے ہوئے ڈرائیور نے باقاعدہ بریکوں کا استعمال کیا۔ ایک چیخ کے ساتھ گاڑی گھوم گئی۔ ندیم سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور دل میں خدا سے دعائیں مانگنے لگا۔ گاڑی ایک اونچی روشن عمارتوں والے نسبتاً گنجان علاقے میں داخل ہو چکی تھی جہاں کبھی کبھی کوئی گاڑی یا وکٹوریہ آتے جاتے مل جاتی تھی۔ ٹیکسی کی رفتار کافی کم ہو گئی۔ ندیم نے ایک آدمی کو اس طرح گاڑی میں سوار ہوتے دیکھا کہ وہ لڑکھڑا رہا تھا اور دو آدمی سہارا دے کر اسے گاڑی میں ڈال رہے تھے۔ ندیم سمجھ گیا کہ سوناگاچی یعنی کلکتے کی ہیرا منڈی کا علاقہ شروع ہو چکا ہے۔ ایک مکان میں اسے ہارمونیم کی آواز سنائی دی۔ سکھ ڈرائیور نے ٹیکسی ایک ایسے بازار میں داخل کرنے کے بعد بجلی کے کھمبے کے پاس روک دی جس کی دو منزلہ عمارت میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور بازار میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے اور کچھ پان، سگریٹ کے کھوکھے بھی روشن تھے جہاں سے اونچے سنگیت کی ریڈیائی گیتوں کی لہریں بلند ہو رہی تھیں۔ کوٹھوں سے ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ اور گھنگروؤں کے دھیمے دھیمے چھناکے بھی سنائی دے رہے تھے۔ سکھ ڈرائیور نے گردن پیچھے گھما کر کہا:

"آ گیا تمہارا سوناگاچی بابو جی۔ اتر جا تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

ندیم نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ خیریت سے زندہ سلامت اپنی منزل پر پہنچ گیا تھا۔ ٹیکسی

سے نکل کر وہ ایک پان سگریٹ کے کھوکھے کی طرف بڑھا۔ اس کے عین سامنے ایک جگمگاتی دکان میں سنگیلہ گانے لگے تھے اور کچھ لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ پان سگریٹ کے کھوکھے پر بھی دو چار آدمی کھڑے سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اگرچہ وہاں پولیس کا کوئی آدمی نہیں تھا پھر بھی ندیم نے قریب جانا مناسب نہ سمجھا اور ایک گلی میں داخل ہو گیا۔ یہ گلی بھی ہمارے ہاں کی کسی پکی سڑک جتنی کشادہ تھی مگر چونکہ ادھر فلیٹوں کے پچھواڑے لگتے تھے اس لیے سنسان تھی اور جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر لگے تھے۔ کلکتہ میں جو گلیاں اونچی رہائشی عمارتوں کے عقب میں واقع ہوتی ہیں۔ انھیں کچرا گلی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ لوگ مکانوں کی پچھلی کھڑکیوں سے ادھر کوڑا کرکٹ پھینک دیتے ہیں۔ جسے کارپوریشن کے بڑے بڑے ٹرک مقررہ وقت پر آ کر اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ندیم کوڑے کرکٹ کے درمیان سے گزر کر سڑک کی دوسری جانب نکل آیا۔ یہاں بھی کہیں کہیں چوباروں سے گانے بجانے اور مجرے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ندیم کی نظر ایک چھوٹی سی دکان پر پڑی یہ بھی پان، سگریٹ اور سوڈا واٹر کی دکان تھی جس کے آگے رسی سے ایک بلب روشن تھا اور دکاندار گدی پہ بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ وہاں کوئی گاہک نہیں تھا۔ ندیم لپک کر وہاں گیا اور جیب سے پچاس روپے کا نوٹ نکال کر کریون اے کے سگریٹ کا پیکٹ طلب کیا۔ بنگالی دکاندار نے سگریٹ ندیم کی طرف بڑھائے نوٹ لے کر ڈبے میں رکھا اور ریزگاری نکالنے لگا۔ ندیم نے سگریٹ نکال کر پوچھا کہ یہاں کرشنا بائی کا چوبارہ کہاں ہے؟ بنگالی دکاندار نے ایک قریبی فلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ سامنے والا کوٹھا ہے کرشنا بائی کا مگر اب تو وہ دھندا سمیٹ چکی ہو گی۔ لکھی بائی کے قتل کے بعد وہ جلدی کوٹھا بند کر دیتی ہے۔" ندیم نے ریزگاری لے کر جیب میں رکھی اور کرشنا بائی کے چوبارے کی طرف چلا جہاں ابھی تک روشنی ہو رہی تھی۔ یہ چوبارہ بلڈنگ کی دوسری منزل کا ایک فلیٹ تھا۔ نیچے سیڑھیوں میں ایک غنڈہ ٹائپ آدمی دیوار سے ٹیک لگائے سگریٹ پی رہا تھا۔ اس نے ندیم کو آگے بڑھتا دیکھا تو دیوار سے ٹیک ہٹا دی اور ندیم کے قریب آ کر کرخت لہجے میں پوچھا "کدھر جا رہے ہو بابو۔؟"

٭ ٭ ٭

ندیم کرشنا بائی کے کوٹھے کی سیڑھیوں کے پاس رک گیا۔ غنڈہ ٹائپ بنگالی اس کے قریب آ گیا۔ سگریٹ کی راکھ چٹکی سے جھاڑتے ہوئے طنزیہ ہنسی کے ساتھ بولا۔ ”ارے اوپر کدھر جاتا ہے دادا۔ چندا بائی کو تو ڈاکو لے گئے۔“ ندیم نے جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر اسے کھول کر بند کیا اور غنڈے کی طرف جھک کر رازداری سے کہا۔

”کرشنا بائی سے پگار لینے جا رہا ہوں دادا۔“

بنگالی غنڈہ جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ندیم ویسے بھی ڈیل ڈول میں اس سے دوگنا تھا۔ فوراً لہجے میں انکساری پیدا کرتے ہوئے بولا۔

”کرشنا بائی دھندا ختم کر چکی ہے۔ مگر وہ ابھی اوپر اپنے کوٹھے پر ہی ہے۔“

یہ کہہ کر غنڈہ بنگالی وہاں سے چل دیا۔ ندیم نے چاقو جیب میں رکھا اور جلدی سے سیڑھیوں میں آ گیا۔ پہلی منزل کے دروازے پر تالا لگا تھا۔ سیڑھیوں میں ایک ہلکی روشنی والا بلب جل رہا تھا۔ اوپر والی منزل کا دروازہ بھی بند تھا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ندیم نے دروازے کی درز میں سے جھانک کر دیکھا۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ چاندنی کا فرش بچھا تھا جس پر موتیے اور گلاب کے پھولوں کی پتیاں ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ ایک بوڑھا بنگالی چادر میں ہارمونیم لپیٹ رہا تھا۔ سرخ بھڑکیلی ساڑھی میں ملبوس ایک نوجوان خوبصورت بنگالی عورت چھوٹے سے تخت پہ بیٹھی اپنے پاؤں سے گھنگھرو اتار رہی تھی۔ ایک گھنگھرو اس نے اتار کر تخت پر رکھا ہوا تھا۔ دوسرا گھنگھرو بھی اتار کر اس نے تخت پر رکھ دیا اور ایک جمائی لے کر بنگلہ میں بوڑھے بنگالی سے کچھ کہا بوڑھے بنگالی نے جواب میں کچھ کہا اور ہارمونیم کی پیٹی کونے میں لگا دی۔ پھر گاؤ تکیے اٹھا کر کونے

میں رکھنے لگا جہاں پہلے ہی سے کچھ تکیے اور اگالدان پڑے تھے۔ اب ندیم نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ خوبصورت عورت نے جو یقیناً نجمی کی سہیلی اور راز دار کرشنا دیوی ہی تھی بے نیازی سے دروازے کی طرف دیکھا اور بوڑھے سے ایک بار پھر بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔ بوڑھا دروازے کی طرف آیا۔ ندیم پیچھے ہٹ گیا۔ بوڑھے نے دروازے کو ذرا سا کھول کر ندیم کو دیکھا اور ہندوستانی میں کہا کہ۔

”مجرا بند ہو گیا ہے کل آنا۔“ ندیم سنی ان سنی کرتے ہوئے دروازہ کھول کر بیٹھک میں آ گیا۔ اسے یوں بے دھڑک اندر آتے دیکھ کر کرشنا بائی سہم سی گئی۔ لکھی بائی کے خون اور نجمی یعنی چندا بائی کے اغوا کے بعد وہاں پہلے ہی سے خوف و دہشت کے سائے منڈلا رہے تھے ۔ ندیم کو صورتحال کی سنگینی کا پورا علم تھا۔ وہ تیزی سے قدم اٹھاتا کرشنا بائی کے پاس گیا اور کہنے لگا۔

”میں ندیم ہوں کرشنا! چندا دیوی کا دوست!“

کرشنا بائی نے یہ سنا تو جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ندیم کو غور سے دیکھا۔ پھر بوڑھے بنگالی سے بنگلہ میں کچھ کہا جس پر بوڑھا سر کو لٹکائے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والی منزل میں چلا گیا۔ کرشنا بائی نے دروازے کی کنڈی لگا دی اور ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”مجھے کیسے یقین آئے کہ تم ہی میری سہیلی چندا کے دوست ندیم ہو؟ کیا تم مجھے چندا کا اصلی نام بتا سکتے ہو؟“

جب ندیم نے اسے چندا کا اصلی نام نجمی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کس طرح وہ دونوں لاہور میں پڑھا کرتے تھے اور پھر کس طرح ان کی بدقسمتی کا آغاز ہوا اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ گئے۔ ندیم نے کرشنا کو یہ نہ بتایا کہ وہ کلکتہ میں کس جگہ چھپا ہوا ہے۔ مگر باقی سب کچھ بتا دیا اور کہا کہ وہ کرشنا سے صرف یہ پوچھنے آیا ہے کہ اس کے خیال میں نجمی کو ڈاکو مان سنگھ نے ہی اغوا کیا ہے؟ کرشنا بائی اب بھی کچھ بتاتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ تب ندیم نے کہا۔

”کرشنا! تم مجھ پر کسی قسم کا شک مت کرو۔ مجھے نجمی یعنی چندا بائی ایک بار ملی تھی اور اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم اس کی رازدار سہیلی ہو اور اگر اس کے بارے میں کبھی کچھ معلوم کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو میں کرشنا بائی کے پاس ہی جاؤں۔“

چندا یعنی نجمی نے کرشنا بائی کو ندیم کا جو حلیہ بتایا تھا وہ نووارد نوجوان پر بالکل ٹھیک بیٹھتا تھا۔

جب کرشنا کو پکا یقین ہو گیا کہ یہی ندیم ہے تو اس نے اداس لہجے میں کہا۔

"یہ قتل ڈاکو مان سنگھ نے ہی کیے تھے اور وہی چندا کو بھی اغوا کر کے لے گیا ہے۔ میں مان سنگھ ڈاکو کو شکل سے پہچانتی ہوں۔ وہ جوگی کے بھیس میں لکھی بائی کے پاس دریائے ہگلی والی کوٹھی میں رات کو آیا کرتا تھا۔"

ندیم نے پوچھا "تمہارے خیال میں مان سنگھ ڈکیٹ، نجمی کو اغوا کرنے کے بعد کہاں لے گیا ہو گا۔؟"

کرشنا بائی ایک لمحے کے لیے جیسے کچھ سوچنے لگی۔ پھر ندیم کی طرف دیکھ کر بولی۔

"مجھے اس کے اڈے کا تو کچھ پتا نہیں پر لکھی بائی سے ایک بار سنا تھا کہ کاکسز بازار کے جنگل میں درگا دیوی کی باؤلی ہے۔ مان سنگھ کا باؤلی کے پاس کسی ٹیلے میں خفیہ ٹھکانا ہے۔ مگر تم وہاں مت جانا۔ مان سنگھ کے ساتھی بڑے خونی ہیں۔ ادھر کوئی بھولا بھٹکا مسافر بھی چلا جائے تو وہ اسے زندہ نہیں چھوڑتے۔"

ندیم خود بھی کرشنا بائی پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ نجمی کی تلاش میں جائے گا۔ آہ بھر کر بولا۔

"کرشنا! میں نجمی کے پیچھے کیسے جا سکتا ہوں۔ پولیس خود میری تلاش میں ہے اور میں شہر کے کونے کھدروں میں چھپتا پھرتا ہوں۔ اچھا اگر خدا کو منظور ہوا تو کبھی نجمی سے ملاقات ہو جائے گی۔ اب میں چلتا ہوں۔"

کرشنا بائی ندیم کے قریب آ گئی اور کہنے لگی۔

"چندا بڑی بدنصیب ہے اس نے بڑے کشٹ اٹھائے ہیں اور ابھی تک دکھ جھیل رہی ہے۔ اگر چندا ڈاکوؤں کے جنگل سے فرار ہو کر یہاں آنے میں کامیاب ہو گئی تو میں تمہیں یہی کہوں گی کہ تم اسے یہاں سے نکال کر مشرقی پاکستان لے جاؤ۔ یہاں وہ زیادہ دیر زندہ نہ رہ سکے گی۔"

ندیم نے کرشنا بائی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر کہا۔

"کرشنا! میں کبھی کبھی تمہیں رات کے وقت یہاں آ کر ملتا رہوں گا۔ اگر نجمی کسی طرح یہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو مجھے ضرور بتا دینا پھر میں اسے یہاں سے نکال کر لے جاؤں گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا۔"

ندیم نے کرشنا کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر دروازے پر آ کر رکا۔ سر باہر نکال کر بازار کا جائزہ لیا۔ آدھی رات کے گزر جانے پر بھی کہیں کہیں کوٹھوں سے گھنگھروؤں کی جھنکار اور گانے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن بازار تقریباً سنسان تھا۔ ندیم بازار میں آ کر مکانوں کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا دوسرے بازار میں نکل آیا۔ یہاں کونے والی سگریٹوں کی دکان کے پاس کچھ لوگ کھڑے آپس میں ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ ندیم ان سے کچھ فاصلے پر تیز تیز گزر گیا۔ وہ سونا گاچی کے علاقے سے باہر آیا تو ایک ٹیکسی اس کے قریب سے گزری۔ ندیم نے زور سے آواز دی تو ٹیکسی کچھ دور جا کر رکی پھر الٹی چلتی اس کے قریب آ گئی۔ ندیم اس کے اندر گھس گیا اور ڈرائیور کو اس علاقے کا نام بتایا جس کا شمار کلکتہ شہر کے مضافات میں ہوتا تھا اور جہاں ایک بوسیدہ مال گودام کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں امجدیہ ہوٹل والے سیٹھ جبار نے اسے چھپا کر رکھا ہوا تھا۔ ٹیکسی پون گھنٹے کے بعد کلکتہ کے سنسان بازاروں سے گزرتی مضافات سے تھوڑی دور اس علاقے میں پہنچ کر رک گئی جس کا نام ندیم نے ڈرائیور کو بتایا تھا۔ یہاں ندیم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور رات کے اندھیرے اور خاموشی میں مال گودام کی طرف روانہ ہو گیا۔ کوٹھڑی کو وہ تالا لگا گیا تھا۔ وہ تالا کھول کر کوٹھڑی میں آ گیا۔ اور چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ بات تو طے تھی کہ وہ نجمی کی تلاش میں کاکسز بازار والے جنگل کی طرف روانہ ہو جائے گا اور سیٹھ جبار کے آدمی کالیے کے ساتھ انڈیا کا بارڈر کر اس کر کے مشرقی پاکستان میں داخل نہیں ہو گا۔ وہ نجمی کے بغیر مشرقی پاکستان کیسے جا سکتا تھا۔ وہ نجمی کو درندوں کے گڑھ سے نکال کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

یہ اس کی زندگی کا اب سب سے بڑا مقصد تھا اور اس نے اس مقصد میں کامیاب ہونے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ دو دن بعد جبار علی سیٹھ نے ندیم کو اپنے آدمی کالیے کے ساتھ مشرقی پاکستان پہنچانا تھا جس کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ندیم نے نجمی کے پیچھے ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ اور خطرناک کمین گاہ پر جا کر وہاں سے نجمی کو نکالنے کا عہد کیا ہوا تھا۔ ندیم چارپائی پر لیٹ گیا۔ نجمی کس حالت میں ہو گی؟ یہ سوچ سوچ کر اس کا ذہن لاوے کی طرح ابل رہا تھا۔ پھر نہ جانے کس وقت اسے نیند آ گئی آنکھ اس وقت کھلی جب باہر کوئی دروازے پر آہستہ آہستہ ٹھک ٹھک کر رہا تھا۔ یہ سیٹھ جبار کا ڈرائیور وعدے کے مطابق دن کے وقت کوٹھڑی کے باہر تالا لگانے اور ناشتہ دے کر

آیا تھا۔ ندیم نے بند دروازے کی درز میں سے سیٹھ جبار کے ڈرائیور کو دیکھا اور دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور کے ہاتھ میں گٹھڑی تھی جس میں کھانا وغیرہ بندھا ہوا تھا اس نے آتے ہی ندیم سے تالا اور چابی لے لی اور پوچھا رات کوئی اِدھر آیا تو نہیں؟ ندیم نے کہا کہ کوئی نہیں آیا۔ بس میں تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل کر ٹہلا تھا۔ ڈرائیور نے بتایا کہ سیٹھ آج رات آئے گا۔ ڈرائیور باہر سے کوٹھڑی کو تالا لگا کر چلا گیا۔ سارا دن ندیم نے تنگ و تاریک کوٹھڑی کے اندر ہی گزار دیا۔ اسے سیٹھ جبار کا انتظار تھا وہ اسے صاف صاف بتا دینا چاہتا تھا کہ جب تک وہ نجمی کو ڈاکوؤں کے چنگل سے برآمد نہیں کرلے گا بارڈر کراس نہیں کرے گا۔ ندیم سیٹھ جبار کو بتائے بغیر وہاں سے نجمی کی تلاش میں نکلنا نہیں چاہتا تھا۔ رات کو سیٹھ جبار آیا تو وہ کچھ فکرمند سا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ندیم کے لیے سگریٹ کے چار پیکٹ اور چائے سے بھری ہوئی تھرمس بھی لایا تھا۔ اس نے تھرمس میں سے چائے نکال کر گلاسوں میں ڈالی اور پھر کسی قدر تشویش کے ساتھ کہنے لگا۔

"پولیس تمھاری تلاش میں میرے ہوٹل میں آج آئی تھی۔ مجھے لگتا ہے کسی نے مخبری کر دی ہے لیکن تم مطمئن رہو۔ اول تو پولیس کو میرے ہاں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ دوسرے میں نے اوپر مل لیا ہے۔"

ندیم خاموشی سے چائے پیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ سیٹھ جبار نے خود ہی اس کی مشکل حل کر دی۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں لیے ندیم کی طرف دیکھ کر بولا۔

"ویسے اب ایک رات کی بات ہے۔ پرسوں منہ اندھیرے کالیا تمھیں یہاں سے لے جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ندیم موم بتی کی طرف دیکھ رہا تھا جو قریب ہی غسل خانے کے اندر رکھی ہوئی اینٹ پر جل رہی تھی۔ چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد اس نے سیٹھ جبار کی طرف دیکھے بغیر آہستہ سے کہا کہ وہ بارڈر کراس نہیں کرے گا۔ سیٹھ جبار نے چونک کر ندیم کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر ناراضگی کے تاثرات تھے۔

"کیوں؟ بارڈر کراس نہیں کرو گے تو کہاں جاؤ گے۔ اس جگہ اب تم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ پولیس تو شکاری کتوں کی طرح تمھاری بو سونگھتی پھر رہی ہے۔" ندیم نے چائے کا گلاس زمین پر رکھ دیا۔

"سیٹھ جی! چندا کو ڈاکو مان سنگھ اغوا کر کے لے گیا ہے اور میں چندا کے بغیر بارڈر کراس نہیں کر سکتا۔"

سیٹھ جبار کو غصہ آگیا بولا "تم احمق ہو۔ بیوقوف ہو۔ اگر تمھاری چندا کو مان سنگھ لے گیا ہے تو تم کیا کر لو گے؟ جانتے ہو مان سنگھ نے کتنے خون کیے ہیں؟ وہ انسان نہیں درندہ ہے۔ آدم خور ہے۔ تم اس کے قبضے سے اپنی چندا کو قیامت تک نہیں چھڑا سکو گے۔" ندیم نے کہا "چاہے میری جان چلی جائے مگر میں چندا کو مان سنگھ کے چنگل سے چھڑا کر ہی دم لوں گا۔" سیٹھ جبار نے ایک گہرا سانس بھرا اور بولا۔

"دیکھو میاں! مجھ پر میرے دوست نے جو ذمہ داری ڈالی ہے میں اسے ہر حالت میں نبھاؤں گا۔ میں یار کی یاری نبھا رہا ہوں۔ اس نے مجھے لکھا ہے کہ میں تمھیں بارڈر پار کرا دوں اور اس کا میں نے بندوبست کر لیا ہے۔ باقی اگر تم اپنی چندا کی تلاش میں جانا چاہتے ہو تو ایسا تم اپنی ذمہ داری پر کرو گے اور میں اس سلسلے میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا ہاں تم سے اتنا وعدہ ضرور لوں گا کہ اگر تم پکڑے گئے تو پولیس کے آگے میرا نام مت لینا۔"

ندیم نے سیٹھ جبار کی طرف احسان مند نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"سیٹھ جی! میں محسن کش نہیں ہوں۔ اگر ایسی گھڑی آگئی تو مر جاؤں گا پر آپ کا نام زبان پر نہیں لاؤں گا۔"

سیٹھ جبار نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بڑی شفقت کے ساتھ کہا۔

"میرے عزیز تم نادان ہو۔ مان سنگھ ڈاکو اور اس کے گروہ کو نہیں جانتے۔ یہ بھارت کا سب سے درندہ صفت ڈاکو ہے۔ مدھیہ پردیش میں کئی خون کر چکا ہے اور اب کچھ عرصے سے بنگال میں قتل و غارت گری کر رہا ہے۔ پولیس بھی اس سے ڈرتی ہے۔ بڑے سے بڑا جی دار انسپکٹر پولیس بھی مان سنگھ کی کمین گاہ کے قریب پھٹکنے کی جرأت نہیں کرتا۔ چندا کو اس کے حال پہ چھوڑ دو۔ اسی میں تمھاری بھلائی ہے۔ تم کالیے کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔ یہاں تمھاری زندگی بھی شدید خطرے میں ہے۔ تم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے اور بھارتی پولیس نے تمھیں ایک بار پکڑ لیا تو پھر تمھاری موت یقینی ہے۔"

ندیم خاموشی سے سیٹھ جبار کی باتیں سنتا رہا۔ جب سیٹھ نے اپنی بات ختم کی تو ندیم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "سیٹھ جی! میں مجبور ہوں میں چندا کی تلاش میں ضرور جاؤں گا اور خدا نے

چاہا تو اسے ظالموں کے پنجے سے نکال لاؤں گا۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔" سیٹھ جبار، ندیم کا منہ تکنے لگا۔ زمین پر سے چائے کا گلاس اٹھا کر دو گھونٹ پیئے، گلاس زمین پر رکھا۔ کر لونۓ کا سگریٹ سلگا کر ایک کش لگایا اور کہا۔

"اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم مان سنگھ کی تلاش میں کہاں جاؤ گے؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس کی خفیہ کمین گاہ کہاں پر ہے؟"

ندیم نے کہا "میں نے ایک بار سنا تھا کہ وہ کاکسز بازار کے قریب کسی جنگل میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رہتا ہے۔"

سیٹھ جبار مسکرا دیا۔ بولا "یہ تمھیں کس احمق نے بتا دیا؟ کاکسز بازار تو مشرقی پاکستان میں ہے۔ ڈاکو مان سنگھ وہاں رہ کر کلکتہ وارداتیں کرنے کیسے آ سکتا ہے۔"

ندیم نے سوچا کہ سیٹھ جبار ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کاکسز بازار تو مشرقی پاکستان میں واقع ہے۔ اس نے سیٹھ جبار سے پوچھا کیا آپ کو اس ڈاکو کے ٹھکانے کا کچھ پتہ ہے؟ سیٹھ جبار نے سگریٹ کے ساتھ دوسرا سگریٹ سلگانے کے بعد کہا۔

"میری اطلاع کے مطابق ڈاکو مان سنگھ اپنے گروہ کے ساتھ کلکتہ شہر کے جنوب مشرق میں ساٹھ ستر میل کے فاصلے پر جل دھارا جنگل کے اندر ایک ٹیلے کی گھاٹی میں کسی جگہ رہتا ہے۔ مگر یہ سارے کا سارا راستہ بے حد دشوار گزار ہے اور پھر وہاں جگہ جگہ جنگلی درندے رہتے ہیں۔ ایک تو تم نہتے ہو۔ پھر اکیلے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تم وہاں تک پہنچ نہیں سکو گے۔ اگر کسی طرح پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو مان سنگھ کے آدمیوں کے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گے۔ میں اب بھی تمھیں یہی مشورہ دوں گا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو اور اپنی جان بچا کر مشرقی پاکستان چلے جاؤ۔"

ندیم کچھ اور ہی سوچ رہا تھا اس نے کہا۔

"کیا آپ مجھ پر ایک مہربانی کر سکتے ہیں؟"

سیٹھ جبار، ندیم کی طرف دیکھنے لگا۔ ندیم نے سرہانے کے نیچے سے سو سو کے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس رقم کے عوض کوئی پرانا پستول اور کچھ گولیاں لا کر دے دیجئے میں آپ کا یہ احسان

بھی ساری زندگی فراموش نہیں کروں گا۔"

سیٹھ جبار نے ندیم کے نوٹوں والے ہاتھ کو پیچھے کر دیا اور کہا۔

"تمھیں پستول اور گولیاں چاہئیں۔ وہ تمھیں مل جائیں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ خودکشی کی اس مہم پر کب روانہ ہونا چاہتے ہو۔؟"

یہ خودکشی کی مہم ہی تھی لیکن ندیم کے سینے میں اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے اور نجمی کو ایک بار پھر زندگی کی مقدس راہوں پر گامزن کرنے کا جذبہ موجزن تھا اُسے اپنے اس پاکیزہ جذبے اور خدا کی ذات پر مکمل بھروسہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ موت کے منہ میں ہاتھ ڈال کر بھی نجمی کو نکال لائے گا اور پھر اسے مشرقی پاکستان اپنے ساتھ لے جانے کے لیے ضرور قائل کر لے گا۔

اس نے کہا۔

"میں آج رات ہی نکل جانا چاہتا ہوں لیکن مجھے کچھ ضروری چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو میرے پاس ایک پستول کا اور گولیوں کا ہونا ضروری ہے دوسرے میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے میرے سائز کی کوئی گہرے رنگ کی پرانی سی پتلون اور ربڑ کے جوتے اور ایک پرانی چمڑے کی جیکٹ لا دیں یہ کھدر کے کپڑے جنگل اس ایک خطرناک مہم میں زیادہ دیر تک میرا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔"

سیٹھ جبار نے سگریٹ کی راکھ کو جھاڑتے ہوئے کہا۔

"ان چیزوں کا بندوبست ہو جائے گا لیکن ان چیزوں سے زیادہ تمھیں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم اپنے آپ کو پولیس اور سی آئی ڈی کے آدمیوں سے محفوظ رکھو۔ پولیس تمھاری کھوج میں لگی ہے تمھیں اپنے آپ کو پولیس کی نظروں سے بچاتے ہوئے جل دھارا کے خطرناک جنگلوں میں داخل ہونا ہو گا۔ اس کے بعد تمھارا سامنا ایک ایسے خونی ڈکیٹ سے ہو گا جو گولی پہلے چلاتا ہے اور بات بعد میں کرتا ہے۔"

ندیم نے کہا "سیٹھ جی! قبر میں جو رات آنی ہے اس کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ اگر میری موت ڈاکو مان سنگھ کے ہاتھوں لکھی ہوئی ہے تو اسے نہ آپ روک سکتے ہیں نہ میں روک سکتا ہوں۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ڈاکو مان سنگھ کا باپ بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ آپ مجھے اتنا ضرور گائیڈ کر دیں گے کہ مجھے جل دھارا کے جنگل میں پہنچنے کے لیے کونسا راستہ اختیار کرنا ہو گا۔"

سیٹھ جبار نے سگریٹ بجھا کر غسل خانے میں پھینکا اور اپنی پشمینے کی کشمیری فرد گردن کے گرد لپیٹتے ہوئے بولا۔

"یہ میں تمھیں کل بتاؤں گا۔ میں کل شام کا اندھیرا ہوتے ہی آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔"

سیٹھ جبار چلا گیا تو ندیم نے تھرمس میں سے مزید چائے گلاس میں ڈال کر پی اور سگریٹ سلگا کر سوچنے لگا کہ نجمی اس وقت کس عالم میں ہو گی۔ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ ڈاکو مان سنگھ نجمی کو اغوا کر کے اپنی خفیہ کمین گاہ میں لے گیا تھا۔ نجمی کو اس نے ٹیلے والی غار میں بند کر دیا تھا۔ اس کے ہاتھ اب کھول دیئے گئے تھے۔ غار کے باہر ساری رات ایک ڈاکو پہرہ دیتا رہا تھا۔ نجمی رات کے پچھلے پہر سو گئی تھی۔ نجمی اب وہ پہلے والی نازک اور بات بات پر ڈر جانے اور آنسو بہانے والی نجمی نہیں رہی تھی۔ حالات نے اس کی نسوانی نزاکت اس سے چھین کر اس کے اندر انتقام کا بارود کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا۔ اب اسے صرف ایک چنگاری دکھانے کی ضرورت تھی۔ جس جس مرد نے اس کے ساتھ جو جو درندہ صفت سلوک کیا تھا۔ وہ اس کے سینے پر نقش تھا۔ اسے ان سب سے اس درندگی کا انتقام لینا تھا۔ مان سنگھ تو ڈاکو تھا۔ اس کا تو کام ہی قتل و غارت گری تھا لیکن نجمی اسے بھی کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ نجمی کو اس غار میں قید ہوئے دو روز گزر گئے تھے۔ دن میں صرف ایک دفعہ دو ڈاکو اسے اپنی نگرانی میں غار سے نکال کر ٹیلے کے دامن میں بہتی ندی پر نہلانے لے جاتے اور جب نجمی نہر میں نہا رہی ہوتی تو دونوں ڈاکو رائفلیں اٹھائے قریبی جھاڑیوں میں سے اسے برابر دیکھ رہے ہوتے تھے۔ رات کو ڈاکو مان سنگھ پستول گلے میں لٹکائے جھومتا جھومتا غار میں آ جاتا اور صبح ہوتے غار سے باہر جاتا۔ نجمی چوبیس گھنٹے وہاں سے فرار ہونے کے منصوبے سوچتی رہتی لیکن بہت جلد اسے محسوس ہو گیا کہ وہ زندہ حالت میں ان ڈاکوؤں سے نجات حاصل نہیں کر سکتی اور ابھی اسے مرنا نہیں تھا کیونکہ اس کے دشمن ابھی زندہ تھے۔ اسے اپنے ان تمام دشمنوں کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔ اب ان دشمنوں میں مان سنگھ ڈاکو کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ نجمی نے ایک نئی حکمت عملی اختیار کر لی۔ اس نے اپنے آپ کو وقتی طور پر ڈاکو مان سنگھ کے حوالے کر دیا اور اس سے محبّت کا اظہار کرنے لگی۔ مان سنگھ ڈاکو محبت کے نام سے ناواقف تھا۔ اس سے اس کے رویّے میں صرف اتنی تبدیلی آئی کہ اس نے نجمی کو غار سے باہر نکل کر ڈاکوؤں کے لیے کھانا وغیرہ پکانے

کی اجازت دے دی۔ تیسرے روز ڈاکو مان سنگھ اپنے چار ساتھیوں کو لے کر کہیں واردات کرنے چل دیا۔ پیچھے صرف پانچ سات ڈاکو رہ گئے۔ ان میں مان سنگھ کا شاگرد خاص داسو بھی تھا۔ داسو نے نجمی کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا۔ وہ نجمی کے ساتھ زرخرید لونڈیوں سے بھی بدتر سلوک کرتا۔ نجمی اکیلی اور بے بس تھی۔ مان سنگھ نے نجمی کو غار سے نکلنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن داسو نے نجمی سے یہ سہولت بھی چھین لی اور اسے صبح شام غار میں ہی بند رکھتا جس کے باہر ایک مسلح ڈاکو پہرے پر موجود رہتا۔ مان سنگھ کو گئے تیسرا روز جا رہا تھا کہ نجمی نے وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کی۔ صبح کے وقت جب دو آدمی اسے اپنی نگرانی میں ندی پر نہانے کے لیے لے گئے تو نجمی نے ندی کے پانی میں ڈبکیاں لگاتے ہوئے نہانا شروع کر دیا۔ یہ ندی کچھ دور جنگل میں بالکل سیدھی جا کر آگے دائیں جانب درختوں میں گھوم گئی تھی۔ نجمی نے سوچا کہ اگر وہ پانی میں غوطہ لگا کر اندر ہی اندر تیزی سے تیرے تو وہ ندی کے موڑ تک جا سکتی ہے۔ چار پانچ دنوں میں اس نے پانی میں ڈبکیاں لگا کر اپنے سانس کو پکا کر لیا تھا۔ اور اپنے اندازے کے مطابق وہ ڈیڑھ منٹ تک پانی کے اندر رہ سکتی تھی اور ڈیڑھ منٹ ندی کے موڑ تک پہنچنے کے لیے کافی تھا۔ مصیبت صرف یہ تھی کہ دونوں ڈاکو جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ہوئے اسے نہاتے ہوئے برابر دیکھتے رہتے تھے اور اپنی نگاہ میں رکھتے تھے۔ نجمی نے سوچ رکھا تھا کہ ایک بار وہ ندی کے موڑ تک پہنچ گئی تو پھر ان کے قابو میں نہیں آئے گی اور ندی سے نکل کر جنگل میں بھاگ جائے گی۔ وہاں جنگل اس قدر گھنا اور جھاڑیوں گھاس سے اتنا بھرا ہوا تھا کہ اگر آدمی کسی طرف سے اس میں داخل ہو جائے تو پھر اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ نجمی نے کپڑے نہیں اتارے تھے اور ساڑھی سمیت ہی ندی میں نہا رہی تھی۔ بیچ بیچ میں وہ جھاڑیوں کے پیچھے کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے دونوں ڈاکوؤں کو بھی دیکھ لیتی تھی۔ ایک دفعہ اس نے ڈاکوؤں کی طرف نگاہ اٹھائی تو دیکھا کہ وہ ندی کی طرف سے نظریں ہٹائے ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ یہی وقت ان کی نظروں سے غائب ہونے کا تھا۔ نجمی نے ڈبکی لی اور پانی کے اندر جاتے ہی مینڈک کی طرح جتنی تیزی سے ٹانگیں اور بازو چلا سکتی تھی چلاتی ہوئی ندی کے بہاؤ کی طرف بڑھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ پانی کے اندر کافی دیر تک سانس کو بند رکھ سکے گی مگر وہ ایسا نہ کر سکی۔ بہت جلد اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے

پھر بھی وہ بازو اور ٹانگیں چلاتی آگے بڑھتی گئی۔ لیکن جب اس کی بند آنکھوں کے آگے نیلے تارے ناچنے لگے اور سینہ پھٹنے والا ہو گیا تو اس نے بے دم سی ہو کر اپنا سر پانی سے باہر نکال لیا تھا کہ رائفل کے فائر کے دھماکے سے جنگل گونج اٹھا اور جیسے گولی نجمی کے کان کے قریب سے ہو کر گزر گئی۔ نجمی نے دیکھا کہ دونوں ڈاکوؤں نے ندی میں چھلانگیں لگا دی تھیں اور کمر تک پانی میں ڈوبے اس کی طرف رائفلیں تانے بڑھ رہے تھے۔ ایک ڈاکو نے نجمی کو گالی دی اور کہا "یہیں کھڑی رہ" نجمی اب کیسے وہاں سے ہل سکتی تھی۔ ڈاکو اسے گھسیٹتے ہوئے اوپر غار کے باہر لے آئے۔ داسو کو جب پتہ چلا کہ نجمی نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی تو اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ نجمی کے منہ سے خون نکلنے لگا اور وہ نیم بے ہوش سی ہو کر زمین پر پڑ گئی۔ داسو نے اسے غار میں پھینکوا کر باہر پہرہ لگوا دیا۔ شام کو مان سنگھ ڈکیٹ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واپس آیا تو داسو نے اسے بتایا کہ چندا بائی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ اگر میں وقت پر ہوشیار نہ ہو جاتا تو وہ ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اس نے پولیس کو جا کر ہمارے خفیہ ٹھکانے کا سارا نقشہ بتا دینا تھا۔ مان سنگھ کا بھی پارہ چڑھ گیا اس نے نجمی کو مزید زدوکوب کیا اور اس کے پاؤں میں لوہے کی زنجیر ڈال کر اسے غار میں بند کر دیا۔

اب ہم واپس ندیم کی طرف آتے ہیں۔ دوسرے دن شام ہوتے ہی سیٹھ جبار مال گودام والی کوٹھری میں آ گیا۔ وہ اپنے ساتھ ایک بڑا لفافہ لایا تھا۔ اس میں ندیم کے لیے ایک پرانی سی میل خورے رنگ کی پتلون، ایک نسواری جیکٹ اور کینوس کے جوتے تھے۔ اس نے ایک پستول جیب سے نکال کر ندیم کو دیا اور کہا کہ یہ بارہ بور کا ولائتی پستول ہے۔ ساتھ کچھ گولیاں بھی تھیں۔ ندیم نے پستول کے میگزین کو گولیوں سے بھر لیا۔ اپنے کھدر کے کپڑے اتارے اور پتلون جیکٹ اور کینوس کے بوٹ پہن لیے۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں بڑھی ہوئی تھیں۔ بال بھی گردن تک آ گئے تھے۔ سیٹھ جبار نے ندیم کو کینوس کا ایک چھوٹا سا تھیلا بھی دیا جس میں ڈبل روٹی اور بھنی ہوئی مچھلی کے کچھ تلے تھے۔ سیٹھ جبار کہنے لگا۔

"یہ جنگل میں کچھ روز تمہارے کام آئیں گے۔ روپے بھی تم اپنے پاس رکھ لینا۔ ہو سکتا ہے یہ بھی سفر میں تمہاری مدد کریں۔"

ندیم نے سیٹھ جبار سے جل دھارا کے خطرناک جنگلی علاقے کے بارے میں پوچھا کہ "کلکتہ سے اسے کس طرف سے نکلنا ہو گا۔ سیٹھ جبار نے کہا۔"

"جل دھارا جنگل تک پہنچنے کا سب سے آسان راستہ تو دریائے ہگلی کا ہے مگر گھاٹ پر پولیس کے آدمی ہوں گے۔ وہاں تمہارے پکڑے جانے کا خطرہ ہے اسی لیے میں تمھیں دریا کے راستے سفر کرنے کا مشورہ نہیں دوں گا۔"

اس کے بعد سیٹھ جبار نے تفصیل کے ساتھ ندیم کو سمجھایا کہ وہ کس طرف سے ہو کر جل دھارا کے جنگل میں پہنچ سکے گا اور کونسا راستہ اس کے لیے محفوظ ہو گا۔ اس نے ندیم کو خاص طور پر ہدایت کی کہ وہ دن کے وقت ہرگز سفر نہ کرے۔ صرف رات کے اندھیرے میں سفر کرے۔ ندیم نے سیٹھ جبار کے ساتھ بیٹھ کر رات کا کھانا کھایا اور چائے پی۔ سگریٹ پھونکا۔ اس نے مزید ہدایات حاصل کیں اور پھر چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔ سیٹھ جبار کا ڈرائیور جیپ میں اس کے ساتھ آیا تھا۔ جیپ مال گودام سے کچھ دور ایک نالے کی ڈھلان کے قریب کھڑی تھی۔ سیٹھ جبار کہنے لگا۔

"میں نے تمھیں بتا دیا ہے کہ میری جیپ کہاں کھڑی ہو گی۔ ڈرائیور کو سب معلوم ہے کہ تمھیں کس جگہ اتارنا ہے۔ وہاں سے آگے تمھیں کہاں جانا ہو گا یہ بھی تمھیں بتا دیا گیا ہے۔ اب میں تمھیں خدا کے سپرد کرتا ہوں۔"

اس نے ندیم کو گلے لگا کر اسے دعا دی اور دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ میدان صاف ہے تو اس نے ندیم کو نکل جانے کا اشارہ کیا۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے کندھوں کو جھکائے سر نیچے ڈالے تیزی سے کوٹھری میں سے نکل کر نالے کی طرف اندھیرے میں چل دیا۔ اب شام کا اندھیرا رات کی تاریکی میں گھل مل گیا تھا۔

دور کلکتہ شہر کی عمارتوں اور کارخانوں میں روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ کسی قریبی کارخانے کے انجن میں سے بھاپ کے خارج ہونے کی مسلسل آواز آ رہی تھی۔ ندیم کو اندھیرے میں نالے کے پل کی دوسری جانب ڈھلان کے قریب جیپ کھڑی نظر آئی۔ سیٹھ جبار کا رازدار ڈرائیور پہلے ہی سے سیٹ پر تیار بیٹھا تھا۔ ندیم کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے انجن اسٹارٹ کر دیا۔

اور تھوڑی دیر بعد جیپ اس علاقے سے نکل کر دریائے ہگلی کے جنوب کی طرف پوری رفتار پر بھاگی جا رہی تھی۔ ندیم کلکتہ کے اس علاقے سے کسی حد تک واقف ہو گیا تھا۔ جیپ شہر کی روشنیاں اور آبادی پیچھے چھوڑتی جا رہی تھی۔ جیپ پر کینوس کی چھت پڑی تھی اور کینوس کا دروازہ بھی بند تھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ جس میں سڑک کے کنارے درخت پیچھے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ یہ سڑک زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ سامنے سے آتا ہوا ایک ٹرک تیزی سے نکل گیا۔ ڈرائیور خاموش تھا۔ ندیم بھی خاموش تھا۔ دور بائیں جانب کسی بڑی سڑک کے کنارے لگے کھمبوں کی روشنیاں پیچھے جا رہی تھیں۔ پھر یہ روشنیاں غائب ہو گئیں۔ اب جیپ کھیتوں سے گزر رہی تھی۔ سڑک کی دونوں جانب دھان کے کھیت تھے جن کی مرطوب خوشبو ندیم کو صاف محسوس ہو رہی تھی۔ اندھیرا ہونے کی وجہ سے دھان کے کھیت سیاہ دکھائی دے رہے تھے۔ اچانک ریل کا پھاٹک آ گیا۔ پھاٹک بند تھا۔ ڈرائیور نے بڑبڑاتے ہوئے جیپ ایک طرف کھڑی کر کے روشنیاں بجھا دیں۔ وہ بولا۔

”تم باہر مت نکلنا۔ میں جا کر پتہ کرتا ہوں گاڑی آنے میں کتنی دیر ہے۔“

ڈرائیور جیپ سے اتر کر پھاٹک کے قریب جو چھوٹی سی کوٹھڑی تھی اس کی طرف بڑھا۔ کوٹھڑی کے باہر لال بتی جل رہی تھی۔ ندیم کا جی سگریٹ پینے کو چاہا مگر جیپ میں ماچس کی روشنی کرنا خطرناک ہو سکتا تھا۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے خاموش بیٹھا عقابی نگاہوں سے بند پھاٹک کی طرف دیکھتا رہا۔ اتنے میں دور سے ریل کے انجن کی سیٹی کی آواز سنائی دی۔ ڈرائیور اندھیرے میں جیپ کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولا ”گاڑی آ گئی ہے مال گاڑی ہے بڑے ڈبے ہوں گے۔ ذرا پہلے آتے تو نکل گئے ہوتے“۔ ٹرین دھڑ دھڑاتی شور مچاتی گزر گئی۔ پھاٹک کھلا اور جیپ ریلوے لائن عبور کر کے ایک بار پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گئی۔ اب سڑک دائیں طرف گھوم کر غیر ہموار ویرانے میں سے گزر رہی تھی۔ کبھی ڈھلان آ جاتی اور کبھی ہلکی سی چڑھائی آ جاتی۔ لگتا تھا کہ پہاڑی علاقہ شروع ہو گیا ہے۔ کافی دیر تک جیپ ان راستوں پر دوڑتی رہی۔ سڑک ایک بار پھر ہموار ہو گئی۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دائیں بائیں سڑک کے کنارے سوائے جھاڑیوں کے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کوئی دو گھنٹے کے سفر کے بعد جیپ نے ایک کشادہ ندی پر بنے

ہوئے بانس کے پل کو عبور کیا تو سامنے اونچے اونچے درختوں کا سلسلہ جیپ کی روشنی میں دکھائی دیا۔ یہاں سڑک کچی تھی اور جیپ کو ہلکے ہلکے دھچکے لگنے لگے تھے۔ ہوا مرطوب اور ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ اس مرطوب ہوا میں ساگوان اور تالابوں میں اُگے ہوئے سنگھاڑوں کی کچی مہک رچی ہوئی تھی۔ آخر درختوں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جیپ ایک بار پھر میدانی علاقے میں داخل ہو گئی تھی۔ ندیم نے دروازے کے پلاسٹک کے شیشے میں سے جھک کر بائیں جانب دیکھا اسے چھوٹے چھوٹے ٹیلے رات کے اندھیرے میں ایسے نظر آئے جیسے قوی ہیکل ہاتھی سر ڈالے سو رہے ہوں۔ یہ ویرانہ بھی گزر گیا۔ جیپ نے ایک موڑ کاٹا اور ایک زنگ آلود چٹان کی اوٹ میں رک گئی۔ ڈرائیور نے جیپ کی روشنیاں بجھا دیں۔ انجن کے بند ہوتے ہی ندیم کو جنگل کی سنسناہٹ سنائی دینے لگی۔ ڈرائیور نے ندیم کو باہر آنے کے لیے کہا۔ ندیم نے جیپ سے اتر کر دائیں بائیں دیکھا۔ ایک طرف بڑی اونچی چٹان تھی اور دوسری جانب جھاڑیاں ہی جھاڑیاں اگی تھیں۔ سامنے ستاروں کی پھیکی روشنی میں درختوں کے دھندلے ہیولے خاموش کھڑے تھے۔ ڈرائیور نے ان درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ سامنے اندھیرے میں جو تمہیں درخت اور ان کے پیچھے ٹیلوں کے سائے دکھائی دیتے ہیں یہ چاتیل بن کا علاقہ ہے۔ جل دھارا جنگل یہاں سے کافی آگے جا کر ہے۔ یہ اصلی جنگل نہیں ہے۔ چاتیل بن میں زیادہ تر ہرن پاڑے اور نیل گائیں ہوتی ہیں۔ ادھر درندے نہیں ہوتے تمہیں راستے میں ایک جھیل ملے گی۔ اس جھیل کے آگے ایک ندی آئے گی۔ جب تم ندی پار کر و گے تو اونچے نیچے ٹیلوں کا علاقہ شروع ہو جائے گا۔ ان ٹیلوں کے پار جل دھارا جنگل آتا ہے۔ وہی تمہاری منزل ہے۔ یہ علاقہ تم راتوں رات پار کر جاؤ تو اچھا ہے۔ کیونکہ یہاں دن کے وقت فاریسٹ محکمے کے گارڈ نظر آ جاتے ہیں اس کے آگے بے شک دن میں بھی سفر کر لینا۔ جل دھارا جنگل میں رات کو سفر مت کرنا کیونکہ وہاں رات کو شیر چیتے شکار کی تلاش میں نکل آتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔“

ڈرائیور نے ندیم کو خدا کے حوالے کیا اور جیپ واپس گھما کر جدھر سے آیا تھا اُدھر کو چل دیا کچھ دیر تک جیپ کے انجن کی آواز سنائی دیتی رہی پھر یہ آواز غائب ہو گئی اور ندیم کو جنگل کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سناٹے نے گھیر لیا۔ جنگل میں صرف درخت درندے اور حشرات الارض ہی نہیں ہوتے۔ جنگل میں ایسے ایسے بھید چھپے ہوتے ہیں کہ جو آج تک انسان کی سمجھ میں نہیں آسکے۔ رات کے وقت جنگل ایک آسیب بن جاتا ہے جس کے اندھیرے میں نظر نہ آنے والی روحیں سرگوشیاں کرتی سنائی دیتی ہیں ہر درخت میں سے کسی آسیب کی سرخ آنکھیں جھانکتی نظر آتی ہیں۔ ندیم کو اس سے پہلے جنگل کی راتوں کا تھوڑا بہت تجربہ ہو چکا تھا اس کے سامنے دو مشن تھے ایک تو اسے اپنے آپ کو قانون کی نگاہوں سے چھپانا تھا اور دوسرے نجمی کو خونی ڈاکوؤں کے قبضے سے چھڑا کر لانا تھا۔ نجمی کی محبت اور اس کو بچا کر لانے کے جذبے نے ندیم کے سینے میں ایک نئی طاقت بھر دی تھی۔ اسے اپنے اندر اتنی طاقت محسوس ہو رہی تھی کہ وہ کسی بدروح کو تو کیا کسی بڑے سے بڑے پہاڑ سے بھی ٹکرا کر اسے ریزہ ریزہ کر سکتا تھا۔ اس نے خدا کا نام لیا اور چیتل بن کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ اندھیرے اور سناٹے میں درخت سائیں سائیں کر رہے تھے۔ ہوا بالکل بند تھی درختوں کے نیچے ایک چھوٹا سا جنگلی راستہ آگے کو جا رہا تھا ندیم اس راستے پر چلنے لگا۔ شروع شروع میں اسے اندھیرے میں چلتے وقت دشواری پیش آ رہی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں اور اسے ہر شئے کا دھندلا خاکہ نظر آنے لگا۔ جس جنگلی راستے پر ندیم چل رہا تھا وہ کوئی قدرتی پگڈنڈی نہیں تھی بلکہ صاف لگ رہا تھا کہ فارسیٹ ڈیپارٹمنٹ والوں کا بنایا ہوا راستہ ہے۔ ندیم کو ڈرائیور کی ہدایت یاد آگئی کہ چیتل بن میں محکمہ جنگلات والوں کے گارڈز وغیرہ بھی ہوتے ہیں تاکہ رات کو کوئی جنگل سے درخت وغیرہ کاٹ کر نہ لے جائے۔ ندیم رستے سے اتر کر درختوں کے نیچے سے ہو کر گزرنے لگا۔

یہ درخت زیادہ تر ساگوان کے تھے اور ان کے تنوں میں سے عجیب سی بھینی بھینی ٹھنڈی مہک اٹھ رہی تھی اسے یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ سانپ کا خیال آتے ہی ندیم دوبارہ جنگل کے راستے پر آگیا۔ یہاں درختوں کی شاخیں اوپر جا کر ایک دوسری سے مل گئی تھیں اور ستارے بالکل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کافی دیر تک چلتے رہنے کے بعد ایک چھوٹی سی جھیل آگئی یہاں ایک ہرن اندھیرے میں ایک طرف کو ڈر کر بھاگ گیا ندیم جھیل کے کنارے کنارے وہاں سے آگے نکل گیا۔ اب پھر جنگل شروع ہو گیا۔ کچھ دور چلنے کے بعد ایک ندی آگئی اس ندی پر

بانس کا چھوٹا سا پل بنا ہوا تھا ندیم ندی کی دوسری طرف آیا تو یہاں درختوں کا گھنا پن تقریباً ختم ہو گیا تھا آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے دکھائی دینے لگے تھے اور آس پاس چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا ندیم کو ان ٹیلوں کے پار جانا تھا کیونکہ جل دھارا کا خطرناک جنگل ان ٹیلوں کے پار تھا اور وہیں مان سنگھ ڈکیٹ کی خفیہ کمین گاہ تھی اب ندیم چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ یہاں پر محکمے والوں کی سڑک ختم ہو گئی تھی۔ ندیم ایک جگہ بیٹھ گیا اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر اس طرح آگے ہاتھ رکھ کر سلگایا کہ دور سے ماچس کا شعلہ نظر نہ آئے۔ سگریٹ پینے سے اس کی تھکان کافی حد تک دور ہو گئی۔ سگریٹ جھاڑیوں میں پھینک کر وہ اٹھا اور ٹیلوں کے درمیان سے ہو کر آگے چل پڑا۔ ٹیلوں کا سلسلہ زلف دراز کی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ رات ڈھلنے لگی تھی آسمان پر ستاروں نے جھلملانا شروع کر دیا تھا۔ سات ستاروں کی ٹولی آسمان کے وسط سے گزر کر مغرب کی طرف جھک گئی تھی۔ پھر مشرق کی طرف افق پر نیلی روشنی کا غبار سا نمودار ہو گیا۔ یہ صبح کاذب کی اولین جھلکیاں تھیں۔ ندیم نے ارد گرد نگاہ ڈالی ٹیلے اور ٹیکریاں ختم ہو رہی تھیں اور دور اسے گھنے درختوں کی سیاہ گہری لکیر نظر آنے لگی۔ یہی جل دھارا کا خطرناک اور دشوار گزار جنگلی سلسلہ تھا جہاں درندوں اور شیر، چیتوں کا خطرہ موجود تھا۔ ندیم نے جیکٹ کے بٹن کھول دیئے تھے اسے پسینہ آرہا تھا۔ وہ ایک جھاڑی کے پاس اندھیرے میں کچھ دیر سستانے کے لیے بیٹھ گیا مشرق کی جانب سے ٹھنڈی ہوا کے جھونکے چلنے لگے تھے ان جھونکوں میں گھنے جنگلوں کی مرطوب گہری خوشبو تھی۔ آسمان پر نیلی روشنی کی لہریں سی پھیل رہی تھیں۔ پو پھٹ رہی تھی۔ نیم روشن نیلے مشرقی آسمان کے پس منظر میں دور جل دھارا جنگل کے درختوں کی قطار گہری ہو کر ابھر آئی تھی۔ صبح کی سلیٹی رنگ کی دھندلی روشنی کا غبار چاروں طرف اتر آیا تھا۔ ندیم اٹھا اور جل دھارا جنگل کے درختوں کی طرف چل پڑا۔ ان درختوں کے پیچھے نجمی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

.. .. ؞ .. ..

سورج درختوں کے اوپر آ گیا تھا۔ جب ندیم اس سارے جنگل میں داخل ہو گیا۔ اس جنگل کے درخت اتنے گھنے اور گنجان تھے کہ ان کے نیچے دھوپ کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ہر طرف قدرتی جھاڑیوں اور اونچی اونچی گھاس کی بہتات تھی یہاں کوئی پگڈنڈی نہیں تھی۔ ندیم اپنے ذہن میں ایک سیدھ بنا کر جھاڑیوں کے درمیان اونچی گھاس میں سے گزرنے لگا۔ گھاس کہیں اس کی کمر تک آ جاتی اور کہیں اس کے گھٹنوں تک پہنچ رہی تھی شبنم کی وجہ سے گھاس گیلی تھی۔ اس گھاس میں چلنا دشوار تھا۔ ندیم کو ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ خدا خدا کر کے اونچی گھاس کا سلسلہ ختم ہوا۔ یہاں زمین نیم پتھریلی اور غیر ہموار تھی۔ ذرا کھلی جگہ آئی تو سامنے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ایک گھاٹی بل کھاتی چلی گئی تھی۔ ایک تالاب کے کنارے دلدل میں ندیم کو مختلف جنگلی جانوروں کے پاؤں کے نشان نظر آئے۔ ان میں شیر کے پنجوں کے نشان بھی تھے۔ ندیم محتاط ہو گیا۔ اسے یوں لگا جیسے شیر وہیں کسی درخت کے پیچھے چھپا اسے دبوچ لینے کو بے تاب ہے اس نے گھوم کر کچھ فاصلے پر کھڑے ساگوان ناریل اور دیودار کے درختوں کو دیکھا۔ ان درختوں پر کچھ پرندے چہچہا رہے تھے۔ گھاٹی پیچھے رہ گئی۔ ایک بار پھر درخت قریب قریب آ گئے۔ دوپہر تک اس دشوار گزار خطرناک جنگل میں اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان ندیم کا سفر جاری رہا۔ پھر وہ ایک چھوٹے سے قدرتی چشمے کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ تھکن سے چور ہو گیا تھا۔ اسے بھوک بھی لگ رہی تھی چشمے کے پانی سے اس نے بوٹ اتار کر اپنے پاؤں دھوئے۔ منہ ہاتھ صاف کیے اور کینوس کے تھیلے میں سے ڈبل روٹی کے کچھ ٹکڑے نکال کر مچھلی کے ساتھ کھائے۔ پانی پیا اور سگریٹ سلگا کر سامنے والے ٹیلوں کو تکنے

لگا جن کی چوٹیوں پر درخت چھتریوں کی طرح کھڑے تھے۔ یہاں درختوں کے چھدرے ہونے کی وجہ سے دھوپ کہیں کہیں پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم کے سامنے کچھ دور تین ٹیلے اپنی چوٹیوں پر درختوں کی چھتریاں تانے کھڑے تھے۔ ان میں سے کسی ٹیلے میں مان سنگھ ڈاکو کی خفیہ کمین گاہ تھی جہاں نجمی قید تھی۔ وہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ کس ٹیلے کی طرف رخ کرے۔ آدھے گھنٹے تک ندیم چشمے کے کنارے بیٹھا یہی سوچتا رہا کہ اسے کس طرف چلنا چاہیئے۔ وہ کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا تو بوٹ پہن کر اٹھا اور سامنے والے ٹیلے کی طرف چلنے لگا۔ یہاں کھیت کہیں نہیں تھے۔ درخت جھاڑیاں اور جنگلی گھاس کے سوا اور کچھ نہیں تھا اب کہیں کہیں باغ کے درختوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا۔ چلتے چلتے ندیم کو سہ پہر کا وقت آ گیا۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں ندیم کو بارش کی وجہ سے سیاہ پڑ چکی برجی نظر آئی۔ یہ برجی ایک چبوترے پر بنی ہوئی تھی۔ اور چبوترے کے ٹوٹے ہوئے فرش پر جگہ جگہ گھاس اُگ آئی تھی۔ یہ برجی کسی کی مڑھی لگ رہی تھی۔ کیونکہ برجی کے اندر مڑھی کا گول نشان بنا ہوا تھا۔ خدا جانے اس جنگل میں کس کی ہڈیاں دفن تھیں۔ ندیم برجی کے چبوترے پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا اور سوچنے لگا کہ کیا وہ ٹھیک راستے پر جا رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ وہ ڈاکوؤں کے علاقے میں داخل ہو چکا ہو اور کسی طرف سے اچانک کوئی ڈاکو اس پر رائفل سے فائر کر دے۔ اس خیال کے ساتھ ہی وہ چبوترے سے اتر کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ چبوترے پر وہ دور سے دیکھا جا سکتا تھا۔ چبوترے کی دیوار بھی ٹوٹی ہوئی تھی اور اس میں بھی گھاس اُگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر تک وہاں سستانے کے بعد ندیم اٹھا اور ٹیلے کی طرف گھاس میں چلنے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ گھاس میں سے ایک پگڈنڈی سی ابھرنے لگی ہے۔ کچھ دور چلنے پر یہ پگڈنڈی واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ پگڈنڈی اس بات کی علامت تھی کہ یہاں کوئی آبادی موجود ہے اور لوگ اس پگڈنڈی پر آتے جاتے ہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس جنگل میں انسانی آبادی کہاں سے آ گئی تھی؟ ندیم نے جھک کر پگڈنڈی کو غور سے دیکھا، پگڈنڈی پر گھاس ہی گھاس تھی جو انسانی پاؤں سے کچلے جانے سے زرد پڑ چکی تھی۔ ندیم چوکس اور محتاط ہو گیا اس نے پتلون کی اس جیب میں ہاتھ ڈال لیا جس میں بھرا ہوا پستول پڑا تھا۔ احتیاطاً وہ پگڈنڈی سے اتر کر درختوں کے درمیان چلنے لگا۔ پگڈنڈی کوئی ایک فرلانگ آگے جا کر

جنگل میں ایسی جگہ پہ جا کر ختم ہو گئی جہاں بہت سے درخت کٹے ہوئے پڑے تھے۔ ندیم رک گیا۔ وہ سمجھ گیا کہ جنگل میں یہاں کٹائی کا کام ہو رہا ہے۔ اس وقت وہاں کوئی مزدور نظر نہیں آ رہا تھا۔ ندیم وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف نکل گیا۔ اوپر سے بانس اور جھاڑیوں کے جھنڈوں کا چکر کاٹ کر وہ کٹائی والی جگہ سے آگے نکل آیا۔ اگر یہاں جنگل میں کٹائی ہو رہی تھی تو مزدوروں کی جھونپڑیاں بھی کہیں نہ کہیں ضرور ہوں گی۔ ندیم سوچ کر پھونک پھونک کر قدم اٹھانے لگا۔ وہ چاروں طرف غور سے دیکھتا جا رہا تھا ابھی تک اسے کوئی جھگی یا کھپریل کی جھونپڑی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے سوچا کہ ہو سکتا ہے کٹائی کے لیے مزدور دور کسی گاؤں سے آتے ہوں۔ چلتے چلتے وہ ایک چھوٹی سی ندی پہ آ گیا۔ ندی کا پانی بڑے سکون سے بہہ رہا تھا۔ کنارے پہ بانس کے درخت تھے جن کی ہری بھری شاخیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ندیم ندی کے کنارے بیٹھ گیا۔ اس نے منہ پہ چھینٹے مارے، ٹھنڈے پانی کے کچھ گھونٹ پیئے اور کینوس کا تھیلا کاندھے سے لٹکائے ندی کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف چل پڑا۔ درختوں کے سائے گھنے اور ٹھنڈے تھے۔ کہیں کہیں دھوپ کا چھوٹا سا سفید ٹکڑا دکھائی دے جاتا تھا۔ سورج مغرب میں کافی نیچے اتر گیا اور بہت جلدی درختوں کے سائے گہرے ہو گئے۔ دھوپ مغرب میں سمٹ گئی تھی۔ درختوں کے اوپر ضرور غروب آفتاب کی نارنجی روشنی ہو گی۔ مگر درختوں کے نیچے سائے اندھیروں میں ڈھلنا شروع ہو گئے تھے۔

اپنے اندازے کے مطابق ندیم تیسرے ٹیلے کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔ اب وہ چلتے چلتے رک کر ارد گرد کا جائزہ لے لیتا تھا۔ ندی دائیں جانب جنوب کی طرف مڑ گئی۔ ندیم نے ندی کو چھوڑ دیا اور سامنے درختوں میں آ گیا۔ ان درختوں کے نیچے بھی ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ندیم پگڈنڈی کے کنارے کنارے آہستہ آہستہ چلا جا رہا تھا۔ جنگل میں شام بڑی جلدی پڑ جاتی ہے اور شام کے پڑنے کے ساتھ ہی رات بھی ہو جاتی ہے۔ اس جنگل میں بھی ایسا ہی ہوا جونہی شام کے سائے درختوں میں اترے اس کے تھوڑی ہی دیر بعد درختوں میں رات کا اندھیرا پھیل گیا اور وہ پرندے جو کچھ دیر پہلے درختوں پہ چہچہا رہے تھے، ایکدم سے چپ ہو گئے ایک ڈراؤنا سناٹا چاروں طرف جنگل میں چھا گیا۔ ندیم کو اس اندھیرے میں بھی درختوں کے

خاکے نظر آ رہے تھے۔ وہ ان کے بالکل قریب سے ہو کر آگے بڑھ رہا تھا۔ اب اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کہیں کسی خونخوار جنگلی درندے سے آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ یہاں وہ گولی کا دھماکہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کمانی دار چاقو اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ لیکن شیر یا چیتے کے مقابلے میں یہ چاقو کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ ندیم ایک جگہ رک کر آنکھیں پھاڑے چاروں طرف غور سے دیکھنے لگا کہیں وہ راستے سے بھٹک کر کسی دوسری طرف تو نہیں نکل آیا؟ جنگل کہیں ختم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اب تک ٹیلے کے دامن میں وہ راستہ اسے مل جانا چاہیئے تھا جو اوپر ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ کو جاتا تھا۔ جنگل کا ماحول رات پڑتے ہی ڈراؤنا ہو گیا تھا۔ ندیم کے دل میں جنگل کا کوئی ڈر یا خوف نہیں تھا اس لیے کہ اس کے دل میں نجمی کی محبت کا چراغ روشن تھا اور وہ اس محبت پر اپنی جان قربان کرنے سے پہلے مان سنگھ ڈاکو کے پنجے سے نجمی کو نکال لانے کا عزم کیے ہوئے تھا....

اچانک اس کے کان کھڑے ہوئے اسے کسی عورت کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ بنگلہ زبان میں جیسے کسی سے التجائیں کر رہی تھی۔ اس آواز میں آنسوؤں کا درد بھی شامل تھا۔ ندیم جدھر سے آواز آئی تھی ادھر گھور کر دیکھنے لگا۔ اب اسے ایک مرد کی آواز بھی سنائی دی جس میں جبر اور تشدد کا انداز تھا اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے مرد کی آواز بھی آئی جو ہندی زبان میں رحم کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ قصہ کیا ہے؟ ندیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ پھر اندھیرے میں اس نے سامنے والے درختوں کے پیچھے ایک انسانی سائے کو ابھرتے دیکھا۔ ندیم نے جلدی سے چاقو جیب میں رکھ کر پستول نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انسانی سایہ اب قریب آ گیا تھا وہ ایک عورت کو پکڑے گھسیٹ رہا تھا اور اسے ہندی میں گالیاں بھی دے رہا تھا اس کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پہ ایک اور انسان چلا آ رہا تھا جو بار بار کہہ رہا تھا "میری بیٹی پہ رحم کرو میری بیٹی کو چھوڑ دو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں۔" جو آدمی لڑکی کو گھسیٹے لیے جا رہا تھا وہ اونچا لمبا تھا اور اندھیرے میں اس کے کاندھے سے لٹکی ہوئی رائفل ندیم کو صاف نظر آ رہی تھی وہ ندیم سے چند قدموں کے فاصلے پر سے درختوں کے قریب سے لڑکی کو گھسیٹتے ہوئے اسے گالیاں دیتا گزر گیا۔ وہ کچھ لڑکھڑا بھی رہا تھا صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اس نے پی رکھی ہے۔ لڑکی کا باپ ہاتھ جوڑے پیچھے پیچھے فریاد کرتا آ رہا تھا۔ ایک دم سے اونچا لمبا رائفل والا آدمی رک گیا۔ اس نے لڑکی کا

بازو چھوڑ دیا اور پیچھے آکر لڑکی کے باپ کے منہ پر زور سے مکا مار کر اسے گندی گالی دی بوڑھا گر پڑا۔ رائفل والا آدمی سہمی ہوئی سسکیاں بھرتی لڑکی کو کھینچتا ہوا آگے لے گیا اور درختوں جھاڑیوں کے اندھیرے میں گم ہو گیا ندیم یہ خاموشی سے دردناک ڈرامہ دیکھتا رہا۔ جب رائفل والا آدمی اندھیرے میں اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا تو ندیم نے پستول جیب میں ڈالا اور آہستہ سے درخت کے پیچھے سے نکل کر اس جگہ آیا جہاں جھاڑیوں میں بوڑھا گھاس پر ایک طرف کو گرا ہوا نیم بے ہوشی کے عالم میں اپنی بیٹی کو آہستہ آہستہ کراہتے ہوئے پکار رہا تھا۔ "عائشہ عائشہ۔ یا اللہ میری بیٹی کی عزت بچا لے۔" یہ کوئی مسلمان بنگالی مزدور تھا جو شاید جنگل میں کٹائی کے کام پر لگا تھا۔ ندیم نے جھک کر اس کے سر کو اپنے زانو پر رکھتے ہوئے اسے غور سے دیکھا اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی اور منہ سے خون بہہ رہا تھا۔ ندیم نے آہستہ سے کہا۔

"بابا! یہ کون آدمی تھا جو تمہاری بیٹی کو لے گیا ہے؟" بوڑھے مسلمان بنگالی نے آنکھیں کھول کر تاریکی میں ندیم کی طرف دیکھا اور کراہتے ہوئے عاجزی سے کہا "بیٹا میری بچی کو اس ڈاکو سے بچا لے میری بیٹی معصوم ہے وہ میرے ساتھ پانچ وقت کی نماز پڑھتی ہے۔ تم مسلمان ہو تو اللہ کے نام پر میری مدد کرو۔"..... ندیم کا خون ایکدم گرم ہو گیا۔ اس کے بازوؤں کی جوان مچھلیاں پھڑکنے لگیں۔ لڑکی کا باپ کراہتے ہوئے کہہ رہا تھا "وہ ہندو ڈاکو ہے میری بچی حافظ قرآن ہے یا اللہ تو ہی میری بچی کی عزت کا رکھوالا ہے۔" اور بوڑھے نے رونا شروع کر دیا۔ ندیم نے اس پر جھکتے ہوئے پوچھا "بابا! اللہ پہ بھروسہ رکھو وہی عزتوں کا محافظ ہے۔ مجھے بتاؤ یہ ہندو ڈاکو تمہاری بچی کو کہاں لے گیا ہے وہ" مسلمان بنگالی بوڑھے نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "جنگل میں آگے لکڑیوں کا گودام ہے وہ اسے وہیں لے گیا ہے۔ وہ روز رات کو ہماری جھگیوں میں سے ایک لڑکی کو وہیں لے جاتا ہے۔" یہ کہہ کر بوڑھا سسکیاں بھرنے لگا۔ ندیم نے اس کو آہستہ سے اٹھا کر بٹھا دیا اور دھیمی آواز میں کہا "بابا! اسی جگہ بیٹھے رہنا میں تمہاری بیٹی کو لے کر ابھی آتا ہوں۔ آواز بالکل نہ نکالنا۔" ندیم بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور جس طرف ہندو ڈاکو گیا تھا اسی طرف دوڑ پڑا۔ وہ جھک کر ایک ایسے شیر کی طرح تیز تیز دوڑ رہا تھا جس نے اپنے دشمن کو اندھیرے میں دیکھ لیا ہو۔ جھاڑیاں جگہ جگہ اس کا راستہ روک رہی تھیں ان جھاڑیوں کو پیچھے ہٹاتے ہوئے

آواز پیدا ہو رہی تھی۔ ندیم جھاڑیوں کو چھوڑ کر دیودار کے درختوں میں سے ہو کر تیز تیز چلنے لگا۔ ایک جگہ درخت چھدرے ہو گئے تھے یہاں اسے ایک جھگی نظر آئی اس کے باہر بھی کٹے ہوئے درخت ایک طرف پڑے تھے۔ ندیم نے پستول کی جگہ کمانی دار چاقو ہاتھ میں پکڑ لیا۔ ندیم بھی یہاں گولی کا دھماکہ نہیں کرنا چاہتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ وہاں سے زیادہ دور نہیں ہے اور یہ ہندو مان سنگھ کا ہی کوئی آدمی ہے جو لکڑی کا کام کرنے والے غریب مزدوروں کی عزتوں کو لوٹتا پھرتا ہے ندیم جھکا جھکا احتیاط سے قدم اٹھاتا جھگی کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ جھگی کی دیوار لکڑی کی تھی یہ درخت کے تنوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھی اور اوپر بانس کی شاخوں کی ڈھلوان چھت پڑی تھی۔ جھگی کے اندر سے لڑکی کے سسکیاں بھرنے اور کبھی بنگلہ اور کبھی ہندی زبان میں التجائیں کرنے کی دردناک آوازیں آ رہی تھیں اس کے ساتھ ہی ہندو ڈاکو کی گالیاں دینے کی آواز بھی آ جاتی تھی۔ ندیم اندھیرے میں لکڑی کی دیوار کے ساتھ کھسکتا ہوا دوسری طرف آ گیا۔ وہ دروازے کی تلاش میں تھا۔ دروازہ اسے مل گیا۔ اس کے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ اس کے اندر اتنی طاقت آ گئی تھی کہ وہ ٹکر مار کر جھگی کو تہس نہس کر سکتا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک حافظ قرآن، نمازی پرہیزگار لڑکی ایک کافر کے پنجے میں پھنسی رو رو کر التجائیں کر رہی تھی۔ کمانی دار کھلا چاقو ندیم کی مضبوط گرفت میں تھا اس کو اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اس نے چاقو کے دستے سے لکڑی کے بند دروازے پر دو تین بار ٹھک ٹھک کی اور پیچھے ہٹ کر دیوار کے ساتھ بالکل سیدھا لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے ہندو ڈاکو کی غراہٹ نما آواز بلند ہوئی "کون ہے بے"؟ اس نے گالی دے کر پوچھا تھا ندیم نے ایک بار پھر چاقو کا دستہ دروازے پر مارا۔ چاقو پہ ندیم کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی۔ ہندو ڈاکو نے ایک اور گالی دی اور بولا "پہلے تیری خبر لے لوں۔" جبکہ چاقو پہ ندیم کی گرفت مزید مضبوط ہو گئی تھی۔ اس کی کلائی میں فولاد ایسی طاقت سرایت کر گئی تھی۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ اسے اندر سے دروازے کی زنجیر کھلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر دروازہ کھلا اور اندھیرے میں سب سے پہلے ندیم نے رائفل کی نالی کو دیکھا پھر اونچا لمبا ہندو ڈاکو کا سایہ دروازے سے باہر نکلا وہ کچھ لڑکھڑا رہا تھا۔ ایک بجلی سی ندیم کی آنکھوں کے آگے چمک گئی۔ وہ شیر کی

طرح چھپٹا اور دوسرے لمحے کمانی دار چاقو کا پانچ انچ لمبا پھل ہندو ڈاکو کی پیٹھ میں گھس گیا۔ ہندو ڈاکو کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ ندیم نے چاقو کھینچ کر باہر نکالا اور دوسرا وار کر دیا۔ ہندو ڈاکو منہ کے بل آگے زمین پر گر پڑا۔ چاقو ابھی تک اس کی پشت میں ہی تھا ندیم نے لپک کر چاقو کو کھینچ لیا پھر اس کی رائفل کو اٹھا کر ایک طرف پھینکا اور جھک کر ہندو ڈاکو کو دیکھا چاقو کا دوسرا وار اس درندہ صفت آدمی کے دل کو کاٹ چکا تھا اس کا منہ کھلا تھا اور حلق سے خرخراہٹ کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ ندیم نے اس کو مرنے کے لیے وہیں چھوڑ دیا اور خود جھگی میں گھس گیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ اس نے آہستہ سے آواز دی" عائشہ بہن! ڈرو نہیں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔" اب اسے لڑکی کے سسکیاں بھرنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم نے اندھیرے میں غور سے دیکھا ایک لڑکی جھلنگا سی بانس کی چارپائی کے کونے میں سمٹی بیٹھی اپنے جسم کو دھوتی سے چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے سسکیاں بھر رہی تھی۔ ندیم نے آگے بڑھ کر اس کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور کہا" میری بہن گھبراؤ نہیں اٹھو تمھارا بابا باہر ہے میرے ساتھ آؤ۔" مصیبت میں گھری ہوئی لڑکی کو کوئی بہن کہہ کر پکارے تو اس کے اندر ایک عجیب سی طاقت آجاتی ہے۔ عائشہ چارپائی سے اتر کر ندیم کے قریب آکر زمین پر بیٹھ گئی۔ ندیم دروازے کے پاس چلا گیا۔ ہندو ڈاکو کی لاش اسی طرح اندھیرے میں زمین پر اوندھی پڑی تھی۔ ندیم نے پیچھے مڑ کر لڑکی کو آہستہ سے آواز دی" دیر نہ کرو بہن میرے ساتھ آؤ۔" لڑکی نے دھوتی سے اپنے جسم کو اچھی طرح چھپا لیا تھا وہ اٹھی اور ندیم کے پاس آگئی۔ ندیم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے جھگی سے باہر لے آیا۔ لڑکی کا ہاتھ ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ لڑکی نے باہر زمین پہ ہندو ڈاکو کی لاش کو اندھیرے میں پڑے دیکھا تو ندیم کے ساتھ لگ گئی۔ ندیم نے چاقو لاش کے کپڑوں سے صاف کر کے بند کر کے جیب میں رکھ لیا تھا اس نے ہندو ڈاکو کی رائفل اٹھا کر لاش کے پاس ہی رکھ دی اور لڑکی کو ساتھ لے کر جھاڑیوں اور درختوں میں سے ہوتا اس جگہ پر آگیا۔ جہاں اس کا باپ اندھیرے میں بیٹھا دھوتی سے اپنے ہونٹوں سے بہتا ہوا خون پونچھ رہا تھا۔ اپنی بیٹی کو دیکھ کر وہ اٹھا۔ لڑکی باپ کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔ ندیم نے کہا" بابا میں بھی مسلمان ہوں اللہ نے تمھاری بیٹی کی عزت بچالی ہے اب مجھے بتاؤ تم کہاں جانا چاہتے ہو۔"

بوڑھے مسلمان بنگالی نے ندیم کے پاؤں پکڑ لیے۔ ندیم نے اسے کندھوں سے تھام کر اٹھایا اور کہا" بابا! اللہ نے تمھاری عزت ہندو کافر سے بچائی ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرو میں نے کچھ نہیں کیا۔" بوڑھے نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا کہ ڈاکو کدھر گیا؟ ندیم نے کہا" اس کی لاش جھگی کے باہر پڑی ہے میرے ساتھ آؤ ہمیں اس کی لاش کو ٹھکانے لگانا ہے۔" بوڑھا سہمی ہوئی آواز میں بولا" تم نے اسے مار دیا؟ ڈاکو مان سنگھ ہمیں نہیں چھوڑے گا وہ مجھے اور میری بیٹی کو قتل کر دے گا۔ یا اللہ اب کیا ہوگا؟" ندیم نے بوڑھے کو حوصلہ دیا۔ عائشہ اپنے باپ کے ساتھ سہمی ہوئی ہرنی کی طرح لگی کھڑی تھی۔ ندیم نے کہا" بابا! وہ ہندو کافر تھا ڈاکو تھا تیری حافظِ قرآن بیٹی کی عزت لوٹنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے قتل کر کے ایک مسلمان کا فرض ادا کیا ہے۔ تم گھبراؤ نہیں اگر یہ ڈاکو مان سنگھ کا ساتھی تھا تو کیا ہوا وہ تمھارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔" بوڑھے بنگالی نے ندیم کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا" اس کافر کی لاش کو وہیں پڑا رہنے دو۔ میں اب اپنی جھگی میں نہیں رہ سکتا مجھے راتوں رات اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے نکل جانا ہوگا۔" ندیم نے پوچھا" تمھاری جھگی کہاں ہے؟" بوڑھے مسلمان بنگالی نے اسے بتایا کہ جنگل میں جو مزدور درختوں کی کٹائی کرتے ہیں انھوں نے یہاں سے قریب ہی اپنی جھگیاں ڈال رکھی ہیں یہ سارے مزدور قریبی دیہات سے مزدوری کرنے وہاں آئے ہوئے ہیں۔" بوڑھا بنگالی مسلمان ندیم کو ساتھ لے کر پیچھے کی سمت چل پڑا۔ عائشہ اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی بوڑھا بنگالی جنگل کے تمام راستوں سے واقف تھا وہ جھاڑیوں میں سے نکل کر ایک طرف ہو گیا۔ یہاں چھوٹی سی پگڈنڈی بنی ہوئی تھی۔ یہ وہی راستہ تھا جہاں سے ہندو ڈاکو لڑکی کو گھسیٹتا ہوا اپنے ساتھ لایا تھا۔ جنگل کی تاریکی میں کوئی ایک فرلانگ چلنے کے بعد ایک تھوڑی سی کھلی جگہ آگئی۔ یہاں ندیم کو اندھیرے میں کچھ جھگیاں بنی ہوئی نظر آئیں جن پر موت ایسا سناٹا طاری تھا۔ بوڑھا ندیم کو کونے والی جھگی میں لے گیا۔ یہاں اندر ایک لالٹین ابھی تک روشن تھی بوڑھے نے جھگی کا دروازہ بند کر دیا جھگی کے اندر بانس کی دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کونے میں مٹی کے کچھ برتن پڑے تھے ایک جانب کلہاڑی اور پرانے کپڑوں کا ڈھیر پڑا تھا۔ عائشہ چارپائی پر چادر لپیٹ کر بیٹھ گئی۔ وہ ابھی تک ڈری ہوئی تھی۔ بوڑھے نے جلدی جلدی کپڑوں کو اٹھا کر ایک بوری میں ڈالا اور بولا" بیٹا! میں اپنی بیٹی کے ساتھ اب یہاں نہیں رہ سکتا۔ دن نکلتے ہی جب مان سنگھ کو

پتہ چلا کہ اس کا ایک ساتھی ہلاک کر دیا گیا ہے تو وہ یہاں کسی لڑکی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ ساری جھگیوں کو آگ لگا دے گا۔" اب عائشہ بھی اٹھ کر اپنے کپڑے وغیرہ سمیٹنے لگی۔ ندیم خاموش تھا۔ وہ بوڑھے اور اس کی بیٹی کو روک نہیں سکتا تھا۔ وہ انھیں روکنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ اس نے کہا، "بابا! تم رات کے اندھیرے میں بیٹی کو لے کر کہاں جاؤ گے"؟ بوڑھے نے کہا "ہمارا گاؤں یہاں سے دور ہے لیکن میں سب راستوں سے واقف ہوں۔ میں دن نکلنے تک ڈاکوؤں کی پہنچ سے کافی دور نکل چکا ہوں گا۔" ندیم چارپائی پر بیٹھ گیا اور بولا "بابا! ڈاکو مان سنگھ کا ٹھکانہ یہاں سے کتنی دور ہے؟" بوڑھے نے بوری میں دو چار برتن ڈالتے ہوئے کہا "وہ سامنے والے ٹیلے کے اوپر ایک غار میں رہتا ہے مگر وہاں کوئی نہیں جا سکتا۔ ٹھیکیدار مان سنگھ کو ہر ماہ لگی بندھی رقم ادا کرتا ہے تم بھی یہاں سے بھاگ جاؤ۔ تم ہمارے ساتھ چلے چلو۔ تم نے میری بیٹی کی عزت بچائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارے جاؤ۔" ندیم نے جھگی کی بانس کی چھت پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا "تمھارا شکریہ بابا لیکن میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" بوڑھے مسلمان بنگالی نے کپڑوں وغیرہ کی بوری اپنے کاندھے پر ڈالی۔ لالٹین کی روشنی گل کر دی۔ جھگی میں اندھیرا چھا گیا۔ وہ دروازہ کھول کر جھگی کے باہر ستاروں کی ہلکی ہلکی روشنی میں آ گیا ندیم بھی باہر آ گیا۔ دوسری جھگیوں پر تاریکی اور سناٹا چھایا تھا۔ بوڑھے مسلمان بنگالی نے ندیم کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"تو نے میری بیٹی کی عزت بچائی اللہ تجھے اس کا ثواب دے گا۔ میں اب بھی تمھیں کہوں گا کہ میرے ساتھ میرے گاؤں چلے چلو۔ وہاں پولیس چوکی بھی ہے تم کو وہاں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔"

پولیس چوکی کا سن کر ندیم اور زیادہ محتاط ہو گیا۔ اسے تو ویسے ہی بوڑھے کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ اس نے بوڑھے بنگالی سے کہا "تم جاؤ بابا۔ اللہ تمھاری حفاظت کرے۔ میں تمھارے ساتھ نہیں جا سکتا۔" بوڑھا بنگالی واپس مڑا اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے درختوں کی تاریکی میں گم ہو گئے۔ ندیم خالی جھگی کے باہر اکیلا رہ گیا۔ اس کھلی جگہ سے اسے سامنے والا ٹیلا دکھائی دے رہا تھا جس کی چوٹی کے پس منظر میں نیلے آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ کینوس کا تھیلا ندیم کے کاندھے سے لٹک رہا تھا پستول ندیم کی پتلون کی جیب میں

اور کمانی دار چاقو اس کی جیکٹ کی جیب میں تھا۔ رات نہ جانے کتنی گزر گئی تھی۔ اس نے آہستہ آہستہ ٹیلے کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ بہت جلد وہ مزدوروں کی جھگیوں سے نکل کر ایک بار پھر گھنے جنگل میں آ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو ٹیلے کے رخ پر ڈال دیا تھا اور درختوں کے نیچے سے گزرتا سیدھ میں چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے ہندو ڈاکو کا خیال آ رہا تھا۔ ندیم کے ہاتھوں زندگی کا پہلا قتل ہوا تھا۔ ایک عجیب بات تھی کہ ندیم کو کسی قسم کا ملال یا پچھتاوا نہیں ہو رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے ایک حافظ قرآن مسلمان بچی کی عزت بچانے کے لیے ایک کافر کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے میدان جنگ میں اسلام کے لیے جنگ کرتے ہوئے ایک کافر کو جہنم واصل کیا ہو۔ ایک آواز نے ندیم کے قدم پکڑ لیے۔ ندیم وہیں ساکت ہو گیا۔ یہ آواز جنگل کی جنوب کی جانب سے آئی تھی۔ ندیم وہیں ہمہ تن گوش رکا رہا۔ تھوڑی دیر بعد شیر کی آواز ایک بار پھر سنائی دی۔ اس بار آواز مزید دور ہو گئی تھی۔ آواز جنوب کی طرف سے آئی تھی اور بوڑھا مسلمان بنگالی اپنی بیٹی کو لے کر جنگل میں مشرق کی جانب گیا تھا۔ ندیم نے ایک بار پھر چلنا شروع کر دیا۔ چلتے چلتے وہ رات کی تاریکی میں ٹیلے کے دامن میں آ کر رک گیا۔ اس نے نظریں اٹھا کر ٹیلے کی چڑھائی کی طرف دیکھا۔ ٹیلے پر چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں چھتریوں کی شکل میں دور اوپر چوٹی تک چلی گئی تھیں۔ ستاروں کی پھیکی دھندلی روشنی میں ان جھاڑیوں میں کہیں کہیں درختوں کے سیاہ دھبوں ایسے جھنڈ بھی دکھائی دے رہے تھے۔ ندیم نے سوچا کہ اسے راتوں رات ٹیلے کی چڑھائی میں کہیں محفوظ جگہ پر چھپ جانا چاہیے تاکہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ کا وہ دن کی روشنی میں جائزہ لے سکے۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ یہاں کوئی باقاعدہ راستہ یا پگڈنڈی نہیں تھی۔ جس راستے سے ڈاکو آتے جاتے تھے وہ اس طرف نہیں تھا۔ ندیم ادھر جانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ وہ کمین گاہ کے عقب کی طرف سے جانا چاہتا تھا۔ چڑھائی زیادہ سیدھی بھی نہیں تھی مگر دشوار گزار ضرور تھی۔ جھاڑیاں کافی اونچی اونچی تھیں اور ان کی شاخیں بری طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ ندیم آہستہ آہستہ اوپر چڑھتا چلا گیا۔ اس کا سانس پھول گیا تھا۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ رک گیا اور دم لینے کے لیے ایک جگہ بیٹھ گیا۔ اس کے ارد گرد چھوٹے پتھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہاں سانپ بچھو کا بھی اسے خطرہ تھا۔ جب ذرا اس کا سانس درست

ہوا تو وہ اٹھا اور دوبارہ چڑھائی چڑھنے لگا۔ کسی وقت اسے آسمان پہ چمکتے ستاروں کی جھلک دکھائی دے جاتی تھی۔ اس کے بعد یہ ستارے جھاڑیوں کی اوپر تک پھیلی ہوئی شاخوں میں گم ہو جاتے۔ ایک جگہ ذرا کھلی جگہ آئی تو ندیم نے رک کر اوپر دیکھا۔ ٹیلے کی چوٹی قریب آ گئی تھی۔ ندیم رات کے وقت عدم واقفیت کی وجہ سے مزید خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ اسے وہیں کوئی ایسی جگہ تلاش کرنی تھی جہاں وہ چھپ کر دن نکلنے کا انتظار کر سکے۔ وہ گھاس، پتھروں اور جھاڑیوں میں چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ اُسے ایک کچّا راستہ دکھائی دیا جو اوپر ٹیلے کی چوٹی تک جاتا تھا۔ ندیم وہیں بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں اسے کچے راستے پہ گھوڑوں کے سموں کے نشان نظر نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن یہ بات یقینی تھی کہ یہی وہ راستہ تھا جس پر سے ڈاکو اوپر آتے جاتے تھے۔ ندیم اس راستے کے قریب مگر کچھ ہٹ کر کوئی محفوظ جگہ اپنے چھپنے کے لیے بنانا چاہتا تھا۔ وہ کچے راستے کے اوپر سے گزر کر ٹیلے کی اونچی جھاڑیوں میں دوسری طرف آ گیا۔ دوسری طرف کچھ درخت بھی تھے۔ یہاں آتے ہی اسے پانی کے گرنے کی ترل ترل ایسی آواز سنائی دی۔ ندیم پانی کی آواز کی طرف بڑھا۔ چند قدم چلا ہوگا کہ ایک چٹان کی دیوار سے جنگلی بیل چمٹی ہوئی تھی۔ ندیم چٹان کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں اس نے جھک کر دیکھا کہ ایک جگہ پتھروں میں سے پانی کی چھوٹی سی دھار نکل کر نیچے گر رہی تھی۔ نیچے پانی چھوٹے پتھروں میں سے ہو کر تیزی سے ڈھلوان کی طرف بہہ رہا تھا۔ ندیم پتھروں کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ کینوس کا تھیلا اتار کر نیچے رکھا۔ پانی چلّو میں لے کر چکھا۔ پانی میٹھا تھا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی اس نے سب سے پہلے جی بھر کر پانی پیا۔ پھر جیب سے کمانی دار چاقو نکال کر اس پہ ہندو ڈاکو کا لگا ہوا خون دھویا۔ پھر اچھی طرح سے ہاتھ صاف کیے۔ منہ پہ پانی کے دو چار چھینٹے مارے اور کینوس کا تھیلا کاندھے پہ ڈال کر غور سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ کوئی کھوہ تلاش کر رہا تھا جو اسے وہاں کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہاں اندھیرا ابھی کافی گہرا تھا۔ اگر ندیم کی آنکھیں جنگل کے اندھیرے کی عادی نہ ہو گئی ہوتیں تو اسے اتنا کچھ بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔ وہ چٹان کے عقب میں دوسری طرف نکل گیا۔ یہاں ایک جگہ جنگلی جھاڑیاں اندر کو چلی گئی تھیں۔ ندیم ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔ آگے اسے تاریک کھوہ نظر آیا۔ ندیم کے پاس ماچس موجود تھی مگر وہ وہاں روشنی کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اس نے آنکھیں پوری کھول

دیں اور غور سے جھک کر کھوہ کو دیکھا۔ پھر زمین پر سے ایک چھوٹا پتھر اٹھا کر کھوہ کے اندر پھینکا۔ پتھر اندر زمین پہ جا کر لگا۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر کوئی باؤلی یا کنواں وغیرہ نہیں تھا۔ ندیم یہ بھی اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ اس کھوہ میں کوئی جنگلی درندہ نہ سو رہا ہو۔ اس نے دوسرا پتھر زور سے کھوہ کے اندر پھینکا۔ پتھر کھوہ کی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر زمین پر گر پڑا۔ اب وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا۔ کھوہ کے اندر تاریکی میں آ گیا۔ اس نے دونوں بازو پھیلا کر اوپر کیے۔ اس کے ہاتھ کھوہ کی چٹانی چھت سے ٹکرائے۔ کھوہ کی چھت اس سے کوئی دو فٹ اونچی تھی۔ اب اس نے دیواروں کو ٹٹولا۔ یہ کھوہ چھوٹی سی تھی اور چھپنے کے لیے بڑی اچھی جگہ تھی۔ ندیم کو کسی ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی۔ کم از کم رات کا باقی حصہ وہ اس جگہ گزار سکتا تھا۔ اس نے کینوس کا تھیلا اتار کر زمین پہ رکھا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کھوہ میں ہلکی ہلکی گرمائش تھی۔ جبکہ باہر شبنم کی وجہ سے رات کی فضا خنک تھی۔ ندیم کو یہ بھی ڈر تھا کہ کہیں کسی طرف سے کوئی سانپ نہ نکل آئے۔ اس نے احتیاط کے طور پہ زمین پہ دو تین بار پاؤں مارا کہ اگر آس پاس سانپ بچھو ہو تو وہ اس آواز کی دھمک سن کر وہاں سے بھاگ جائے۔

تھوڑی دیر وہ کینوس کے تھیلے سے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا جنگل کی خاموشی کو غور سے سننے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ کسی طرف سے کوئی درندہ تو اس طرف نہیں بڑھ رہا۔ ٹیلے کے ڈھلان اور اوپر چڑھائی پر اُگے ہوئے جھاڑیوں کے جنگل میں موت ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس سناٹے میں خاموشی جیسے سنسنا رہی تھی۔ شیر کی آواز بھی اب سنائی نہیں دی تھی۔ ساکت بیٹھے بیٹھے ندیم کو نیند آنا شروع ہو گئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ یہ جگہ چونکہ نسبتاً محفوظ ہے اور ڈاکوؤں کی راہ گزر سے ہٹ کر جھاڑیوں کے اندر واقع ہے۔ اس لیے اسے کچھ دیر آرام کر لینا چاہیئے۔ ندیم وہیں کینوس کا تھیلا سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ پہلے تو اسے بالکل نیند نہیں آئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد اس کی آنکھیں بھاری ہونے لگیں اور پھر اُسے کوئی ہوش نہ رہا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو مچھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کا بُرا حال کر دیا تھا۔ ان مچھروں کی وجہ سے اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ آنکھ کھلتے ہی اسے جو چیز سب سے پہلے نظر آئی وہ کھوہ کی چھت کے ساتھ لٹکے ہوئے جالے تھے۔ کھوہ میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ندیم جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

تھیلے کو اس نے پڑا رہنے دیا اور خود کھوہ سے نکل کر جھاڑیوں میں سے گزر کر دبے دبے قدم اٹھاتا آہستہ سے باہر آ گیا۔ جنگلی جھاڑیوں اور درختوں میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ چٹان کی دیوار جنگلی بیلوں اور زنگار کی وجہ سے گہری سبز ہو گئی تھی۔ وہ چلتے ہوئے چٹان کی اوٹ میں اس جگہ آ کر بیٹھ گیا جہاں ذرا نیچے چند قدم آگے پتھروں میں سے پانی کی دھار نکل کر نیچے نالے میں گر رہی تھی۔ ندیم نے دیکھا کہ نالے کا پانی تیزی سے پتھروں سے ٹکراتا ہوا نیچے ڈھلوان کی طرف بہہ رہا تھا۔ اس چٹان کے پیچھے کچا راستہ تھا۔ مگر ندیم اس طرف ابھی نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس نے بائیں جانب ٹیلے کی بلندی کی طرف دیکھا۔ ٹیلے کی چوٹی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دن کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ وہ ٹیلے کی آدھی سے زیادہ چڑھائی چڑھ چکا تھا۔ وہ چٹان کی زنگ آلود دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکتا ہوا اس طرف نکل آیا جدھر کچا راستہ اوپر ڈاکو مان سنگھ کی کمین گاہ کی طرف جاتا تھا۔ راستہ ویران سنسان تھا۔ دونوں جانب جھاڑیاں ہی جھاڑیاں تھیں جو ٹیلے کے اوپر تک چلی گئی تھیں۔ دھوپ کی روشنی میں ندیم کو کچے راستے پر گھوڑوں کے سموں کے نشان صاف نظر آ رہے تھے اب اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ڈاکوؤں کی کمین گاہ اسی ٹیلے کے اوپر ہی تھی اور نجمی بھی اسی ٹیلے کے اوپر کسی جگہ ڈاکوؤں کی قید میں پڑی تھی۔ نجمی کا خیال آتے ہی ندیم کا دل بوجھل سا ہو گیا۔ وہ کچے راستے کی ایک طرف جھاڑی کی اوٹ میں کھڑا ٹیلے کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا۔ اوپر گہری خاموشی تھی۔ کسی جگہ سے دھواں بھی نہیں اٹھ رہا تھا۔ اچانک نیچے جنگل کے دامن کی فضا رائفل کے دھماکوں اور لوگوں کے شور سے گونج اٹھی۔ ندیم دوڑ کر چٹان کے نیچے آ گیا۔ نیچے دامن سے گولیوں کے دھماکے کچھ دیر تک سنائی دیتے رہے۔ لوگوں کا شور اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پھر گولیاں چلنے کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ درختوں پر سے جو پرندے شور مچاتے ہوئے اڑے تھے۔ ان کا شور بھی دب گیا۔ اس کے بعد چاروں طرف ایک سناٹا محیط ہو گیا۔ ندیم سمجھ گیا کہ یہ شور کیسا تھا۔ یقیناً مان سنگھ ڈاکو اور اس کے ساتھیوں کو اپنے ہمراہی ہندو ڈاکو کی لاش مل گئی تھی اور ان کی گولیاں مزدوروں کی جھگیوں پر قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ندیم کو افسوس ہوا کہ وہ ان لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکا تھا وہ دل میں دعا مانگنے لگا کہ مزدوروں میں سے کوئی قتل نہ ہوا ہو۔ شاید ڈاکو اس کے سہتے میں کچے راستے سے اتر کر نیچے دامن میں

گئے تھے وہ چٹان کی اوٹ میں جھاڑیوں کی شاخوں کے پیچھے ایک ایسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا جہاں سے اسے اوپر ٹیلے کی چوٹی پر جانے والا راستہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے گھوڑوں کے ہنہنانے اور ان کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ جھاڑیوں کے اور نیچے ہو گیا۔ اس نے اپنا سر نیچے کر لیا۔ اس کی آنکھیں کچے راستے پر جمی ہوئی تھیں۔ گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آ رہی تھیں۔ پھر اسے جھاڑیوں کے پیچھے سے گھوڑوں پر بیٹھے آدمی نظر آئے۔ ان کے لباس ڈاکوؤں ایسے تھے۔ کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ دو گھوڑے آگے آگے تھے۔ پیچھے خالی گھوڑے پر اس ہندو ڈاکو کی لاش تھی۔ جسے ندیم نے جہنم رسید کیا تھا۔ اس کے پیچھے دو دو کی قطاروں میں چھ ڈاکو گھوڑوں کو بڑھاتے چلے آ رہے تھے۔ جھاڑیوں سے کچھ فاصلے پر یہ ڈاکو کچے راستے سے گزرتے ہوئے اوپر کی طرف نکل گئے۔ اگلے دو گھوڑوں میں سے ایک گھوڑے پر جو آدمی ذرا آگے تھا اس کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں اور گولیوں سے بھری ہوئی بیلٹ اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس نے وسطی ہند کے ڈاکوؤں کے سرداروں کی طرح سر پہ نیلے رنگ کا بڑا سا کپڑا لپیٹ رکھا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کے پٹے گردن پر پڑ رہے تھے۔ یہ ڈاکو مان سنگھ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کا رنگ گہرا سانولہ تھا اور آنکھوں سے جیسے شرارے برس رہے تھے جب ڈاکو گزر گئے تو ندیم واپس اپنی کھوہ میں آ کر بیٹھ گیا۔

وہ سوچنے لگا کہ اگر وہ رات کے پچھلے پہر جاگ رہا ہوتا تو جب ڈاکو اپنی کمین گاہ سے نکل کر نیچے وادی میں گئے تھے تو وہ اوپر جا کر نجمی کو وہاں سے نکال لے جانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ ضرور اس وقت کمین میں دو چار ڈاکوؤں کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ مگر اب وقت گزر گیا تھا۔ ندیم کو مان سنگھ ڈاکو کی کمین گاہ کا سراغ مل گیا تھا۔ اب اسے کوئی ایسا منصوبہ سوچنا تھا جس پر عمل کرتے ہوئے وہ نجمی کو ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے نکال لے جانے میں کامیاب ہو سکے۔ اس نے کینوس کا تھیلا کھول کر اس میں سے ڈبل روٹی کے دو سلائس نکالے اور ساتھ مچھلی کا ٹکڑا نکال کر کھانے لگا۔ پھر اس نے اٹھ کر پانی پیا اور کھوہ میں آ کر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا اور غور کرنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ محفوظ منصوبہ تو یہی تھا کہ وہ ڈاکوؤں کی کسی واردات پر جانے کا انتظار کرے۔ جب وہ وہاں سے چلے گئے تو وہ اوپر جا کر نجمی کا سراغ لگائے اور اسے

وہاں سے فرار کروا کر اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ دو ایک ڈاکوؤں کا مقابلہ کر سکتا تھا اور انہیں ٹھکانے بھی لگا سکتا تھا لیکن تمام ڈاکوؤں کی موجودگی میں وہ یہ کام کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا اسے ایک نہایت بہتر اور ہوشیاری سے تیار کی گئی حکمت عملی کی ضرورت تھی۔ ندیم سارا دن اس کھوہ میں بیٹھا رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ممکن ہے ڈاکو اپنے سردار کے ہمراہ رات کے وقت واردات کرنے اپنی کمین گاہ سے نکلیں دوپہر کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے کھوہ سے نکل کر درختوں اور جھاڑیوں میں بہت چوکس ہو کر ادھر اُدھر ٹہلتا رہا اور دوبارہ واپس کھوہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ دوپہر کو بھی اس نے ڈبل روٹی کھا کر اپنا پیٹ بھر لیا تھا سیٹھ جبار نے اسے ڈبل روٹی دے کر اس پر بڑا احسان کیا تھا۔ اس کے کینوس کے تھیلے میں ابھی اتنی ڈبل روٹی باقی تھی کہ جس سے مزید دو دن وہ گزارہ کر سکتا تھا مچھلی کے قتلے بھی چھ سات تھے۔ ندیم نے فیصلہ کیا کہ اب وہ پیٹ بھر کر نہیں کھائے گا بلکہ تھوڑی تھوڑی ڈبل روٹی استعمال کرے گا کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ ابھی اسے کتنا وقت گزارنا پڑے گا۔ سہ پہر کے وقت ندیم تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو ٹیلے کے ڈھلان کے درختوں پر غروب آفتاب کے وقت سرخ سورج کی آخری کرنیں اپنا دامن کھینچ رہی تھیں پرندے بسیرا کرتے وقت شور مچا رہے تھے۔ درختوں اور جھاڑیوں کے نیچے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ ندیم کھوہ سے باہر نکل کر آیا اس نے چٹان کے پیچھے سے ٹیلے کی طرف جانے والے کچے راستے کو دیکھا یہ راستہ نیچے سے اوپر تک سنسان پڑا تھا۔ اچانک ایک طرف سے خوبصورت ہرن اچھل کر کچی سڑک کے بیچ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔ دائیں بائیں گردن موڑ کر دیکھا۔ پھر پی ہو کی آواز نکالی اور چھلانگ لگا کر سامنے والی جھاڑیوں میں غائب ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں جنگل میں اندھیرے کی حکمرانی ہو گئی۔ اور ٹیلے کی جھاڑیوں میں بھی اوپر سے نیچے تک سناٹا چھا گیا۔ ندیم نے تھوڑی سی ڈبل روٹی اور مچھلی کا ایک قتلہ کھایا۔ پتھروں کے پاس جا کر پانی پیا اور کھوہ میں آ کر سگریٹ سلگا کر بیٹھ گیا۔ وہ ساری رات جاگنا چاہتا تھا تاکہ جب ڈاکو کمین گاہ سے نکل کر نیچے جائیں تو اسے علم ہو سکے۔ لیکن یہ کوئی اتنا آسان کام نہیں تھا کیونکہ تھوڑی ہی دیر بعد نیند نے اس پر حملہ کر دیا۔ ندیم نے سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے شروع کر دیئے۔ پھر اس نے سگریٹ پینے

بھی بند کر دیئے۔ اسے اچانک خیال آیا کہ سگریٹ کے دھوئیں کی خوشبو آس پاس چھپے ہوئے کسی بھی شخص کو اس کی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔ وہ اوپر والی ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے زیادہ دور نہیں تھا اور دو چار ڈاکو ضرور کمین گاہ سے کچھ نیچے آ کر پہرے پر موجود ہوں گے۔ ندیم نے اتنا ضرور کیا کہ کھوہ کے باہر خشک پتے جمع کر کے ہلکی سی دھونی لگا دی۔ اس کی وجہ سے مچھروں کی تکلیف دہ یلغار ختم ہو گئی۔ پتوں کے دھوئیں کی خوشبو اتنی... خطرناک نہیں تھی۔ جنگل میں نیچے مزدوروں کی جھگیاں تھیں۔ یہ دھونی کی خوشبو وہاں سے بھی آ سکتی تھی۔ جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی جنگل کا سناٹا زیادہ گھمبیر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے بعد جنگل کی مخصوص آوازیں کبھی کبھی ابھرنے لگیں۔ ان میں کسی ہرن کی آواز کسی جانور کے پاؤں کی آواز اور دور نیچے وادی سے کبھی کبھی آنے والی کسی اُلو کی آسیبی آواز بھی شامل تھی۔ شیر کی آواز اس کے بعد پھر سنائی نہیں دی تھی۔ ندیم کو ایک بار بیچ میں نیند بھی آ گئی لیکن جلد ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور کھوہ سے نکل کر چٹان کے پاس آ گیا۔ کچا راستہ تاروں بھری رات کی دھندلی پھیکی روشنی کے سلیٹی رنگ کے غبار میں کہکشاں کی طرح لگ رہا تھا جو زمین پر آ کر بچھ گئی ہو۔ ندیم نے اوپر ٹیلے کی چوٹی کی طرف نگاہ ڈالی اوپر سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا کوئی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ندیم خاموشی سے کھوہ میں واپس آ کر بیٹھ گیا اور نیند کے خلاف اس کی جنگ شروع ہو گئی اسے خیال آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ ڈاکو آج رات کوئی واردات کرنے کمین گاہ سے نہ نکلیں لیکن ندیم کو بہرحال جاگنا تھا کیونکہ یہ ایک چانس تھا اور ندیم یہ چانس ضرور لینا چاہتا تھا اگر ڈاکو آج کی رات واردات کرنے نہیں جاتے تو ندیم دن کے وقت کھوہ میں سو کر اپنی نیند پوری کر سکتا تھا اس نے تنگ آ کر سگریٹ سلگا لیا اور اس کے ہلکے ہلکے کش لینے لگا۔ کھوہ کے باہر خشک پتوں کی دھونی بجھ گئی تھی اور مچھروں نے پھر حملہ کر دیا تھا۔ ندیم نے مچھروں کے اس حملے کا خیر مقدم کیا۔ اس طرح سے وہ سو نہیں سکتا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ رات کتنی گزر گئی ہے وہ اپنے کینوس کے تھیلے سے ٹیک لگائے کھوہ میں بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لگاتے ہوئے نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ ایکدم سے اس کے کان کھڑے

ہوگئے سگریٹ اس کے ہونٹوں کے پاس آ کر وہیں رک گیا۔ وہ دور سے آتی ہوئی گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز سن رہا تھا یہ آواز اوپر ٹیلے کی طرف سے قریب آتی محسوس ہو رہی تھی۔ ندیم نے سگریٹ پھینکا اور کھوہ سے نکل کر چٹان کی اوٹ میں چھپ کر کچے راستے کی طرف دیکھنے لگا گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز مزید قریب ہوگئی تھی۔ پھر چھ سات گھوڑے دوڑتے ہوئے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے یہ ڈاکو ہی تھے جو اپنے سردار کے ساتھ کوئی واردات کرنے جا رہے تھے قدرت نے ندیم کو نجمی کے پاس جانے کا ایک سنہری موقع فراہم کر دیا تھا جب گھوڑوں کی آواز دور نیچے وادی میں جا کر خاموش ہوگئی تو ندیم نے کینوس کا تھیلا وہیں کھوہ میں پڑا رہنے دیا۔ پستول نکال کر میگزین کو چیک کیا مزید چھ سات گولیاں اپنی جیب میں ڈالیں اور کھوہ سے نکل کر چٹان کی اوٹ سے ہوتا ہوا کچے راستے پر آ کر اس کے کنارے کی جھاڑیوں میں آ گیا۔ ایک پل کے لیے اس نے رک کر اندھیری فضا کا جائزہ لیا۔ کسی طرف کوئی آواز نہیں تھی۔ اوپر ٹیلے کی چوٹی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے نجمی ٹیلے کی چوٹی پر زنجیروں میں جکڑی ہی اسے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور جھاڑیوں کی اوٹ میں ہوتا ہوا ٹیلے کی چڑھائی چڑھنے لگا۔

- - ٭ - -

ندیم ٹیلے کے کچے راستے سے ہٹ کر اوپر چڑھ رہا تھا۔ آسمان پر چمکتے ہوئے ستارے اسے جیسے ٹکٹکی باندھے تک رہے تھے۔ جنگل کی رات سانس روکے ہوئے تھی۔ اندھیرے میں ندیم ایک ایک قدم بڑی احتیاط سے اٹھا رہا تھا۔ ٹیلے کی چڑھائی ہموار نہیں تھی جگہ جگہ گڑھے اور کھائیاں اس کا راستہ روک رہی تھیں مگر ندیم برابر آگے بڑھ رہا تھا۔ کچھ اور چلنے کے بعد کچا راستہ ٹیلے کے پہلو میں دائیں جانب مڑ گیا۔ ندیم بھی اس کے ساتھ ہی دوسری طرف والی جھاڑیوں میں آ گیا۔ وہ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھ رہا تھا کہ اس کے چلنے سے خشک پتوں کی آواز پیدا نہ ہو۔ کیکر ایسے چھتری دار درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہاں اندھیرا کافی گہرا تھا لیکن ندیم کی آنکھیں ستاروں کی روشنی میں راستہ تلاش کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ایک جگہ جھاڑیوں میں سے نکل کر وہ کچے راستے پر آ گیا اس نے اوپر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ ٹیلے کی چوٹی بہت قریب آ گئی تھی۔ اب اسے بہت احتیاط کی ضرورت تھی کیونکہ وہاں کسی بھی جگہ ڈاکو پہرے پر موجود ہو سکتے تھے۔ ندیم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ایک ایک جھاڑی ایک ایک درخت کو غور سے دیکھتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ وہ سانس لینے کے لیے درخت کی اوٹ میں بیٹھ گیا اس نے خاموشی کو غور سے سننے کی کوشش کی۔ کہیں کوئی ذرا سی آواز بھی نہیں آ رہی تھی وہ اٹھا اور دوبارہ ایک ایک قدم کر کے چڑھائی چڑھنے لگا۔ جب ٹیلے کی چوٹی کے چھتری دار درخت اندھیرے میں اسے قریب دکھائی دینے لگے تو وہ کچے راستے سے ہٹ کر پہلو میں بائیں جانب چلا گیا۔ وہ ڈاکوؤں کے راستے سے دور جا کر چوٹی کے عقب میں نکلنا چاہتا تھا کیونکہ یقینی بات تھی کہ جہاں راستہ ختم ہوگا وہاں دو تین ڈاکو پہرہ ضرور دے رہے ہوں گے۔ جنگلی جھاڑیوں میں راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔

بلکہ وہاں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ندیم کو خود راستہ بنا کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اب وہ دبے پاؤں چڑھائی چڑھنے لگا۔ وہ نصف دائرے میں چکر کاٹ کر ٹیلے کی چوٹی کے عقب میں ایک ایسی جگہ آ گیا جہاں زمین ہموار تھی اور ایک طرف ذرا اوپر ٹیلے کی چوٹی تھی۔ یہ ہموار تختہ قدرتی طور پر ایک ٹیریس کی شکل میں بنا ہوا تھا۔ یہاں اونچے اونچے درخت اور میں گھاس اگی ہوئی تھی۔ ندیم ذرا آگے گیا تو اس نے ایک چھوٹی سی پہاڑی ندی کو دیکھا جو خدا جانے کدھر سے بل کھاتی ہوئی ٹیلے کے گرد لپٹتی دائیں جانب گھوم گئی تھی۔ یہ وہی ندی تھی جہاں صبح کے وقت نجمی کو دو ڈاکو نہلانے کے لیے لایا کرتے تھے اور جس میں غوطہ لگا کر نجمی نے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ ندیم چپکے سے ندی کے کنارے بیٹھ کر ٹیلے کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگا جو اس سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہاں اندھیرا اور خاموشی چھائی تھی۔ ندیم اندھیرے میں بالکل ساکت بیٹھا اوپر تکتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیئے۔ اور ٹیلے کے اوپر کس طرف سے جانا چاہیئے۔ ابھی تک وہاں اسے کوئی پہرے دار دکھائی نہیں دیا تھا۔ کسی کے کھانسنے کی آواز بھی سنائی نہیں دی تھی۔ ندی کے کنارے کائی کی اونچی اونچی گھاس اگی تھی۔ ندیم اس گھاس کے اندر چپ چاپ بیٹھا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے ندیم کو چھو کر اوپر کی طرف جا رہے تھے۔ اچانک ندیم نے ہوا میں تمباکو کی بُو محسوس کی، اس نے جلدی سے اپنا سر نیچے کر لیا اور آہستہ آہستہ سانس لینے لگا۔ یہ کسی گھٹیا سگریٹ کے تمباکو کی بُو تھی۔ یقیناً کوئی قریب ہی موجود تھا۔ ندیم آنکھوں کو سکیڑ کر سامنے ان جھاڑیوں کی طرف دیکھنے لگا جو نیچے سے اوپر جاتی تھیں اسے کسی مرد کے آہستہ سے ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ پھر اسے جھاڑیوں میں کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے ہندی زبان میں دوسرے سے کہا کہ اوپر چل کر چائے پیتے ہیں۔ دوسرے نے اسے گالی دے کر کہا کہ مان سنگھ کو پتہ چل گیا تو ہماری خیر نہیں۔ چپکے سے راؤنڈ لگاتے رہو۔ پھر جھاڑیوں میں دو انسانی سائے نکل کر سامنے آ گئے۔ ان میں سے ایک سایہ سگریٹ پی رہا تھا۔ اندھیرے میں ندیم نے غور سے دیکھا کہ ان کے کاندھوں سے رائفلیں لٹک رہی تھیں۔ یہ ڈاکو تھے پہرہ دے رہے تھے اور اپنی راؤنڈ پر تھے۔ وہ باتیں کرتے ندیم کے سامنے سے گزر کر ندی کے کنارے کنارے چلتے دور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ ندیم نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔ یہ پہلا

نہیں تھے۔ سیٹھ جبار نے ٹھیک کہا تھا کہ مان سنگھ ڈکیت مدھیہ پردیش کا رہنے والا تھا اور اس کے ساتھی بھی اسی صوبے کے تھے۔ ان کی باتوں سے ایک بات واضح ہو گئی تھی کہ وہ ابھی اوپر نہیں جا رہے۔ ندیم نے موقع کو غنیمت جانا اور ندی کنارے کی اونچی گھاس سے نکل کر اوپر ٹوٹی کی طرف چلنے لگا اسے یہ دھڑکا ضرور لگا تھا کہ کہیں اوپر کوئی دوسرا ڈاکو پہرے پر نہ ہو۔ مگر اب وہ رک نہیں سکتا تھا۔ بے حد احتیاط کے ساتھ چڑھائی چڑھتے ہوئے وہ ٹیلے کے اوپر ہموار جگہ پر پہنچ گیا۔ یہاں اسے ایک کشادہ جگہ نظر آئی جہاں ایک طرف لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا۔ ندیم ایک بڑے پتھر کے پیچھے چھپ کر جائزہ لینے لگا۔ ستاروں کی دھیمی روشنی میں اسے وہاں کوئی انسان نظر نہیں آ رہا تھا۔ مگر یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کیا سبھی ڈاکو واردات کرنے گئے ہوئے تھے؟ وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ سامنے ایک کھوہ کے اندھیرے میں سے اسے دو انسانی سائے باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے ایک نے دوسرے سے کرخت لہجے میں پوچھا کہ چائے میں گڑ ڈالا تھا کہ نہیں؟ دوسرے ڈاکو کی آواز آئی: "پی کر تو دیکھ سالے۔"

وہ دونوں اندھیرے میں ہی ایک طرف بیٹھ گئے۔ ندیم نے اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں چائے کے مگ یا گلاس تھے۔ وہ دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں بھی کرنے لگے تھے۔ ندیم کو ان کی ہلکی ہلکی آواز ہی آ رہی تھی۔ الفاظ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔ بہت جلد ندیم نے اندازہ لگا لیا کہ یہاں صرف دو ڈاکو ہی ہیں۔ دو ڈاکو ٹیلے کے ارد گرد چل پھر کر پہرہ دے رہے تھے۔ وہ ڈاکو مان سنگھ کی خفیہ کمین گاہ میں پہنچ چکا تھا۔ اب اسے یہ معلوم کرنا تھا کہ نجمی کو ان لوگوں نے کہاں قید میں ڈال رکھا ہے اور کیا وہاں بھی کوئی باہر پہرہ دے رہا ہے کہ نہیں۔ ندیم کو اندھیرے میں وہاں سامنے مٹی کا ایک اونچا سا تودہ دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے باہر ایک طرف دونوں ڈاکو بیٹھے چائے پیتے ہوئے مدھم آواز میں باتیں کر رہے تھے وقت گزرتا جا رہا تھا۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ جو دو ڈاکو نیچے پہرہ دے رہے ہیں وہ بھی چائے پینے اوپر نہ آ جائیں۔ دوسرا خطرہ یہ بھی سر پر منڈلا رہا تھا کہ کہیں مان سنگھ ڈکیت اپنے ساتھیوں کے ہمراہ واردات کرنے کے بعد واپس نہ آ جائے۔ ندیم ایک طرح سے موت کے منہ میں آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اتنے میں دونوں ڈاکو سگریٹ بیڑی سلگانے کے بعد اٹھے اور قدم قدم چلتے ایک جگہ جھاڑیوں

کے پاس آکر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا: "جے سنگھ چلو نیچے کا چکر لگا آئیں۔ ادھر آج کوئی پہرے پر نہیں ہے۔"

دوسرا ڈاکو بولا: "ارے سالے اس چم چم باٹی کو یہیں چھوڑ دیں کیا؟"

پہلے ڈاکو نے گالی دے کر کہا کہ وہ تو رسیوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ سالی بھاگ کر کہاں جائے گی۔ ندیم نے یہ گفتگو غور سے سن لی تھی۔ دونوں ڈاکو جھاڑیوں کے قریب سے ہو کر ڈھلانی راستے پر اتر گئے۔ ضرور یہاں سے کچا راستہ نیچے وادی تک جاتا تھا۔ جب دونوں ڈاکوؤں کو گئے کچھ دیر گزر گئی اور ہر طرف ایک بار پھر سناٹا چھا گیا تو ندیم پتھر کے پیچھے سے نکلا اور جھک کر چلتا سامنے والے تودے کی طرف بڑھنے لگا۔ جس چم چم باٹی کا انھوں نے ذکر کیا تھا وہ سوائے نجمی کے اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور وہ کسی کھوہ میں رسیوں میں جکڑی پڑی تھی۔ یہ کھوہ سامنے والے تودے میں ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا غار وغیرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ندیم دبے پاؤں چلتا تودے کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ یہاں اسے ایک کھوہ کا دہانہ دکھائی دیا۔ جس کے باہر لکڑی کا ایک کھوکھا پڑا تھا اور اندر اندھیرا چھا رہا تھا۔ ندیم کو یہ خطرہ بھی تھا کہ کہیں اندر نجمی کی بجائے کوئی ڈاکو نہ سو رہا ہو۔ اس نے پستول جیب سے نکال کر پہلے ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ وہ تودے کی دیوار کے ساتھ لگ کر اردگرد اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے تکنے لگا۔ وقت گزرتا جا رہا تھا۔ اس نے کھوہ کے اندر جھانک کر دیکھا۔ اسے اندر سے کسی عورت کے آہستہ آہستہ کراہنے کی آواز سنائی دی۔ اندر کوئی عورت ہی تھی مرد نہیں تھا۔ ندیم جلدی سے کھوہ کے اندر داخل ہو گیا۔ اب اس کو نجمی کی کمزور، مرجھائی ہوئی آواز سنائی دی وہ یہ سمجھی کہ کوئی ڈاکو اندر آیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا: "میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میرے ہاتھ کھول دو پیچھے سے۔" ندیم کے دل پر جیسے تیر سا لگا۔ نجمی کی یہ حالت اس کی وجہ سے ہوئی تھی۔ وہ لپک کر اندھیرے میں آواز کی طرف بڑھا اور بولا: "نجمی! میں ندیم ہوں۔"

اس کے بعد وہاں ایک گہرا سناٹا چھا گیا اور اس سناٹے میں نجمی کے سسکیاں بھرنے کی آواز بار بار ابھرنے لگیں اس کا سر ندیم کے سینے سے لگا تھا۔ ندیم کی آنکھوں سے بھی آنسو گرنے لگے تھے اور نجمی اپنا سر اس کے سینے سے لگائے سسکیاں بھر رہی تھی۔ بہت جلدی ندیم کو احساس ہو

گیا کہ وہ کہاں پر ہے اور وہاں کس مقصد کے لیے آیا ہے۔ اس نے نجمی کے ماتھے کو چومتے ہوئے کہا۔

"نجمی! مجھے معاف کر دینا۔ میں نے دیر کر دی۔ اب جتنی جلدی ہو سکے میرے ساتھ یہاں سے نکل چلو۔"

ندیم نے نجمی کے پیچھے بندھے ہوئے ہاتھوں کی رسیاں کھول ڈالیں۔ نجمی اٹھ کھڑی ہوئی اور ندیم کے سینے کے ساتھ اپنا سر لگا کر بولی: "ندیم.... تم اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو۔ یہاں سے نکلنا اتنا آسان نہیں ہے تم اپنی جان بچا کر بھاگ جاؤ، میری تو قسمت میں ہی در در کی ٹھوکریں لکھی ہیں۔" دونوں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم نے اس کے سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پر عزم سرگوشی میں بولا: "نہیں.... ایسا نہ کہو تمھیں ابھی، اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہے۔ چلو ہمت کرو۔ باہر اس وقت کوئی نہیں ہے میرے پیچھے پیچھے جھک کر چلی آنا۔"

ندیم نے جیب سے پستول دوبارہ نکال کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور تیزی سے کھوہ کے باہر سر نکال کر دیکھا۔ سامنے چھوٹا سا ہموار صحن بالکل خالی تھا۔ ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑا اور کھوہ سے باہر نکل گیا۔ دونوں اندھیرے میں کمر جھکائے صحن پار کر کے سامنے والے ٹیلے والے بڑے پتھر کی اوٹ میں آ گئے۔ ندیم نے نجمی کے کان میں سرگوشی کی: "یہاں سے ہم ندی سے ہٹ کر نیچے اتریں گے گھبرانا بالکل نہیں۔ سارا راستہ میں نے دیکھ رکھا ہے۔"

ندیم نے نجمی کا ہاتھ پکڑا اور اسے ساتھ لے کر دوسری جانب ٹیلے کی ڈھلان اترنے لگا۔ یہ راستہ جھاڑیوں سے اٹا ہوا تھا اور مخالف سمت میں نیچے وادی میں جاتا تھا۔ ندیم اس کھوہ کی طرف بھی نہیں جانا چاہتا تھا جہاں اس کا کینوس کا تھیلا پڑا تھا کیونکہ وہ جگہ کچے راستے کے قریب واقع تھی اور اسی راستے پر یقینی طور پر دونوں ڈاکو موجود ہوں گے۔ اترائی پر ان کی رفتار تیز تھی۔ لیکن جگہ جگہ لمبی گھاس اور چھوٹی چھوٹی کھائیاں ان کا راستہ روک رہی تھیں۔ اب نجمی کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ فرار ہو سکتی ہے اور ندیم کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی۔ اس کے اندر بھی جیسے ایک نئی طاقت آ گئی تھی۔ اس نے نقاہت کے احساس کو اپنے جسم سے دور کر دیا تھا اور وہ ندیم کے پیچھے پیچھے تیز تیز قدموں سے کھائیوں اور جھاڑیوں سے بچتی نیچے اترتی جا

رہی تھی۔ ادھر بھی خطرہ ضرور تھا مگر ابھی تک انھیں کوئی ڈاکو وہاں نہیں ملا تھا۔ ٹیلے کی آدھی اترائی اترنے کے بعد ندیم نے نجمی کو ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ نجمی نے سرگوشی میں کہا "نہیں ندیم یہاں رکنا نہیں ہے۔ چلتے چلو۔" اور وہ ندیم کے آگے آگے چل پڑی۔ ندیم بھی نہ رکا۔ اندھیرے میں انھیں پانچ سات فٹ کے فاصلے سے آگے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پستول ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ نجمی نے اپنی پرانی ساڑھی کمر کے گرد لپیٹ رکھی تھی اس کے پاؤں میں ربڑ کی چپل تھی جس کی وجہ سے پاؤں بہت حد تک راستے کے کانٹوں سے محفوظ ہو گئے تھے۔۔۔ آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ ٹیلے سے نیچے اتر آئے اب ان کے سامنے ایک خشک نالہ تھا۔ جس میں اونچی اونچی گھاس اُگ رہی تھی۔ ندیم نے اپنا رخ مزدوروں کی جھگیوں کی طرف کر لیا تھا۔ جہاں اسے بوڑھا مسلمان بنگالی اپنی بیٹی عائشہ کے ساتھ جدا ہوا تھا۔ ندیم کا ارادہ یہ تھا کہ وہ مزدوروں کی جھگیوں کے قریب سے ہو کر اسی طرف نکل جائے گا جس طرف سے بوڑھا بنگالی مسلمان اپنی بیٹی کو لے کر گیا تھا اسی طرف آگے جا کر جیسا کہ بوڑھے نے کہا تھا کہ کوئی قصبہ تھا اگرچہ وہاں بقول اس کے پولیس کی چوکی بھی تھی لیکن ندیم نے سوچ رکھا تھا کہ وہ اس قصبے کے قریب سے ہو کر گزر جائے گا۔ کم از کم ادھر انسانی آبادی تو تھی جہاں ڈاکوؤں کے آنے کا زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ وہ نجمی کو ساتھ لے کر خشک نالے میں سے گزر کر اس کے دوسرے کنارے پر آ گیا جہاں سے وہ مزدوروں کی جھگیوں کی طرف چل پڑا۔ نجمی تھک گئی تھی۔ ندیم نے رک کر پوچھا "کیا تم آرام کرنا چاہتی ہو؟"

نجمی نے ندیم کا ہاتھ تھام لیا اور بولی "ادھر ہم کہاں جا رہے ہیں؟ وہ بڑا ظالم ڈاکو ہے۔ وہ ضرور میری تلاش میں ادھر آ جائے گا۔"

ندیم نے پوچھا "جب کبھی وہ کوئی واردات کرنے جاتا ہے تو واپس کس وقت آتا ہے؟"

نجمی نے اسے بتایا "کبھی کبھی وہ دن کے وقت واپس آتا ہے اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ صبح ہونے سے پہلے ہی واپس آ جاتا ہے۔"

ندیم نے نجمی کے الجھے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے پیار سے کہا "فکر نہ کرو اب دنیا کی کوئی طاقت تمھیں مجھ سے چھین نہیں سکتی۔ ڈاکو مان سنگھ آ گیا تو میرے پستول کی ساری گولیاں اسے بھون کر رکھ دیں گی۔" دو منٹ وہاں ستانے کے بعد ندیم اور نجمی پھر چل پڑے۔ ندیم کا خیال تھا کہ وہ مزدوروں کی جھگیوں کے پاس نکلے گا۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اندھیرے میں وہ راستہ بھول گیا تھا اور۔۔ جھگیاں اس کے پیچھے رہ گئی تھیں۔ چھتری نما جنگلی جھاڑیوں کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا اور اب اونچے اونچے دیودار کے درخت شروع ہو گئے تھے۔ ندیم کو یہ وہی جنگل لگا جس جنگل سے گزر کر وہ مان سنگھ ڈاکو کی کمین گاہ کی طرف آیا تھا۔ یہاں درختوں کے نیچے جھاڑیاں کم تھیں مگر گھاس بے تحاشہ اُگی ہوئی تھی۔ درختوں کے نیچے سے نکل کر وہ ذرا کھلی جگہ پر آئے تو ندیم نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر ستارے ماند پڑنے لگے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی۔ صبح ہونے والی تھی۔ نجمی بیٹھ گئی۔ ندیم نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا "میرا خیال ہے میں راستہ بھول گیا ہوں مگر فکر نہ کرو۔ بوڑھے بنگالی مسلمان کا قصبہ اسی جانب آگے ہو گا۔" پھر ندیم بھی نجمی کے پاس بیٹھ گیا اور اس نے نجمی کو بوڑھے مسلمان بنگالی اور اس کی بیٹی عائشہ کا سارا قصہ مختصر الفاظ میں سنایا۔ جب اس نے نجمی کو بتایا کہ اس نے ہی مان سنگھ ڈاکو کے ایک ساتھی کو قتل کیا تھا تو نجمی نے ندیم کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور بولی "مجھے تم پر بڑا فخر محسوس ہو رہا ہے۔ ندیم تم نے ایک پرہیزگار اور حافظ قرآن مسلمان بچی کی عزت بچا کر بڑا نیک کام کیا ہے وہ اپنے ساتھی کی لاش آج دن میں ہی اوپر لائے تھے۔ ڈاکو مان سنگھ آگ بگولا ہو رہا تھا انھوں نے نیچے کچھ مزدوروں کو قتل بھی کر ڈالا تھا۔"

ایک دم سے نجمی نے چونک کر اندھیرے میں ایک طرف دیکھا۔ ندیم نے جلدی سے نجمی کو پیچھے کر دیا اور چیتے کی طرح اچھل کر جھاڑیوں کی طرف لپکا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ نجمی آہستہ سے بولی "مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کوئی پتوں پر چل کر آ رہا ہے۔" ندیم نے پستول تان رکھا تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں گھوم پھر کر اچھی طرح سے جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ نجمی کے پاس آ کر بولا "یہاں سے نکل چلیں۔ نجمی ابھی ہم خطرے سے باہر نہیں ہوئے۔" انھوں نے ایک بار پھر جنوب کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ گھنا جنگل اب پیچھے رہ گیا تھا اور اونچا نیچا نسبتاً کھلا میدان شروع ہو گیا تھا۔ یہاں ناریل اور تاڑ کے درخت زیادہ اُگے ہوئے تھے۔ وہ کھائیوں اور گھاٹیوں سے گزرتے چلے گئے۔ آسمان پر صبح کاذب کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔ مشرق میں صبح کا تارا ماند پڑ رہا تھا۔ منہ اندھیرے کی دھندلی روشنی میں انھیں میدان میں ابھری ہوئی سیاہ چٹانیں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔

جب وہ ان سیاہ زنگ آلود چٹانوں سے نکلے تو مشرق میں دور ناریل اور تاڑ کے درختوں کے عقب سے سورج کا لرزتا ہوا سنہری مکھڑا اُبھرنے لگا تھا۔ اس کی سنہری روشنی چاروں طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ آگے ایک ندی آ گئی انھوں نے ندی پر منہ ہاتھ دھویا۔ ندی زیادہ چوڑی نہیں تھا۔ ندیم ندی میں اتر گیا پانی اس کی کمر تک آتا تھا۔ نجمی بھی پانی میں اتر گئی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر آ کر نجمی نے اپنی گیلی ساڑھی بیٹھ کر نچوڑی اور ندیم کے ساتھ چلنے لگی۔ اس نے ندیم سے پوچھا

"ہم کلکتہ سے کتنی دور ہوں گے ندیم! تمھیں تو اندازہ ہوگا۔"

ندیم نے کہا "میرا خیال ہے کہ ہم کلکتہ سے کافی دور ہیں ابھی۔ میں چاہتا ہوں کہ غیر آباد... راستوں سے ہوتے ہوئے ہی ہم کلکتہ کے مضافات میں پہنچیں۔ کیونکہ بوڑھے مسلمان بنگالی کا قصبہ اب شاید ہمیں نہ ملے۔"

سورج کافی اوپر آ گیا تھا۔ انھیں پہلی بار سامنے کچھ کھیت اور ایک باغ دکھائی دیا۔ باغ کی چاردیواری کو کیلے کے پتوں نے گھیر رکھا تھا۔ ندیم نے نجمی کو کھیت کے کنارے ایک طرف بیٹھنے کو کہا اور خود باغ کی طرف بڑھا۔ نجمی کھیت کے کنارے ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ یہ دھان کے کھیت تھے اور فصل کافی اونچی ہو رہی تھی۔ ندیم باغ میں کیلے کے درختوں کے نیچے آ کر رک گیا درختوں پر کیلے کے زرد گچھے لٹک رہے تھے۔ اس نے ایک گچھا چاقو سے کاٹ کر ہاتھ میں تھاما اور نجمی کے پاس آ کر زمین پر بیٹھ گیا۔ انھوں نے پیٹ بھر کر کیلے کھائے۔ یہ کیلے چھوٹے مگر بڑے میٹھے تھے۔ ندیم اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "باغ میں کوئی رکھوالا بھی نہیں تھا۔ آس پاس کوئی گاؤں بھی نظر نہیں آ رہا تھا شاید آگے کوئی آبادی ہو۔ یہ باغ اور کھیت کسی گاؤں کی موجودگی کا ثبوت ہیں۔ ہمیں آبادی سے دامن بچا کر نکلنا ہوگا۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ کلکتہ کی پولیس میری تلاش میں ہے۔"

وہ آگے روانہ ہو گئے۔ چلتے ہوئے ندیم نے نجمی کو اپنے ساتھ گزرے ہوئے سارے واقعات سنائے کہ کس طرح وہ فقیریئے کی مدد سے جیل سے فرار ہوا پھر کس طرح ایک ٹرک میں بیٹھ کر لکھنؤ پہنچا اور وہاں سے کلکتہ آیا تاکہ تمھیں اس جہنم سے نکال کر اپنے ساتھ مشرقی پاکستان لے چلوں۔

"نجمی! اب میں تمھارا انکار نہیں سنوں گا۔ سیٹھ جبار بڑا نیک دل مسلمان ہے۔ وہ ہمیں انڈیا کا

بارڈر کراس کرا دے گا۔ مشرقی پاکستان ہمارا اپنا وطن ہے۔ ہم وہاں پہنچتے ہی شادی کر لیں گے پھر لاہور چلے جائیں گے۔ تم سن رہی ہو نا؟"

نجمی نے چلتے چلتے ایک گہری نگاہ ندیم پر ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔ سورج کی روشنی میں ندیم نے دیکھا کہ نجمی کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ جو لاہور میں کبھی سرخ و سفید ہوا کرتا تھا۔ اب زردی مائل سبز سا ہو گیا تھا۔ ندیم نے پیچھے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ ڈاکو مان سنگھ کے علاقے سے نکل آنے پر دل میں خدا کا شکر ادا کرنے لگا۔ سب سے زیادہ خوشی اسے اس بات کی تھی کہ وہ نجمی کو بھی اس جہنم سے اپنے ساتھ نکال لایا تھا۔ یہ خدا کی مہربانی اور مدد سے ندیم نے بہت بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ یہ اسے معلوم تھا کہ اب تک مان سنگھ ڈاکو کے ساتھی نجمی کی تلاش میں آس پاس کے جنگلوں میں نکل چکے ہوں گے۔ لیکن اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ وہ ڈاکوؤں کی کمین گاہ سے کافی دور نکل آیا تھا۔ ایک اونچے ٹیلے سے وہ نیچے اترے تو انھیں بائیں جانب تاڑ کے درختوں میں ڈھلانی چھتوں والے مکانوں سے کہیں کہیں دھواں اٹھتا نظر آیا۔ یہ کوئی گاؤں تھا۔ گاؤں کے باہر تالاب تھا جہاں کچھ عورتیں بیٹھی کپڑے دھو رہی تھیں۔ ندیم نے نجمی سے کہا۔

"اگر تم ان عورتوں سے یہ معلوم کر لو کہ شہر یہاں سے کتنی دور ہے اور کس طرف ہے تو ہمیں بڑی آسانی ہو گی۔ تم بنگلہ روانی سے بول لیتی ہو۔ تم جاؤ میں اس جگہ تمھارا انتظار کرتا ہوں۔"

نجمی تالاب کی طرف چل دی اور ندیم ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ پستول ہاتھ میں لیے نجمی کو برابر دیکھ رہا تھا۔ نجمی بھی بنگالی ساڑھی میں ملبوس تھی اور شکل و صورت سے بالکل بنگالی عورت لگتی تھی۔ وہ عورتوں سے باتیں کرنے لگی پھر واپس آ گئی۔ اس نے واپس آ کر ندیم سے کہا "یہاں سے دو کوس آگے دھول گھاٹ کا قصبہ ہے اس قصبے سے شمال مغرب کی جانب تین کوس پر بڑی سڑک ہے جہاں سے لاریاں کلکتہ کی طرف جاتی ہیں۔"

ندیم نے اپنے دل میں سوچ رکھا تھا کہ وہ نجمی کو واپس گناہ کی بستی سوناگاچی میں جانے نہیں دے گا وہ اسے اپنے ساتھ سیٹھ جبار کے ذکریا اسٹریٹ والے ہوٹل میں لے جائے گا اور پھر وہیں سے اس کے ساتھ بارڈر کراس کر کے مشرقی پاکستان پہنچ جائے گا۔ اس مقصد کے لیے وہ کلکتہ شہر میں رات کے وقت پہنچنا چاہتا تھا تاکہ اندھیرے میں وہ پہچانا نہ جا سکے۔ اس نے

نجمی کو اپنے ارادے سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ وہ کلکتہ پہنچ کر یہ بات اسے بتانا چاہتا تھا۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ نجمی کو واپس مشرقی پاکستان جانے پر رضامند کر لے گا۔ اس نے نجمی سے کہا "میرا دن کی روشنی میں کلکتہ جانا خطرناک ہے تمھیں تو پولیس کچھ نہیں کہے گی لیکن میں گرفتار کر لیا جاؤں گا اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہمیں دن کسی جگہ چھپ کر گزار دینا چاہیے۔ جب رات ہو جائے گی تو ہم دھول گھاٹ سے آگے سڑک پر کوئی لاری پکڑ کر کلکتہ روانہ ہو جائیں گے۔"

نجمی کہنے لگی "تم کلکتے کہاں جاؤ گے؟ کیا اپنے سیٹھ جبار کے پاس ہی جاؤ گے؟"

"اور کہاں جا سکتا ہوں۔" ندیم نے سانس بھرتے ہوئے کہا "اصل میں تو میں تمھیں اپنے ساتھ یہاں سے لے جانے آیا تھا۔ میں تو اب بھی تمھیں یہی کہوں گا کہ اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا خیال دل سے نکال کر پھینک دو۔ ان لوگوں سے بدلہ لینے سے کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں بہرحال یہ ہمارا ملک نہیں ہے، دشمن ملک ہے۔ ہمیں اپنے ملک پاکستان میں ہی تحفظ مل سکتا ہے اور پھر کیا تمھیں اپنا شہر لاہور یاد نہیں آتا؟ یاد کرو ہم نے وہاں کتنے حسین دن گزارے ہیں۔ وہ ہمارا وطن ہے۔ وہاں ہمارا سب کچھ ہے۔"

نجمی نے اپنا ہاتھ ندیم کے ہونٹوں پر رکھ دیا "خدا کے لیے مجھے میرے ماضی کے حسین دن یاد نہ دلاؤ۔ میں انھیں بھول جانا چاہتی ہوں۔ وہ نجمی مر چکی ہے جس نے تمھارے ساتھ شادی کرنے کے لیے اپنے گھر سے باہر قدم رکھا تھا اور تمھارے ساتھ گھر چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ جن لوگوں نے میری عزت کا خون کیا ہے میں انھیں کیسے معاف کر سکتی ہوں۔ اگر میں نے ان سے انتقام نہ لیا تو مجھے قبر میں بھی چین نصیب نہیں ہوگا اور تب میں کچھ نہ کر سکوں گی۔ اٹھو ہمیں کلکتہ جانا ہے۔"

نجمی اٹھ کر دھان کے کھیتوں کے درمیان بنی ہوئی پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ ندیم ناامید نہیں ہوا تھا۔ وہ نجمی کو گناہ کی بستی میں چھوڑ کر واپس لاہور نہیں جا سکتا تھا اس نے سوچا کہ کلکتہ پہنچ کر وہ اسے رضامند اور قائل کرنے کی ایک اور کوشش کرے گا۔ کھیتوں، میدانوں اور ویرانوں میں سے گزرتے وہ دوپہر کے وقت دھول گھاٹ قصبے سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گئے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ دھول گھاٹ قصبے کے ایک منزلہ دو منزلہ کچے پکے کھپریل کے چھتوں والے مکان، آم کے درختوں کے جھنڈوں میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ قصبے کے باہر کھیتوں میں بنگالی کسان دھوتیاں

باندھے ہل چلا رہے تھے۔ کچھ فاصلے پر ایک بنگالی کسان تاڑ کے درخت پر تاڑی کے لیے مٹی کی ہنڈیا اتارنے اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ہنڈیا کسان شام کے وقت تاڑ کے درخت کی شاخ کاٹ کر باندھ دیتے ہیں۔ ساری رات تاڑ کا دودھ ایسا رس قطرہ قطرہ اس میں ٹپکتا رہتا ہے۔ اگر یہ ہنڈیا سورج نکلنے سے پہلے درخت سے اتار لی جائے تو اس تاڑی میں نشہ بالکل نہیں ہوتا اور اس کا ذائقہ دہی کی لسی جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے دوپہر کے وقت اتارا جائے تو دھوپ کی وجہ سے اس میں نشہ پیدا ہو جاتا ہے۔

ندیم نے نجمی سے کہا "ہمیں آبادی اور لوگوں سے دور رہ کر ہی چلنا چاہیے۔" وہ ایک چکر کاٹ کر دھول گھاٹ قصبے کے شمال مغرب کی طرف آ گئے۔ یہاں انھیں آم کے ایک گنجان درخت تلے خالی جھونپڑی مل گئی۔ اس کی چھت پر توری کی زرد پھولوں والی بیل چڑھی ہوئی تھی۔ ندیم نے کہا "ہم اس خالی جھونپڑی میں دن کا باقی حصہ گزار سکتے ہیں۔ جب سورج غروب ہوگا اور شام ہو جائے گی تو بڑی سڑک پر جا کر کلکتے جانے والی لاری پکڑ لیں گے۔" نجمی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جھونپڑی میں زمین پر سوکھی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ کونے میں دس بارہ کچے ناریل پڑے تھے۔ ندیم نے چاقو سے ایک دو ناریل کاٹ دیے۔ انھوں نے ان کا پانی پیا مگر بھوک نہ مٹ سکی۔ دھول گھاٹ قصبے کے مکان وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ ندیم کہنے لگا "میرے پاس پیسے ہیں میں ذرا قصبے میں جا کر کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔ بھوک تمھیں بھی لگ رہی ہوگی۔"

نجمی نے کہا "تم مت جاؤ میں جا کر لے آتی ہوں۔"

ندیم بولا "میرے جانے میں کیا حرج ہے بھلا۔ یہ گمنام سا قصبہ ہے اور یہاں مجھے کوئی پہچاننے والا آدمی بھی دکھائی نہیں دے رہا۔ تمھارا جانا مناسب نہیں۔ ممکن ہے ڈاکو مان سنگھ کا کوئی مخبر اس قصبے میں موجود ہو۔ تم اس جھونپڑی میں ہی بیٹھو میں ایک منٹ میں کچھ لے کر آتا ہوں۔"

نجمی کا دل نہیں مان رہا تھا مگر ندیم جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ بھرا ہوا پستول اور چاقو نجمی کی جیب میں ہی تھی اس نے جانے سے پہلے نجمی کو سارے پیسے دے دیے تھے۔ صرف پچاس روپے اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ جھونپڑی کے سامنے ایک کچا راستہ تھا۔ نجمی ندیم کو کھیتوں میں گزرتے دیکھ رہی تھی۔ اسے لاہور کے وہ دن یاد آ گئے جب ندیم اس سے ملنے یونیورسٹی

کیمپس آیا کرتا تھا اور وہ اسے کیمپس کے لان میں سے اپنی طرف آتا دیکھا کرتی تھی ۔ وہ دن خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئے تھے اس کے ایک چھوٹے سے غلط قدم اٹھانے کی وجہ سے حالات نے ان دونوں کو کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا ۔ ندیم ناریل کے درختوں سے گزر کر قصبے کے مکانوں کے پاس پہنچ گیا تھا ۔ پھر وہ کونے والے دو منزلہ مکان کی دیوار کے پیچھے چلا گیا ۔ نجمی دل میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگنے لگی ۔ ندیم قصبے کے کونے والے مکان کی دیوار سے نکل کر قصبے کے چھوٹے سے بازار میں آگیا ۔ یہ چھوٹا سا بازار تھا جس میں دو چار دکانیں ہی تھیں ۔ ندیم جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ دیئے ۔ سر کو ذرا سا جھکائے مگر چاروں طرف سے پوری طرح باخبر بازار میں چلنے لگا ۔ وہ کسی چائے خانے کی تلاش میں تھا جہاں سے اسے کچھ کھانے کو مل سکے۔ بنگال کے قصبوں اور یہاں تک کہ چھوٹے دیہات میں بھی ایک آدھ کھنڈار ایسا ضرور ہوتا ہے جہاں کانسی کے گلاسوں میں چائے وغیرہ مل جاتی ہے ۔ ندیم کو ایک دکان کے باہر کچھ دیہاتی بینچ پر بیٹھے چائے پیتے نظر آئے ۔ وہ اسی دکان کی طرف بڑھا ۔ بازار بالکل خالی تھا ۔ سامنے سے ایک آدمی سفید رنگ کے بیل کی رسی پکڑے اسے کھینچے لیے چلا آرہا تھا ۔ چائے کی دکان میں انگیٹھیوں کے پاس ایک ادھیڑ عمر کا بنگالی بیٹھا کیتلی میں چمچہ ہلا رہا تھا ۔ ندیم نے اس سے پوچھا کہ اس کے پاس ڈبل روٹی یا بند وغیرہ ہو گا ۔ اس نے ٹین کے صندوق میں سے ایک ڈبل روٹی نکالتے ہوئے پوچھا ”کتنی ڈبل روٹی لو گے بابو ؟“

ندیم نے کہا ”پوری ہی دے دو ۔ ساتھ کچھ چٹنی وغیرہ مل جائے گی ؟“

دکاندار بولا ”چٹنی تو نہیں ہے آلو کی بھجیا ہے وہ ڈال دوں ؟“

ندیم نے جلدی سے کہا ”ہاں ہاں وہی ڈال دو کسی دونے میں “ دکاندار دونا تلاش کرنے لگا ۔ اتنے میں ندیم کو موٹر کے انجن کی آواز سنائی دی اس نے ذرا سا چونک کر سامنے بازار کی نکڑ کی طرف دیکھا وہاں سے ایک سبز رنگ کی فوجی جیپ تیزی سے موڑ کاٹ کر بازار میں آگئی ۔ ندیم کا دل زور سے دھڑک اٹھا ، نہیں نہیں انہیں کیا پتہ کہ میں کون ہوں ؟“ ندیم نے سوچا ۔ جیپ گرد کا غبار اڑاتی برق رفتاری سے چل کر ندیم کے پیچھے آن کھڑی ہوئی ۔ ابھی ندیم سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ جیپ میں سے چار یا پانچ فوجی چھلانگیں لگا کر باہر کودے اور انھوں نے ندیم کو گھیرے میں لے لیا ۔ ان کی بندوقوں کا رخ ندیم کی طرف تھا ۔ ندیم کا رنگ اڑ گیا اور ہکا بکا سا ہو کر ان کی طرف دیکھنے لگا ۔ یہ بنگالی فوجی تھے اور ان کی وردیوں کا رنگ گہرا سبز تھا ۔ ان کے افسر نے آگے بڑھ کر ندیم کو بازو سے پکڑ کر جیپ کی طرف زور سے دھکا دیا اور بولا ”ہم کل سے تیری تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں “ اس نے فوجیوں کو حکم دیا کہ اسے جیپ میں ڈال کر لے چلو ۔ تین فوجی لپک کر ندیم کی طرف بڑھے اور اسے دبوچ کر گھسیٹتے ہوئے جیپ کی طرف لے گئے ۔ وہ کہتا ہی رہ گیا کہ میرا قصور کیا ہے ؟ مجھے کیوں پکڑ رہے ہو ؟ لیکن کسی نے اس کی ایک نہ سنی اور اسے جیپ میں ڈال کر چار فوجی اس کے آمنے سامنے والی نشستوں پر بیٹھ گئے ۔ اس پر تان کر بیٹھ گئے ۔ فوجی افسر نے قریب آکر کہا ”اس کی تلاشی لے لو “ تلاشی لینے پر ندیم کی جیب میں سے بھرا ہوا پستول ، فالتو گولیاں اور کمانی دار چاقو برآمد ہو گیا بنگالی فوجی افسر نے طنز بھری ہنسی ہنس کر کہا ۔

” سالا اسلحہ ساتھ لیے پھر رہا ہے ۔ پاکستانی جاسوسوں کو یہاں اسلحہ کون سپلائی کرتا ہے ؟ ابھی معلوم ہو جائے گا ۔ چلو ہیڈ کوارٹر کی طرف ۔ “

فوجی افسر اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا اور جیپ تیزی سے بازار میں سے نکل کر اس کچے راستے پر آگئی جہاں سے گزر کر ندیم قصبے میں داخل ہوا تھا ۔ نجمی جھونپڑی کے باہر ایک طرف درخت کی اوٹ میں کھڑی ندیم کی واپسی کا بے تابی سے انتظار کر رہی تھی کہ اچانک اس نے ایک ملٹری جیپ کو قصبے کے بازار میں سے نکل کر کچے راستے پر آتے دیکھا اس کا دل دھک سے رہ گیا ۔ اس کی نگاہوں نے ندیم کو کھلی جیپ میں فوجیوں کے نرغے میں بیٹھے دیکھ لیا تھا ۔ ندیم بھی سر اٹھائے جھونپڑی کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی مضطرب اور اداس نگاہیں بھی جھونپڑی پر لگی تھیں ۔ جہاں سے نجمی دکھائی نہیں دے رہی تھی ۔ نجمی جھونپڑی کے درخت کے پیچھے کھڑی تھی ۔ اس کی نظروں کے سامنے فوجی جیپ ندیم کو لے کر اس کچے راستے پر گرد اڑاتی دوڑتی چلی گئی ۔ یہ دھول اڑاتی قصبے سے بڑی سڑک کی طرف جاتی تھی ۔ اور جہاں سے انھیں آج شام کو اندھیرا ہو جانے کے بعد کلکتہ جانے والی لاری پکڑنی تھی ۔ جیپ ندیم کو لے کر فوجی جیپ نجمی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تو وہ دل کو پکڑ کر وہیں بیٹھ گئی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا ؟ کیا کسی نے اس کی مخبری کر دی تھی ؟ لیکن یہ تو فوجی جیپ تھی ۔ ندیم کو بھارتی فوج کے سپاہیوں نے گرفتار کیا تھا ۔ یہ بنگال کی پولیس نہیں تھی ۔ نجمی بنگالی

پولیس کی وردی کو دور سے پہچان سکتی تھی۔ یہ بات نجمی سے چھپی ہوئی نہیں تھی کہ ندیم پاکستان سے ویزا لے کر بھارت آیا تھا۔ اس کا ویزا دلّی کا تھا۔ جہاں سے وہ صرف نجمی کی خاطر لا پتہ ہو کر کلکتہ آ گیا تھا اور تب سے لے کر اب تک مصیبتیں سہہ رہا تھا۔ یہ ساری اذیتیں اس نے صرف نجمی کی خاطر برداشت کی تھیں اور نہ جانے ابھی اسے تشدد اور اذیت کے کن کن غیر انسانی مرحلوں سے گزرنا تھا یہ سوچ کر نجمی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ خالی جھونپڑی کی دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھی ندیم کے لیے آنسو بہانے لگی۔ اسے لاہور میں اپنے کالج اور ندیم سے محبت کا وہ زمانہ یاد آ گیا جب وہ اپنے وطن کی آزاد فضاؤں میں ایک دوسرے سے ملا کرتے تھے۔ باغ جناح کے اوپن ائیر کیفے کے کیبن میں اور کیمپس کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر چائے پیا کرتے تھے اور محبت بھری باتیں کیا کرتے تھے۔ کاش اس کے ماں باپ ندیم کے رشتے کو منظور کر لیتے۔ کاش وہ اپنے گھر سے بھاگنے کا فیصلہ نہ کرتی۔ لیکن اب پچھتانے سے اور گزری ہوئی حسین یادوں کو دل میں لانے سے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جب رونے سے نجمی کے دل کا غبار کچھ ہلکا ہوا تو اچانک اسے خیال آیا کہ وہ بڑے خطرے میں ہے۔ وہ اکیلی ہے، نہتی ہے اور رمان سنگھ ڈاکو کے آدمی اس کی تلاش میں وہاں بھی آ سکتے ہیں۔ نجمی نے جلدی سے اٹھ کر اپنی ساڑھی کے پلو کو کمر کے ساتھ باندھا، بالوں کو درست کیا اور جھونپڑی سے نکل کر کچے راستے کی طرف چلنے لگی۔ ندیم اسے سو سو کے پانچ نوٹ دے گیا تھا۔ نجمی کی آنکھوں میں چلتے چلتے پھر آنسو آ گئے۔ کاش یہ رقم اس نے اپنے پاس رکھی ہوتی۔ وہ فوجیوں کو رشوت دے کر بھی بھاگ سکتا تھا۔ لیکن یہ نجمی کی خوش فہمی تھی۔ ندیم پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام تھا۔ انڈین فوجی اسے کبھی نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

نجمی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا صرف ناریل کا پانی ہی پیا تھا اسے اپنے جسم میں نقاہت... محسوس ہو رہی تھی مگر بھوک اسے بالکل نہیں تھی۔ ندیم کی گرفتاری کی وجہ سے اس کی بھوک جیسے مر گئی تھی۔ اسے ابھی تین کوس کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ کچے راستے کی دونوں جانب کہیں کہیں ناریل کے درخت جھکے ہوئے تھے۔ نجمی راستے کی ایک جانب ہو کر کنارے کنارے چل رہی تھی۔ بمشکل اس نے ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ اسے پیچھے سے ایک بیل گاڑی آتی نظر آئی۔ اس قسم کی بیل گاڑیاں بنگال کے دیہات میں عام چلا کرتی ہیں ان کے اوپر بانس کی تیلیوں سے بنی ہوئی گنبد نما

چھت پڑی تھی۔ ایک بوڑھا بنگالی دیہاتی گاڑی کے آگے بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا۔ نجمی رک گئی۔ جب بیل گاڑی قریب آئی تو نجمی نے بنگلہ زبان میں بوڑھے سے کہا کہ وہ اسے پکی سڑک تک لے جائے۔ بوڑھے نے گاڑی روک دی اور نجمی کو بٹھا لیا۔ نجمی نے بوڑھے کو بتایا کہ وہ دھول گھاٹ میں اپنی ماسی سے ملنے آئی تھی جو کسی دوسرے گاؤں گئی ہوئی ہے۔ اب وہ واپس شہر کی لاری پکڑنا چاہتی ہے۔ پکی سڑک پر آ کر نجمی گاڑی سے اتر کر لاریوں کے اڈے پر آ گئی۔ یہاں کچھ دیہاتی لوگ ادھر ادھر بیٹھے لاری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ کسی نے نجمی کی طرف کوئی خاص دھیان نہ دیا۔ نجمی کو پہچانے جانے کی فکر بھی نہیں تھی وہ تو بھارت کی شہری ہو چکی تھی اور ڈاکوؤں کے چنگل سے فرار ہو کر آ رہی تھی۔ وہ ملزم نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کلکتہ جانے والی لاری آ گئی۔ نجمی بوجھل دل کے ساتھ اس میں سوار ہو گئی اور لاری کلکتہ کی طرف روانہ ہو گئی۔

دوسری طرف ندیم کو لے کر بنگال رائفلز کی فوجی جیپ کلکتہ کے مضافات میں سے گزرتی ہوئی دریائے ہگلی کا ہوڑہ برج عبور کر کے شہر کے بارونق بازاروں میں پہنچ چکی تھی۔ ندیم کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ ان لوگوں کا ہیڈ کوارٹر کہاں ہے۔ جہاں وہ اسے لے جا رہے ہیں وہ کھلی جیپ کے درمیان میں چار بنگالی فوجیوں کے درمیان سر جھکائے بیٹھا نجمی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے اس بات کی بڑی خوشی تھی کہ نجمی ان انڈین فوجیوں کے قابو میں آنے سے بچ گئی تھی۔ ورنہ ایک "پاکستانی جاسوس" کی مدد کرنے کے الزام میں نہ جانے اس پر کیا قیامت گزرتی۔ جب جیپ چلی تھی تو ندیم کو ان انڈین فوجیوں نے اپنے گھٹنوں میں تقریباً دبوچ رکھا تھا، لیکن راستے میں جھٹکے لگتے رہے تھے اور اب یہ صورتحال تھی کہ فوجیوں کی برین گنوں کا رخ ضرور ندیم کی جانب تھا لیکن وہ ان کے درمیان جیپ کے فرش پر ذرا کھل کر بیٹھا ہوا تھا یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیچھے نہیں باندھے گئے تھے۔ ندیم کے دل میں کلکتہ شہر کے بازاروں میں آتے ہی خیال آیا کہ وہ فرار ہونے کی کوشش کرے تو فرار ہو سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں جان جانے کا خطرہ موجود تھا لیکن فوج اور پھر بنگال اور دلی پولیس کے تشدد کے بعد بھی وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ مرنا تو اسے تھا ہی، تو پھر کیوں نہ ایک بار جان کی بازی لگا دی جائے۔ ندیم نے اس خیال کے آتے ہی جھکے ہوئے سر کے ساتھ بازار کا جائزہ لینا شروع کر دیا۔ جیپ جس بازار میں سے گزر رہی تھی وہاں ٹریفک اور پبلک کا رش اتنا

زیادہ نہیں تھا۔ بازار بھی کشادہ تھا اگر وہ چھلانگ لگا کر بھاگتا ہے تو پیچھے سے برین گنوں سے
نکلی ہوئی گولیاں اسے بازار میں ہی بھون سکتی تھیں۔ دوسرے جیپ کی رفتار بھی تیز تھی۔ اس
رفتار پر بھاگتی ہوئی جیپ سے اگر وہ چھلانگ لگائے گا تو سڑک پر گرنے کے بعد زخمی ہو
جانا یقینی تھا۔ ندیم خاموشی سے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا۔ بنگالی فوجی سگریٹ کا دھواں اڑاتے ہوئے
ایک دوسرے سے پنجابی زبان میں خدا جانے کیا باتیں کر رہے تھے۔ ایک فوجی کا گھٹنا ابھی تک ندیم
کی پسلیوں سے برابر ٹکرا رہا تھا۔ فوجی جیپ کشادہ بازار کا موڑ گھوم کر نسبتاً چھوٹے بازار میں
داخل ہو گئی۔ اس بازار میں دکانوں پر کافی رش تھا۔ بازار میں بھی بنگالی لوگ زیادہ تعداد میں
آجا رہے تھے۔ ندیم چوکنا ہو گیا۔ اس کے جسم میں خون گرم ہو کر گردش کرنے لگا۔ اس نے
بازار میں نکلتی کچھ چھوٹی گلیاں بھی دیکھیں جیپ کی رفتار بھی ہلکی ہو گئی تھی۔ ندیم جہاں بیٹھا تھا وہاں
جیپ کا عقبی دروازہ کھلا تھا۔ بلکہ دروازہ تھا ہی نہیں۔ اس کا منہ بھی بازار ہی کی جانب تھا اس
کے آگے چھوٹی سی آڑ تھی جس پر سے ندیم آسانی سے چھلانگ لگا سکتا تھا۔ یہ ایک انمول موقع
تھا۔ ندیم کے کان گرم ہو گئے۔ آنکھیں سکڑ گئیں۔ پاؤں کے پنجے کینوس کے جوتوں کے اندر سمٹ
گئے۔ اس نے دونوں ہاتھ بغلوں سے نکال کر ایک مصنوعی چھینک ماری اور اس کے ساتھ ہی اللہ
کا نام لے کر چلتی جیپ میں سے سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ وہ پیچھے کی طرف گرا۔ اسے جیپ کے
ایک دم بریک لگنے، فوجیوں کے شور مچانے کی آواز آئی۔ وہ اٹھا اور لوگوں کی ٹانگوں میں گھس کر
ایک طرف کو بھاگا۔ وہاں لوگ اتنے تھے کہ فوجی فائر نہیں کر سکتے تھے۔ پھر بھی اسے گولیوں کی
آوازیں سنائی دیں۔ یہ یقیناً ہوائی فائر تھے۔ ندیم جوان تھا اس کی رگوں میں جوان خون گردش کر
رہا تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ ملٹری انٹیلی جنس اور پولیس کا محکمہ اس کے ساتھ کس قسم کا وحشیانہ
سلوک کرنے والا ہے۔ اس کے اندر زبردست طاقت آ گئی تھی۔ بازار میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ ندیم
کو سامنے ایک گلی نظر آئی وہ بے تحاشا دوڑتا ہوا اس گلی میں گھس گیا۔ فوجیوں کے بھاری
بوٹوں کی دھپ دھپ کرتی آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ ندیم کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ گلی
آگے کہاں جا کر نکلتی ہے اور نکلتی بھی ہے یا آگے جا کر بند ہو جاتی ہے۔ گلی میں اس نے
بھاگتے ہوئے صرف اتنا دیکھا کہ دائیں بائیں مکانوں یا فلیٹوں کے زینے تھے جن کے دروازے

پر عورتیں بیٹھی شاید بیڑیاں بنا رہی تھیں۔ ندیم دوڑتا چلا گیا پیچھے فائر ہوا اسے یوں لگا جیسے
گولی اس کے کان کے قریب سے گزر گئی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ پوری باڑ کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ ندیم دیوانہ وار
ایک چھوٹی سی گلی میں گھس گیا جو اس گلی میں سے دائیں طرف نکلتی تھی۔ وہ بھاگ کر آگے گیا تو
اس کا دل زور سے اچھلا گلی آگے بند تھی۔

٭٭٭

ندیم کو کیا معلوم تھا کہ یہ گلی آگے جا کر بند ہو جائے گی۔ اپنی جان بچانے کے لیے اسے جو گلی سامنے نظر آئی وہ اس میں گھس گیا تھا۔ کلکتہ ویسے بھی اتنا بڑا شہر تھا کہ یہ علاقے ندیم کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ بنگال رائفلز کے انڈین فوجی اس کے پیچھے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ ندیم کے پاس پیچھے مڑ کر دیکھنے کی بھی مہلت نہیں تھی۔ اسے اپنے دائیں جانب ایک مکان کا دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔ وہ کچھ نہیں جانتا تھا کہ کس کا مکان ہے اور اس میں کون رہتا ہے۔ وہ اندھا دھند اس مکان کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر جاتے ہی ندیم نے غیر شعوری طور پر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ اس کے ساتھ ہی اسے سامنے والے کمرے سے کسی بھاری بھرکم مرد کی آواز آئی۔

"کون ہے اوئے باہر؟"

لہجہ پنجابی اور ضلع جھنگ کا تھا۔ کمرے کے دروازے پر پردہ لٹک رہا تھا۔ ندیم نے سوچا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ موت تو اس کے سر پر پہنچ ہی چکی ہے۔ وہ پردہ ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ اونچی پشت والے پلنگ پر ایک پکی عمر کا آدمی بوسکی کی قمیض اور نیلے ساٹن کی دھوتی پہنے نیم دراز حقہ پی رہا تھا۔ ندیم کی نگاہ بے اختیار دیوار پر پڑی جہاں مکے مدینے کا ایک قطعہ لگا ہوا تھا۔ یہ آدمی مسلمان ہے۔ اس خیال کے آتے ہی ندیم نے کلمہ شریف بلند آواز میں پڑھتے ہوئے کہا۔

"میں مسلمان ہوں۔ پولیس میرے پیچھے لگی ہے۔ اس وقت آپ مجھے بچا لیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

وہ آدمی حقے کی نے کو آگے سے ہٹاتے ہوئے اٹھا۔ اس نے اپنے لمبے بال خضاب سے کالے کیے ہوئے تھے۔ رنگ سانولا، جبڑا چوڑا اور ناک یونانیوں کی طرح ستواں تھا۔ خدا جانے اس کے دل

پر ندیم نے جو کلمہ شریف پڑھا تھا اس کا اثر ہوا تھا۔ یا کیا بات تھی کہ اس آدمی نے ندیم کو ساتھ لیا اور کمرے سے ملحقہ ایک کوٹھڑی میں لے گیا۔ وہاں لکڑی کے بے شمار خالی کھوکھے پڑے تھے۔ "اس کھوکھے میں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔"

ندیم خالی کھوکھے میں اتر کر بیٹھ گیا۔ اس آدمی نے اوپر لکڑی کا تختہ ڈال کر ایک خالی کھوکھا اس کے اوپر رکھ دیا۔ اتنے میں دروازہ زور زور سے دھڑ دھڑانے کی آواز آئی۔ پھر باہر سے انڈین فوجی کی آواز بلند ہوئی "دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔ دروازہ کھولو نہیں تو ہم اسے توڑ دیں گے۔"

ندیم نے اپنا سانس روک لیا۔ اس کے کان باہر کی آوازوں پر لگے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی کسی نے تحکمانہ انداز میں پوچھا "ادھر کوئی بھگوڑا تو نہیں آیا؟"

ندیم کے محسن نے کہا "ادھر کوئی نہیں آیا جوان۔ کیوں کیا بات ہے؟"

دوسرے فوجی کی آواز بلند ہوئی "گھر کی تلاشی لے لو۔"

ندیم کھوکھے کے اندر سمٹ سا گیا۔ اسے کمرے میں فوجی بوٹوں کی آواز آئی۔ پھر چیزیں ادھر ادھر گھسیٹی جانے لگیں۔ انڈین ملٹری آفیسر کی آواز سنائی دی۔ "اوپر جا کر سرچ کرو۔"

پھر کسی نے کوٹھڑی کا دروازہ کھول کر پوچھا "یہاں کیا ہے؟"

ندیم کو میزبان کی آواز سنائی دی "ادھر ہمارا کھوکھا کا سامان پڑا ہے۔ ہم ڈرائی فروٹ کا بزنس کرتا ہے مارکیٹ میں۔ آپ کو بولا صاحب کہ ادھر کوئی نہیں آیا۔ اگر وہ بھگوڑا آیا تو ہم اسے پکڑ کر تھانے لے جائے گا۔"

انڈین فوجی خالی کھوکھوں کو ٹھوکریں مار کر دیکھ رہا تھا۔ ندیم جس کھوکھے میں بند سہما ہوا تھا۔ اس کے اوپر والے کھوکھے کے تختے کو اٹھانے اور پھر زور سے اسے بند کرنے کی آواز آئی۔ ندیم دل میں خدا سے اپنے تحفظ کی دعائیں مانگنے لگا۔ انڈین فوجی اوپر والا خالی کھوکھا دیکھ کر کوٹھڑی سے باہر نکل گیا تھا۔

اب مکان کا مالک بھی مطمئن ہو گیا تھا۔ اس نے آواز میں زور پیدا کرتے ہوئے کہا "جناب تم فکر نہ کرو۔ ادھر اگر کوئی بھگوڑا آیا تو ہم اسے یہیں پکڑ کر بند کر دے گا۔"

اب فوجی افسر کی آواز سنائی دی "وہ نوجوان ہے رنگ سانولا ہے داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔

نسوار کی جیکٹ اور پتلون میں ہے۔ وہ پاکستانی جاسوس ہے تم نے اسے پکڑا تو تمھیں فوج سے انعام ملے گا۔"

مالک مکان کی آواز آئی "فکر نہ کرو صاحب۔ ہم کو انعام کا لالچ نہیں۔ پاکستانی جاسوس ادھر آیا تو بچ کر نہیں جائے گا۔" فوجی بوٹوں کی آواز کمرے سے باہر نکل گئی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ ندیم نے خالی کھوکھے کے اندھیرے میں سکڑ کر بیٹھے ہوئے آنکھیں بند کر کے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے دشمن سے اسے بچا لیا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ پھر اوپر والا کھوکھا ہٹا کر ندیم کے کھوکھے کا تختہ ہٹا دیا گیا۔ کوٹھری کی نیم روشن فضا میں ندیم نے اپنے محسن کا چہرہ دیکھا اور کھوکھے میں سے باہر نکلتے ہوئے بولا "میں پاکستانی جاسوس نہیں ہوں۔ یہ مجھ پر جھوٹا الزام لگایا گیا ہے۔ میں پاکستانی ضرور ہوں مگر جاسوس نہیں ہوں۔"

مالک مکان نے ندیم کو ہاتھ سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ ندیم کو دوسری منزل پر لے گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا جس کی گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ یہاں دیوار کے ساتھ بانس کی دو آرام کرسیاں پڑی تھیں۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ ایک پلنگ بچھا تھا جس پر [illegible] ہوئی مچھر دانی اوپر کو الٹ دی گئی تھی۔ سامنے شاید غسل خانہ کا دروازہ تھا جس کے باہر تانبے کی بالٹی اور لوٹا رکھا ہوا تھا۔ مالک مکان دروازہ بند کر کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ جیب سے بیڑی نکال کر سلگائی اور ندیم سے کہا "بیٹھ جاؤ سامنے۔"

ندیم بانس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ مالک مکان نے اسے ہاتھ ہلا کر خاموش رہنے کو کہا اور بیڑی کا کش لگا کر بولا۔

"بھائی جی میں نے تمھیں اپنے مکان میں چھپا کر جانتے ہو کتنا بڑا خطرہ مول لیا تھا؟ میں نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ تم نے اندر آتے ہی کلمہ شریف پڑھا تھا۔ میں نے یہ سب کچھ خدا اور اس کے رسولؐ کے لیے کیا ہے۔ اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم اگر پاکستانی ہو تو یہاں کیسے آ گئے ہو اور ملٹری تمھارے پیچھے کیوں لگی ہوئی ہے۔ اگر تم پاکستانی جاسوس نہیں ہو تو یوں چھپتے کیوں پھر رہے ہو؟"

ندیم کو وہ مخلص اور سچا مسلمان نظر آیا اس نے سوچا کہ اسے سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہیے کہ اصل ماجرا کیا ہے۔ پھر بھی اس نے اپنے دل کا حال زبان پر لانے سے پہلے پوچھا

"لگتا ہے آپ پنجاب کے رہنے والے ہیں اور سچے مسلمان ہیں۔ آپ کلکتے میں کب سے ہیں؟"

اس آدمی نے کہا "میرا نام ملک تجمل ہے۔ ہم اصل میں چنیوٹ کے رہنے والے ہیں لیکن ایک مدت سے کلکتے میں فروٹ کا بزنس کر رہے ہیں۔ میں اور میرے بیوی بچے بھارت کے شہری ہیں۔ میرے بچے چنیوٹ اپنے رشتے داروں سے ملنے پاکستان گئے ہوئے ہیں اب تم مجھے اپنے بارے میں سچ سچ ساری بات بتا دو۔ میں شاید تمھاری کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ مسلمان یہاں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ لیکن یہ ضرور وعدہ کرتا ہوں کہ تمھارے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

تب ندیم نے شروع سے لے کر آخر تک چنیوٹ کے نیک دل ملک صاحب کو ساری کہانی سنا دی کہ کس طرح وہ اپنی محبوبہ نجمی کے ساتھ لاہور سے بھاگ کر کراچی پہنچا کہ اس سے شادی کرے گا اور اس کے بعد کیسے نجمی اغوا ہو کر بھارت پہنچا دی گئی اور پھر وہ ویزا لے کر دہلی آ گیا اور نجمی کی تلاش میں کیسے سوناگاچی پہنچا۔ جہاں نجمی چندا بائی کے روپ میں مجرا کرتی تھی۔ پھر کیسے کیسے ہولناک حالات سے گزر کر وہ نجمی عرف چندا بائی کو ڈاکو مان سنگھ کے چنگل سے چھڑا کر ایک گاؤں میں پہنچا اور وہاں گرفتار کر لیا گیا۔ کیوں کہ یہاں کی فوج اور پولیس اسے پاکستانی جاسوس سمجھتی ہے۔ اور برابر اس کی تلاش میں تھی۔ ندیم نے یہ ساری داستان پنجابی میں بیان کی تھی جب وہ اپنی کہانی بیان کر چکا تو ملک صاحب نے دوسری بیڑی سلگائی۔ اٹھ کر کھڑکی کے پاس گئے کھڑکی کھول کر نیچے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ کھڑکی بند کر کے ندیم کے پاس آ کر بولے "پہلے تم کپڑے بدل لو۔"

ملک صاحب نے ندیم کو کھدر کا ایک کرتہ کالی واسکٹ اور دھوتی دی جسے ندیم نے فوراً پہن لیا۔ ملک صاحب نے ندیم کے کپڑے ایک گٹھڑی میں باندھ کر پلنگ کے نیچے چھپا دیئے اور کہا "تم بیٹھو میں تمھارے لیے چائے لاتا ہوں۔"

ملک صاحب نیچے اتر گئے۔ ندیم اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں اکیلا رہ گیا تو اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونے لگے۔ کہیں یہ آدمی اسے گرفتار تو نہیں کرا دے گا؟ ندیم کے دل میں اس قسم کے خیالات کا پیدا ہونا قدرتی بات تھی۔ کیونکہ وہ نامساعد حالات میں سے گزر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ ملک صاحب ایک سچے مسلمان ہیں۔ اگر انھیں اسے گرفتار ہی کروانا ہوتا تو

جب فوجی اندر آئے تھے تو اس وقت گرفتار کروا دیتا۔ تھوڑی دیر بعد ملک صاحب ایک چھوٹا سا ٹرے اٹھائے اندر آئے۔ ٹرے میں ایک بند مکھن چائے کی ایک چینک اور دو پیالیاں رکھی تھیں۔

"گھر میں کوئی نہیں ہے۔ نوکر بھی آج نہیں آیا۔ یہ اچھی بات ہوئی نوکر ہندو بنگالی ہے اس کو تمھارا پتہ چل جاتا تو ہو سکتا تھا کہ وہ پولیس کو جا کر خبر کر دیتا۔ یہ چائے میں بازار والے ہوٹل سے لایا ہوں" "لو پیئو" ندیم کو بڑی بھوک لگ رہی تھی۔

وہ مکھن بند کھانے لگا۔ ملک صاحب چائے پیالیوں میں ڈالتے ہوئے بولے "اب تم کیا چاہتے ہو؟ یہاں تم زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ تم اس علاقے میں گم ہوئے ہو لہٰذا فوج کے آدمی سفید کپڑوں میں یہاں ضرور تمھاری سراغ رسانی کے لیے لگا دیئے جائیں گے۔ بلکہ پولیس کے خفیہ آدمی تو اب تک بازار میں منڈلانے لگے ہوں گے۔ جس لڑکی کے پیچھے تم اپنی جان پر کھیل کر یہاں تک آ گئے ہو وہ تمھارے کہنے کے مطابق تمھارے ساتھ پاکستان جانے پر راضی نہیں ہے۔ تو پھر میں تمھیں بھائی جی یہی مشورہ دوں گا کہ چپکے سے کلکتے میں جو پاکستانی ہائی کمیشن کا دفتر ہے وہاں جا کر پناہ حاصل کر لو۔ سارے جھنجٹ سے چھٹکارا مل جائے گا۔ کیا خیال ہے تمھارا۔؟"

ندیم خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ ملک صاحب کی بات اس نے بڑے غور سے سنی تھی۔ جب وہ بات ختم کر چکے تو بولا "ملک صاحب! انجمی کے دل میں یونہی اپنے دشمنوں سے بدلہ لینے کا بھوت سوار ہے۔ یہ عارضی قسم کا جذبہ ہے۔ میں اسے پاکستان جانے پر راضی کر لوں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے اس سے ایک بار کھل کر بات کرنے کا موقع مل جائے۔"

ندیم نے ایک عقلمندی کی تھی کہ ملک صاحب کو یہ نہیں بتایا تھا کہ ذکریا اسٹریٹ والے سیٹھ جبار علی نے اسے اپنے پاس پناہ دی تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ ہو سکتا ہے سیٹھ جبار اب اس کی مدد نہ کرے۔ ایسی صورت میں ملک صاحب اس کے کام آ سکتے تھے۔ اس بنا پر ندیم نے ان کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ ملک صاحب چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد بولے "تم اپنی چندا سے کیسے مل سکتے ہو؟ وہ تو سوناگاچی میں ہو گی، تم وہاں گئے تو پکڑے جاؤ گے اور میں بھی مصیبت میں پھنس جاؤں گا نا بھائی نا۔ تو اپنے ملک کے سفارت خانے میں ہی چلا جا۔ تمھارے لیے یہی بہتر ہے۔ تمھاری چندا تو یہاں کی شہری بن چکی ہے اس کا خیال دل سے نکال ہی دے تو

اچھا ہے۔"

مگر ندیم یہ کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ وہ انجمی کو لیے بغیر پاکستان واپس جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ملک صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانے۔ ندیم نے سوچا کہ ملک صاحب اپنے طور پر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ وہ جتنی مدد اس کی کر سکتے تھے انھوں نے اپنی اور اپنے بال بچوں کی زندگیوں کا داؤ لگا کر اس کی مدد کر دی ہے اور اسے ایک بار انڈین ملٹری سے بچا لیا ہے اب انھیں مزید مجبور کرنا ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔ چنانچہ ندیم نے سیٹھ جبار کے پاس ہی واپس جانے کا ارادہ کر لیا اور ملک صاحب سے کہا "پھر آپ مجھ پر ایک اور مہربانی کر دیجئے گا۔ مجھے کسی طرح ذکریا اسٹریٹ والی مسجد ناخدا میں پہنچا دیجئے۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کروں گا۔"

ملک صاحب بولے "یہ میں کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے تمھیں رات کا انتظار کرنا ہو گا۔ کیونکہ دن کے وقت میں تمھیں نکالنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ خطرہ رات کے وقت بھی ہو گا کیونکہ سی آئی ڈی والے رات کے وقت بھی باہر کسی نہ کسی جگہ چھپے بیٹھے ہوں گے۔ مگر میں تمھیں کسی طریقے سے لے جاؤں گا۔ اب تم یہاں آرام کرو پلنگ پر۔ میں برتن لے کر ہوٹل میں جاتا ہوں اور باہر کے حالات کا جائزہ بھی لیتا ہوں۔ تم کھڑکی وغیرہ مت کھولنا۔ کیونکہ میں باہر سے مکان پر تالا ڈال کر جاؤں گا۔"

ملک صاحب چینک اور پیالے لے کر چلے گئے۔ ندیم کرسی پر سے اٹھا اور پلنگ پر دراز ہو گیا۔ وہ رات بھر کا جاگا ہوا تھا یہاں اسے بہت حد تک تحفظ بھی مل گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند ہی کی تھی کہ نیند نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ملک صاحب مکان کے دروازے پر تالا لگا کر خالی برتن لے کر ہوٹل میں آ گئے۔ ہوٹل بازار میں تھا۔ بازار میں بڑی رونق تھی۔ ہوٹل والا ملک صاحب کا محلے دار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ آج ملک صاحب کا نوکر نہیں آیا جس کی وجہ سے انھیں خود چائے گھر لے جانی پڑی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ملک صاحب اکثر ناشتہ وغیرہ اپنے گھر پر ہی کیا کرتے ہیں۔ ملک صاحب ہوٹل کے مالک کے پاس کرسی پر بیٹھ کر اس سے بنگلہ میں باتیں کرنے لگے۔ ہوٹل کا مالک ہندو بنگالی تھا۔ ملک صاحب کی نگاہیں بازار میں آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ انھیں سی آئی ڈی والوں کو پہچاننے میں مہارت نہیں تھی۔ وہ یونہی لوگوں کو آتے جاتے

دیکھ رہے تھے۔ کوئی اگر گاہک کی طرف ذرا سا دیکھتا تو ملک صاحب یہی سمجھتے کہ یہ ضرور سی آئی ڈی والا ہے۔ انھوں نے دل میں سوچ لیا تھا کہ پاکستانی نوجوان ندیم کو مکان سے رات کے وقت کس طرح نکال کر ناخدا مسجد میں پہنچانا ہے۔ وہاں بیٹھ کر انھوں نے چائے کا ایک گلاس منگوا لیا اور اسے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ پون گھنٹے کے بعد ملک صاحب واپس مکان میں آئے تو ندیم گہری نیند سو رہا تھا۔ انھوں نے اسے نہ جگایا اور نیچے والے کمرے میں جا کر بیٹھ کر حقہ پینے لگے۔ اپنے دل میں انھوں نے اپنے پاکستانی مہمان کو رات کے وقت وہاں سے نکال کر مسجد تک پہنچانے کے لیے جو اسکیم بنائی تھی، اس پر عمل در آمد بھی رات کے وقت ہی شروع ہونا تھا۔ دوپہر کے وقت ملک صاحب بازار میں ایک بار پھر گئے وہ مکان پہ تالا لگاتے گئے تھے۔ بازار میں کونے والے ہوٹل سے انھوں نے بریانی کے دو پیکٹ خریدے اور واپس آ گئے اس وقت ندیم بیدار ہو چکا تھا۔ دونوں نے مل کر بریانی کھائی۔ ملک صاحب نے پوچھا "مسجد ناخدا میں تم کس کے پاس جاؤ گے؟" ندیم نے سیٹھ جبار کا نام لیے بغیر کہا کہ وہاں میرا ایک واقف کار رہتا ہے وہ مجھے سونا گاچی بخمی کے پاس پہنچا دے گا۔"

ملک صاحب نے اس کے بعد مزید کچھ نہ پوچھا۔ کھانے کے بعد ندیم نے ملک صاحب سے پوچھا کہ "رات کے وقت مجھے ناخدا تک کیسے پہنچائیں گے؟" ملک صاحب بڑی [illegible] تھے۔ وہ دونوں اوپر والے کمرے میں بیٹھے تھے۔ ملک صاحب نے کہا "رات کو میری چھوٹی ویگن یہاں مال لینے آئے گی تم کو میں خالی کھوکھے میں چھپا دوں گا۔ تمھارے والا کھوکھا بھی دوسرے کچھ [illegible] سے بھرے ہوئے کھوکھوں کے ساتھ ہی ویگن میں رکھ دیا جائے گا۔ میرے دو آدمی ویگن کے ساتھ ہوں گے تم کھوکھے کے اندر خاموش رہنا۔ میرے کسی نوکر کو تمھارے بارے میں معلوم نہیں ہو گا۔ میں ویگن کے ساتھ ہوں گا۔ مسجد ناخدا کے پاس جا کر میں ویگن رکوا لوں گا۔ دونوں نوکروں کو میں کسی طریقے سے وہاں سے تھوڑی دیر کے لیے اپنے دوسرے والے گودام کی طرف بھجوا دوں گا۔ اس دوران تمھیں موقع مل جائے گا کہ تم کھوکھے میں سے نکل کر مسجد ناخدا میں جا سکو۔"

ندیم کو یہ منصوبہ بڑا مناسب اور محفوظ محسوس ہوا۔ ملک صاحب نے اسے بتایا کہ گلی کے باہر سی آئی ڈی والے ضرور موجود ہوں گے ان کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہی اسکیم سب سے بہتر رہے گی۔ دوپہر کے بعد ندیم پھر آرام کرنے کے لیے لیٹ گیا۔ وہ اس موقع سے

فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جسم کو پورا آرام پہنچانا چاہتا تھا۔ کیونکہ کچھ معلوم نہیں تھا کہ آگے اس کی قسمت میں کس قدر بے آرامیاں لکھی ہوئی ہیں۔ ملک صاحب سہ پہر کے وقت تالا لگا کر ویگن کا انتظام کرنے چل دیئے۔ وہ شام کو واپس آئے ندیم جاگ رہا تھا اگرچہ اندھیرا ہو گیا تھا مگر ندیم نے ملک صاحب کے آنے تک کوئی بتی روشن نہیں کی تھی۔ ملک صاحب تالا کھول کر آئے تو انھوں نے بتی جلائی اور اوپر والے کمرے میں آ کر ندیم کو بتایا کہ سارا انتظام ہو گیا ہے۔ رات کو بھی ندیم نے ملک صاحب کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھایا۔

ملک صاحب نے کہا "بھائی جی تم تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ۔ میں وقت پر تمھیں جگا دوں گا۔"

ندیم کو نیند نہیں آ رہی تھی اس نے کافی آرام کر لیا تھا پھر بھی وہ ملک صاحب کے کہنے پر پلنگ پر لیٹ گیا۔ ملک صاحب نیچے والے کمرے میں لیٹے اخبار وغیرہ پڑھتے رہے۔ جب رات کے ٹھیک بارہ بجے تو انھوں نے اوپر والے کمرے میں آ کر ندیم کو جگایا اور کہا "میرے آدمی ویگن لے کر آ رہے ہوں گے تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے نکلتے ہوئے اپنی والی جیکٹ اور پتلون پہن لو۔ کیونکہ میرے لیے انھیں کسی جگہ چھپانا مشکل ہو جائے گا۔ تم کو تو اب لکڑی کے کھوکھے میں ہی بیٹھنا ہے۔ میں نے تمھارے والے خالی کھوکھے میں تازہ ہوا کے لیے سوراخ کر دیئے ہیں۔ اور پھر مسجد ناخدا یہاں سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ تمھیں تھوڑی دیر کے لیے ہی اندر بند رہنا ہو گا۔"

ندیم ملک صاحب کے ہاں اپنا کوئی سراغ چھوڑ کر انھیں مشکل میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے پلنگ کے نیچے سے جیکٹ اور پتلون نکال کر دھوتی کرتے کی جگہ پہن لی۔ ملک صاحب نے جیب سے دس دس کے دس نوٹ نکال کر ندیم کو دیئے۔

"یہ تم اپنے پاس رکھ لو شاید تمھیں ضرورت پڑ جائے۔" ندیم نے بہت انکار کیا کہ وہ اپنے ایک محسن کے پاس ہی جا رہا ہے اسے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے لیکن ملک صاحب نے اصرار کر کے سو روپے ندیم کی جیب میں ڈال دیئے۔ پھر وہ اسے لے کر کوٹھڑی میں آ گئے۔ یہاں خشک میووں سے بھرے ہوئے بیس پچیس کھوکھے پڑے تھے۔ ان میں وہ خالی کھوکھا بھی تھا جس میں

کل رات ندیم چھپا تھا۔ ملک صاحب نے اس کا تختہ اتار دیا اور کہنے لگے "ابھی تم میرے کمرے میں ہی بیٹھو۔ میرے آدمی جب آئیں گے تو تم اس میں اتر جانا۔"

ندیم ملک صاحب کے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ بتی جل رہی تھی۔ اس نے ملک صاحب کا ایک بار پھر شکریہ ادا کیا۔ ملک صاحب بولے "بھائی جی اس کی ضرورت نہیں ہے میں نے جو کچھ بھی تھوڑا بہت کیا خدا اور رسولؐ کی خوشنودی کے لیے کیا ہے۔" پھر وہ پاکستان کی باتیں کرنے لگے کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ سمجھتے ہیں۔

اتنے میں گلی میں ویگن کے داخل ہونے کی آواز سنائی دی۔ ملک صاحب نے حقے کی نے ایک طرف کی اور بولے "میرے آدمی آگئے ہیں۔ تم جلدی سے کھوکھے میں چھپ جاؤ۔" ندیم کوٹھری میں جا کر لکڑی کے کھوکھے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ کھوکھے میں کافی جگہ تھی۔ ملک صاحب نے ایک تکیہ ندیم کے پیچھے ڈالا اور تختہ اوپر کر کے دو تین کیلیں عارضی طور پر ٹھونک دیں اور آہستہ سے بولے "تم اگر چاہو تو ذرا سا زور لگا کر کیل اکھاڑ سکو گے۔ میں تمھارے ساتھ ہوں گا۔ فکر نہ کرنا۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ ملک صاحب کوٹھری سے نکل کر دروازے پر گئے۔ دروازہ کھولا۔ باہر دو بنگالی مزدور کھڑے تھے جو ان کے مال گودام میں ہی کام کرتے تھے۔ ملک صاحب نے انھیں بنگلہ میں کہا کہ اندر آکر کھوکھے ویگن میں رکھ دو۔ ملک صاحب کے ہاں سے اکثر و بیشتر مال آتا جاتا ہی رہتا تھا۔ ویگن گلی میں بازار کی طرف رخ کیے کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر ملک صاحب کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بونٹ سے ٹیک لگا کر بیڑی پینے لگا۔ مزدوروں نے کھوکھے اٹھا کر ویگن میں رکھنا شروع کر دیا۔ جس کھوکھے میں ندیم بند تھا اس کو ملک صاحب نے خود ہاتھ لگا کر احتیاط سے مزدور کے کاندھے پر رکھا۔ کھوکھا بھاری تھا۔ کمزور بنگالی مزدور ذرا ڈگمگایا تو ملک صاحب نے دوسری طرف سے سہارا دے دیا اور خود اسے سہارا دے کر ویگن تک لائے اور ویگن کے پیچھے دوسرے کھوکھے کے اوپر رکھ دیا۔ پھر وہ اسی جگہ کھڑے رہے تا کہ ڈرائی فروٹ سے بھرا ہوا کوئی دوسرا کھوکھا اس کے اوپر نہ رکھ دیا جائے۔ جب سارا مال ویگن میں آگیا تو ملک صاحب نے مکان کو تالا لگایا۔ دونوں مزدوروں کو آگے ڈرائیور والی سیٹ کے پاس بیٹھنے کو کہا اور خود ویگن کے

پیچھے ندیم والے کھوکھے کے پاس بیٹھ گئے۔ ویگن پیچھے سے کھلی تھی۔ وہ گلی سے نکل کر بازار میں آگئی۔ بازار آدھی رات کے وقت سنسان تھا مگر کھمبوں کی بتیاں روشن تھیں۔ ڈرائیور کو ملک صاحب نے سمجھا دیا تھا کہ وہ مسجد ناخدا کی طرف سے ہو کر چلے۔ وہاں انھیں امام صاحب کے ہاں ڈرائی فروٹ کی پیٹی رکھوانی ہے۔ ویگن کلکتے کی قدرے گنجان آبادی سے نکل کر کشادہ سڑک پر دوڑنے لگی۔ اسی سڑک کے دونوں جانب اونچے اونچے فلیٹ تھے جن میں کہیں کہیں روشنی ہو رہی تھی۔ ملک صاحب بڑے خوش تھے کہ سی آئی ڈی یا پولیس والوں سے پالا نہیں پڑا تھا۔ ندیم کھوکھے کے اندر تکیے سے ٹیک لگائے اپنے آپ کو سمیٹ کر بیٹھا ہوا تھا۔ کھوکھے میں گہرا اندھیرا تھا۔ مگر تختے کے سوراخوں میں سے تازہ ہوا برابر اندر آرہی تھی۔ پھر اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ تھوڑے فاصلے کی بات ہے ابھی مسجد ناخدا کا بازار آجائے گا اور اسے اس بند کھوکھے سے نجات مل جائے گی۔

جس بند کھوکھے میں سکڑ کر بیٹھا۔ ندیم یہ باتیں سوچ رہا تھا اس کے باہر دوسرے کھوکھے پر ملک صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ ویگن آدھی رات کے سنسان بازاروں میں اڑی جا رہی تھی۔ پھر ویگن نے ایک موڑ کاٹا اور اس سڑک پر آگئی جو آگے جا کر لوئر چیت پور روڈ کے ساتھ جا ملتی تھی۔ مسجد ناخدا اسی لوئر چیت پور روڈ کے آخری سرے پر مشرق کی جانب واقع تھی۔ یہ سڑک زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ویگن تھوڑی دور اس سڑک پر گئی تھی کہ اچانک ڈرائیور نے بریک لگا دی۔ ملک صاحب گرتے گرتے بچے۔ کھوکھے کے اندر ندیم کا سر کھوکھے کے تختے سے ہلکے سے ٹکرا گیا۔

ملک صاحب نے چلا کر بنگلہ میں پوچھا۔

"کیا ہو گیا ہے؟ گاڑی کیوں کھڑی کی ہے؟" اس کے ساتھ ہی وہ نیچے اتر کر ڈرائیور کی طرف بڑھے تو کیا دیکھتے ہیں کہ آگے سڑک پر چار پانچ آدمی فوجی وردی میں ملبوس رائفلیں تانے کھڑے ہیں۔ ایک فوجی نے آگے بڑھ کر ڈرائیور کو گھسیٹ کر سیٹ سے باہر نکالا اور اسے دو تین تھپیڑ مار کر بنگلہ میں کہا "سالے اسمگلنگ کرتے ہو رات کو! کون ہے تمھارا مالک؟" ملک صاحب کا دل دھک سے رہ گیا وہ سمجھ گئے کہ ان کی خیر نہیں وہ ایک ایسے نوجوان کو بچا کر لیے جا رہے ہیں جس پر پاکستانی جاسوس ہونے کا الزام ہے اور جس کی فوج کو تلاش ہے انھوں نے جلدی سے

آگے بڑھ کر بنگلہ زبان میں ہی کہا کہ حضور میں ڈرائی فروٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ اپنا مال لے کر گودام میں رکھنے جا رہا ہوں۔

اسی بنگلہ فوجی نے رائفل کی نالی کا رخ ملک صاحب کی طرف کر دیا اور گرج کر کہا "تمھاری خیریت اس میں ہے کہ اپنے آدمیوں کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ نہیں تو تم سب کو گولی سے اڑا دوں گا۔"

ندیم نے یہ آوازیں سنیں تو سہم کر رہ گیا۔ اتنی بنگالی زبان وہ جاننے لگا تھا کہ یہ سمجھ جائے کہ فوجی سپاہیوں نے ویگن کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ ملک صاحب نے جب یہ سنا کہ فوجی ان کو بھاگ جانے کا کہہ رہے ہیں تو فوراً سمجھ گئے کہ یہ اصلی فوجی نہیں ہیں بلکہ لٹیرے ہیں جو اکثر فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر رات کو وارداتیں کیا کرتے ہیں۔ اب اس خیال سے کہ ندیم کو اصل حالات کا علم ہو جائے۔ انھوں نے ہندوستانی زبان میں ذرا بلند آواز میں کہا "جناب ہم اپنا مال چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں۔ آپ کو اگر ضرورت ہے تو ڈرائی فروٹ کی دو چار پیٹیاں لے لیں۔"

اس پر بنگالی فوجی نے انھیں ڈانٹ کر ہندوستانی میں ہی کہا "بھاگ جاؤ نہیں تو شوٹ کر دوں گا۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے دو فوجی ساتھی اچھل کر ویگن کے پیچھے بیٹھ گئے۔ دوسرے فوجی اگلی سیٹ پر چڑھ گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ویگن لے کر فرار ہو گئے۔ ویران بازار میں ملک صاحب اپنے ڈرائیور اور دو بنگالی مزدوروں کے ساتھ اکیلے رہ گئے۔ وہ دل ہی دل میں ندیم کے لیے دعا مانگنے لگے اس بات کا انھیں اطمینان بھی تھا کہ یہ اصلی فوجی نہیں ہیں بلکہ لٹیرے ہیں کیونکہ اصلی فوجی کبھی ایسا نہیں کرتے کہ مال لے کر فرار ہو جائیں۔ ملک صاحب کو یقین تھا کہ ندیم کو صورتِ حال کا علم ہو گیا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ انھوں نے نقلی فوجیوں کو غصے میں دو چار جلی کٹی سنائیں اور مزدوروں سے کہا "یہ ڈاکو لٹیرے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ نہ ہوتا تو میں دیکھ لیتا چلو واپس چلو۔" ایک مزدور نے کہا کہ سیٹھ ہمیں تھانے میں رپٹ درج کرانی چاہیے۔ ملک صاحب بھلا یہ کیسے کر سکتے تھے۔ کہنے لگے چھوڑو کون اس جھمیلے میں پڑے۔ چار پانچ ہزار کا نقصان ہے۔ بنگلہ پولیس خواہ مخواہ پریشان کرے گی اور

وہ اپنے آدمیوں کو لے کر لوئر چیت پور روڈ کی طرف چلنے لگے کہ شاید وہاں سے کوئی ٹیکسی مل جائے۔ دوسری طرف ویگن جس میں بنگالی فوجی سوار تھے واپس بڑی سڑک پر آ گئی اور اس کا رخ دریائے ہگلی کی جانب ہو گیا۔ ندیم کھوکھے کے اندر عالمِ پریشانی میں سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اسے ساری صورتِ حال کا علم ہو گیا تھا وہ جان چکا تھا کہ فوجی ویگن کو لے کر کسی نامعلوم سمت کو جا رہے ہیں۔ اور انھوں نے ملک صاحب اور ان کے آدمیوں کو اتار کر پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ملک صاحب نے ہندوستانی میں بات کرتے ہوئے ندیم کو یہ اشارہ دے دیا تھا کہ ویگن کو فوجی چھین کر لے جا رہے ہیں وہ یہ بھی سمجھ گیا تھا کہ ہندوستانی میں یہ بات ملک صاحب نے ندیم کو حالات سے آگاہ کرنے کے لیے کی تھی۔ لیکن اب یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا کہ اگر یہ فوجی ہیں تو وہ موت کے منہ میں جا رہا ہے اور اس کی خیر نہیں ہے۔ ندیم کو ان دو فوجیوں کی باتیں کرنے کی آواز بھی ویگن کے شور میں سنائی دے رہی تھی۔ جو اس کے کھوکھے کے پاس ہی ویگن میں بیٹھے تھے۔ وہ بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ ندیم ان کی گفتگو سے کچھ بھی نہیں سمجھ پا رہا تھا۔ ویگن تیزی سے ہموار سڑک پر اڑی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک طرف کو مڑ گئی یہ سڑک زیادہ ہموار نہیں تھی اور ندیم کو دھچکے لگنے لگے اس نے کھوکھے کی دیواروں سے اپنے پاؤں اور ہاتھ لگا دیئے۔ خدا خدا کر کے یہ سڑک ختم ہوئی اور ویگن نسبتاً ہموار راستے پر چلنے لگی۔ اس سڑک پر بھی ویگن کوئی آدھ گھنٹے تک چلتی رہی ندیم کو جو ہوا کھوکھے کے سوراخوں میں سے اندر آ رہی تھی اس میں ایسی گھاس کی خوشبو اسے محسوس ہونے لگی جو عام طور پر دریا کے کنارے اگی ہوتی ہے اور آدھی دریا میں ڈوبی ہوتی ہے۔ اس نے یہی نتیجہ نکالا کہ ویگن دریائے ہگلی کے آس پاس رواں دواں ہے۔ وہ دل میں خدا سے دعا مانگتا اور کلمہ پاک کا ورد کرتا سہم کر سمٹا ہوا بیٹھا رہا۔ ویگن نے ایک دو موڑ کاٹے اور پھر اس کی رفتار ہلکی ہو گئی۔ ایک آخری موڑ گھوم کر ویگن جیسے کسی گیراج میں داخل ہو کر رک گئی اسے بھاری فوجی جوتوں اور ویگن کے دروازے کھلنے اور بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں پھر کسی نے ہندوستانی میں کہا "دادا ویگن کو ادھر نہیں رکھنا۔"

دوسری آواز آئی "یہ مال اتار کر اندر رکھو اور دیکھو تو اس میں ڈرائی فروٹ ہی ہے۔"

ندیم کا دل کانپ اٹھا یہ لوگ اب سارے کھوکھوں کو کھولیں گے اور وہ پکڑا جائے گا اسے کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لوگ کسی خطرناک گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور جب ایک آدمی نے ویگن کے پچھلے دروازے کی طرف آتے ہوئے کہا کہ دادا آج قیمتی مال ہاتھ نہیں لگا تو وہ سمجھ گیا کہ یہ فوجی نہیں ہیں بلکہ ڈاکو لٹیرے ہیں۔ کھوکھے ویگن سے نیچے اتارے جانے لگے۔ دو آدمیوں نے ندیم کے کھوکھے کو بھی اتار کر نیچے رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد ویگن کے وہاں سے باہر نکلنے کی آواز آئی یہ آواز کچھ فاصلے پر جا کر بند ہو گئی۔

کسی نے غصے میں کہا "ارے اسے بند کیوں کر دیا؟ اسے آگے لے جا کر دریا میں ڈال دو۔ جلدی کرو۔"

ویگن ایک بار پھر اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز دور ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔ ندیم کو بھاری جوتوں کی آوازیں اپنی طرف آتی سنائی دیں۔

کسی نے کہا ایسے کھول کر رکھو۔ ایک کھوکھے کا تختہ اکھاڑنے کی آواز آئی۔

پھر کسی نے کہا "دادا ڈائی فروٹ ہی ہے۔" دوسری آواز آئی۔

"رہنے دو۔ ایک پیٹی اپنے لیے رکھ لیں گے باقی اپنے ایجنٹ کے ہاتھ بیچ دیں گے۔ چار چھ ہزار تو مل ہی جائیں گے چلو اب ٹالی گنج کی طرف جاتے ہیں۔ دھراج جیپ لے کر آتا ہی ہو گا۔"

جوتوں کی آوازیں گیراج سے نکل کر باہر چلی گئیں۔ ندیم پر اصل بات واضح ہو گئی تھی۔ یہ لوگ لٹیرے تھے جو فوجیوں کی وردی پہن کر کلکتے کے ناکوں پر آدھی رات کو وارداتیں کرتے تھے یہ بات اس کے لیے تسکین کا باعث تھی کہ وہ فوج کے قبضے میں نہیں ہے اور یہ لوگ تھوڑی دیر بعد وہاں سے جانے والے تھے۔ شاید ان لٹیروں کا وہ ساتھی بھی آ گیا تھا جو ملک صاحب کی ویگن کو دریا میں پھینکنے گیا تھا کیونکہ کسی نے بلند آواز میں پوچھا تھا ارے کسی نے ویگن ڈالتے دیکھا تو نہیں۔ اس کے بعد وہ بنگالی میں خدا جانے کیا باتیں کرنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر بعد جیپ کی آواز سنائی دی جو گیراج کے قریب آ کر رک گئی۔ یہ ڈاکو لٹیرے اس جیپ میں سوار ہو رہے تھے۔ جیپ اسٹارٹ ہوئی اور اس کی آواز دور جا کر غائب ہو گئی۔ ندیم کو یوں محسوس ہوا جیسے

کسی نے اس کے اوپر گرا ہوا ہزاروں من بھاری پتھر اٹھا دیا ہو۔ اب وہ یہ اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ پیچھے کوئی آدمی تو نہیں چھوڑا گیا وہ کھوکھے کے اندر ہمہ تن گوش ہو کر بیٹھا رہا وہ بہت آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا۔ خدا کا شکر تھا کہ اس کے اوپر کوئی دوسرا بھاری کھوکھا نہیں رکھا گیا تھا۔ تختے میں کیے گئے سوراخوں میں سے اسے تازہ ہوا اندر آتی محسوس ہو رہی تھی۔ باہر مکمل خاموشی چھائی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ تک ندیم کھوکھے کے اندر دم سادھے بیٹھا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ باہر کوئی آدمی موجود نہیں ہے تو اس نے دونوں ہاتھ کھوکھے کے اوپر لگے ہوئے تختے پر رکھ کر اوپر کو دباؤ ڈالا۔ ملک صاحب نے خاص طور پر کیلیں زیادہ اندر نہیں گاڑی تھیں۔ ذرا سی کوشش کے بعد تختہ اکھڑ گیا۔ اس سے ہلکی سی آواز پیدا ہوئی۔ ندیم وہیں سمٹ کر آواز کا ردِ عمل معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر وہی سناٹا طاری تھا۔ ندیم نے تختہ ایک طرف ہٹایا اور سر باہر نکال کر دیکھا۔ یہ ایک تنگ و تاریک جگہ تھی۔ اندھیرے میں ندیم صرف ارد گرد پڑے ہوئے کھوکھوں کو ہی دیکھ سکا۔ وہ کھوکھے سے باہر نکل آیا۔ اس کے گھٹنے جکڑ گئے تھے۔ وہیں بیٹھ کر اس نے اپنے گھٹنوں کو دبایا۔ پھر دو چار بار کھولا۔ پھر اٹھ کر بند دروازے کی طرف گیا۔ خطرہ یہ تھا کہ کہیں باہر سے وہ لوگ تالا نہ لگا گئے ہوں۔ اگر وہ کنڈی بھی لگا گئے تھے تو ندیم اسے کھول نہیں سکتا تھا اس نے دروازے کو باہر کی جانب دبایا۔ دروازہ باہر سے بند تھا۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ باہر سے تالا لگا ہے یا صرف کنڈی لگی ہوئی ہے۔ ندیم کو یقین تھا کہ وہ لوگ باہر سے تالا لگا گئے ہوں گے۔ اس سے پہلے کہ وہ لوگ دوسری واردات کرنے کے بعد وہاں واپس آ جاتے ندیم کو وہاں سے نکل جانا تھا۔ اندھیرے میں وہ ادھر اُدھر کوئی ایسی شے تلاش کرنے لگا جس کی مدد سے وہ دروازے کو کھول سکے۔ اس گیراج نما کوٹھڑی میں کوئی روشندان بھی نہیں تھا اسے کونے میں ایک طرف پڑا ہوا لوہے کا ایک ایسا راڈ مل گیا جس کی مدد سے کھوکھوں کو کھولا جاتا ہے۔ یہ بے حد موزوں ہتھیار تھا۔ یہ لوہے کا ڈنڈا آگے سے پتلا ہو کر اندر کو ذرا سا مڑا ہوا تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ کوئی پہریدار باہر نہ بیٹھا ہوا ہو۔ مگر اسے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔ ندیم نے لوہے کی سلاخ دروازے کے بیچ میں ڈال کر باہر کنڈے کی زنجیر کو قابو میں کر لیا۔ اس کے بعد زور زور سے اوپر کو جھٹکا دیا تو کنڈی کی زنجیر ٹوٹ گئی۔ ندیم وہیں ساکت ہو کر کھڑا

رہا۔ باہر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ کسی کے قدم تیزی سے دروازے کی طرف نہیں آئے۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر کوئی پہرے دار نہیں تھا۔ ندیم نے دروازہ کھول دیا۔ اندھیری رات میں تازہ ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے چھو کر گزر گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ اندھیرے میں پہلے اسے کچھ نظر نہ آیا پھر درختوں کے دھبے سے نظر آنے لگے۔ کوٹھری سے باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کر دیا اور دوڑ کر سامنے والے درختوں میں آ گیا۔ یہاں آتے ہی وہ گھاس میں بیٹھ کر آس پاس کا جائزہ لینے لگا۔ یہ کوئی ویران جگہ معلوم ہوتی تھی۔ ارد گرد کہیں دور تک کسی بلڈنگ وغیرہ کی روشنی نظر نہیں آ رہی تھی۔ ندیم اٹھا اور درختوں میں سے گزرتا ہوا ایک کچی پگڈنڈی پر آ گیا۔ آسمان پر ستارے جھلملا رہے تھے۔ ہوا کے جھونکوں میں دریا میں ڈوبے ہوئے سرکنڈوں کی خوشبو اسے بار بار محسوس ہو رہی تھی۔ یقیناً دریا وہاں سے قریب ہی تھا اور یہ دریا سوائے ہگلی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اصل میں اس دریا کا نام جمنا ہے جو کلکتہ میں داخل ہونے کے بعد ہگلی کا نام اختیار کر لیتا ہے۔ یہ دریا آگے جا کر خلیج بنگال میں جا گرتا ہے۔ ندیم کو خیال آ گیا کہ نجمی یعنی چندا لکھی بائی کے جس پرانے بنگلے میں رہتی ہے وہ بھی دریائے ہگلی کے کنارے پر ہی واقع ہے۔ ندیم پہلی بار اسی بنگلے کے باہر آیا تھا۔ اس بنگلے کی سیاہ چار دیواری اور پھاٹک کے اوپر لگا ہوا ٹائپ رائٹنگ اسکول کا پرانا بورڈ اسے اب بھی یاد تھا۔ لکھی بائی، طوائفوں کی نائیکہ قتل ہو چکی تھی اور ندیم کو معلوم تھا کہ وہاں اب نجمی اور اس کی ہمراز سہیلی کرشنا بائی ہی رہتی ہیں۔ اگرچہ بدمعاش دھوبل نے اب ان کا چارج سنبھال لیا تھا اور وہاں اس کی موجودگی لازمی تھی لیکن آدھی رات گزر چکی تھی بہت ممکن تھا کہ دھوبل بدمعاش نشہ کر کے گہری نیند میں غرق ہو اور ندیم کو کرشنا یا نجمی کے پاس جانے کا موقع مل جائے۔ اس خیال کو ذہن میں رکھ کر ندیم نے دریا کی طرف چلنا شروع کیا۔ وہ دریائی سرکنڈوں کی مرطوب خوشبو پر دریا کا سراغ لیتا اندھیرے میں چل رہا تھا۔ آخر اسے ستاروں کی روشنی میں دریا کا مٹیالے رنگ کا چوڑا پاٹ دکھائی دیا۔ وہ تیز تیز چل کر دریا کے کنارے آ گیا۔ اس نے دریا کے بہاؤ کی طرف رخ کر لیا کیونکہ لکھی بائی کا خستہ حال بنگلہ دریا کے بہاؤ کے رخ پر ہی واقع تھا۔ وہ اپنے قیاس کے مطابق چلا جا رہا تھا۔ دریا کے کنارے ایک کچا راستہ جھاڑیوں اور ناریل کے درختوں میں سے ہو کر گزرتا تھا۔ رات خنک تھی۔ یہ مئی جون کے مہینوں کی خنک رات نہیں تھی۔ ان راتوں

میں جو ٹھنڈی مست ہوا چلتی ہے تو سانپ اپنے بلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ لیکن اکتوبر نومبر میں راتیں سرد آمیز خنک ہو جانے کی وجہ سے سانپوں کا زیادہ خطرہ نہیں رہتا تھا۔ اس کے باوجود ندیم بے حد محتاط ہو کر چل رہا تھا۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ کیونکہ ان نقلی فوجیوں کے واپس آ جانے کا بھی خطرہ تھا۔ اگرچہ ندیم کو یہ اطمینان تھا کہ انھیں ایک خالی کھوکھا دیکھ کر یہ کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ اس کے اندر ایک آدمی تھا جو بھاگ گیا ہے تاہم دروازے کی اڑی ہوئی کنڈی انھیں شک میں ڈال سکتی تھی اور وہ اپنے بچاؤ کی خاطر علاقے کا جائزہ لینے نکل سکتے تھے۔

ندیم دیر تک دریا کے ساتھ والے کچے راستے پر چلتا رہا۔ ایک جگہ اس نے دو تین کشتیاں دیکھیں جو دریا کے کنارے پر کھڑی تھیں۔ آدمی وغیرہ اسے وہاں کوئی بھی نظر نہ آیا۔ وہ ان کشتیوں سے کچھ فاصلے پر ہو کر آگے نکل آیا۔ وہ دل میں دعائیں مانگ رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ لکھی بائی کا بنگلہ کہیں پیچھے ہو۔ وہ خدا پر بھروسہ کیے چلتا گیا۔ اب اسے دریا کے دونوں کناروں پر دور روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ یہ روشنیاں اونچی اونچی عمارتوں اور کارخانوں کی تھیں اور کافی فاصلے پر تھیں۔ ایک جانب دور اسے سگنل کی ہری اور لال بتی دکھائی دی۔ یہ دریا کے دوسرے کنارے پر تھیں۔ یہ دونوں روشنیاں اونچے انٹینا پر لگی ہوئی تھیں اور لال بتی جل بجھ رہی تھی۔ اچانک ندیم کو یاد آ گیا کہ جس روز وہ پہلی بار کلکتہ اسٹیشن سے اتر کر چھپتا چھپاتا نجمی سے ملنے لکھی بائی کے بنگلے پر آیا تھا تو اس نے دریا پار کسی وائرلیس اسٹیشن کا اونچا انٹینا دیکھا تھا جس کے تاروں کا ایک جال بچھا ہوا تھا۔ یقیناً وہ یہی وائرلیس اسٹیشن کا انٹینا تھا۔

ندیم کو حوصلہ ہوا وہ ٹھیک راستے پر جا رہا تھا۔ اس نے اپنے بائیں جانب اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کر دیا۔ لکھی بائی کا بنگلہ کہیں قریب ہی ہونا چاہیئے تھا۔ وہ دریا کے کنارے سے ہٹ کر بائیں جانب ڈھلان پر آ گیا۔ یہاں اسے کچھ دور گھنے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آیا۔ اس جھنڈ کو بھی اس نے پہچان لیا۔ یہ درخت لکھی بائی کی کوٹھی کے باہر کھڑے تھے۔ ندیم اسی طرف چلنے لگا مگر اسے وہاں کوئی بنگلہ اندھیرے میں ابھی تک دکھائی نہیں دیا تھا۔ کہیں وہ غلط سمت تو نہیں آ گیا؟ یہ خیال اس کے دل میں آیا ہی تھا کہ اندھیرے میں اسے کسی اک منزلہ عمارت کا سایہ سا

ابھرتا نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ ندیم کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ یہی لکھی بائی کا بنگلہ تھا بنگلے کے گیٹ کا ایک ہی پٹ تھا جو بند تھا۔ ندیم درختوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا اور غور سے بنگلے کی طرف دیکھنے لگا۔ بنگلے کے اوپر قوس کی شکل میں ایک بورڈ لگا تھا جس کی عبارت وہ پڑھ نہیں سکتا تھا، لیکن لکھی بائی کا خستہ حال پرانا بنگلہ ندیم نے پہچان لیا تھا۔ اب اسے یہ خطرہ تھا کہ اگر بنگلے کے اندر کوئی چوکیدار پہرہ دے رہا ہے تو وہ اس سے کیسے اپنے آپ کو بچائے گا لکھی بائی مر چکی تھی لیکن ندیم کو یقین تھا کہ نجمی یا کرشنا بائی میں سے کوئی نہ کوئی اس بنگلے میں ضرور موجود ہو گا۔ کرشنا اور نجمی نے بھی اسے بتایا تھا کہ لکھی بائی کے قتل کے بعد اب وہ سوناگاچی میں دھندا کرنے کے بعد اسی بنگلے میں آدھی رات کے بعد آجاتی ہیں۔ خطرہ اسے لکھی بائی کے بدمعاشوں دھومل اور اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرف سے تھا۔ ندیم کے پاس کوئی اسلحہ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ وہ درخت کی اوٹ میں اندھیرے میں بیٹھا سوچنے لگا کہ اسے بنگلے میں کس طرف سے داخل ہونا چاہیئے بنگلے کے اردگرد نو فٹ اونچی چار دیواری بنی ہوئی تھی۔ ندیم نے چاروں طرف دیکھا۔ رات سنسان اور اندھیری تھی۔ کسی پہریدار کی بھی کسی جانب سے آواز نہیں آرہی تھی۔ ندیم نے اللہ کا نام لیا اور اٹھ کر بنگلے کے عقب کی جانب آگیا۔ یہاں کوئی درخت نہیں تھا۔ وہ بنگلے کی پرانی مگر بے حد پختہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اس دیوار کو وہ کسی سہارے کے بغیر نہیں پھاند سکتا تھا وہ پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا۔ دیوار کے مغرب کی طرف چلنے لگا کہ شاید کسی جگہ اسے دیوار پھاندنے کے واسطے کوئی سہارا مل جائے یا کسی جگہ سے دیوار ٹوٹی ہوئی ہو۔ بنگلے میں گہرا اندھیرا اور موت ایسا گھمبیر سناٹا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وہ کوئی بھوت محل لگ رہا تھا۔ ایک دم سے ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں بیٹھ گیا۔ اسے اپنے پیچھے آہٹ سی سنائی دی تھی۔

...   .

ندیم کو قدموں کی چاپ صاف سنائی دی تھی۔ یہ آواز اندھیرے میں اس کے عقب سے آئی تھی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ گیا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جدھر سے آواز آئی تھی ادھر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ رات کے ڈیڑھ بجے کا عمل تھا۔ کلکتہ کے دریائے ہگلی کے کنارے لکھی بائی مقتولہ کا یہ قدیم خستہ حال بنگلہ آسیب زدہ معلوم ہو رہا تھا۔ سامنے کی جانب کسی طرف بھی بنگلے میں روشنی نہیں تھی۔ ندیم لٹیروں کا گیراج توڑ کر یہاں نجمی سے ملاقات کرنے آیا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ نجمی واپس یہاں پہنچ چکی ہے۔ اگر وہ رات کو سوناگاچی کے کوٹھے پر کرشنا بائی کے ساتھ مجرا بھی کرتی رہی ہو گی تو اس وقت تک یہاں پہنچ چکی ہو گی۔ ندیم کے دل میں خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ان لٹیروں کی ٹولی میں سے کوئی ایک لٹیرا اس کے پیچھے لگا ہوا ہو۔ جنھوں نے اسے یرغمال بنا کر دریا کے کنارے والے پرانے گیراج میں بند کر دیا تھا۔ لیکن انھیں تعاقب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ انھیں تو اسے گولی مار دینی چاہیئے تھی کیونکہ ندیم ان کی خفیہ کمین گاہ کا راز اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔ اندھیرا اگرچہ گہرا تھا لیکن ستاروں کی دھندلی چمک میں کچھ فاصلے پر درخت تاریکی کے پس منظر میں ابھرتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ ندیم نے سوچا ہو سکتا ہے اس کا وہم ہو۔ اگر کوئی پیچھے لگا ہوتا تو اب تک اسے پستول دکھا کر گرفتار کر چکا ہوتا۔ کیونکہ ندیم جیل توڑ کر بھاگا ہوا مفرور قیدی تھا جس پر انڈین ملٹری انٹیلی جینس کی طرف سے پاکستانی جاسوس ہونے کا سنگین الزام لگایا گیا تھا اور سول اور ملٹری پولیس اس کی تلاش میں تھی۔ اگرچہ ندیم دلی کی جیل سے بھاگا تھا لیکن پولیس کو معلوم تھا کہ مفرور ملزم یا پاکستانی جاسوس ندیم کی محبوبہ چندا بائی کلکتہ میں ہے اور وہ اس سے ملنے کلکتہ ضرور جائے گا۔ اس طرح سے پولیس کلکتہ میں بھی چوکس تھی اور تھوڑی دیر پہلے بنگال رائفلز کے کچھ جوانوں نے اسے

گرفتار بھی کر لیا تھا۔ ندیم کی قسمت اچھی تھی کہ اس نے دلیری سے کام لیا اور ان کی قید سے بھاگ کر چنیوٹ کے نیک دل تاجر کے گھر پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ وہاں سے وہ امجدیہ ہوٹل کے مالک سیٹھ جبار کے پاس ایک کھوکھے میں چھپ کر جا رہا تھا کہ کلکتے میں رات کو فوجی وردی پہن کر وارداتیں کرنے والے لٹیروں نے ویگن کے کھوکھوں کو مال سے بھرا ہوا سمجھ کر ان پر قبضہ کر لیا اور گیراج میں لے گئے۔ وہاں سے ندیم کھوکھے میں سے کسی طرح نکل کر بھاگ کھڑا ہوا۔ اور اب نجمی سے ملنے نکھی بائی کے پرانے بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا اندر جانے کا کوئی راستہ تلاش کر رہا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار اگرچہ اسٹول پر دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا لیکن ندیم کے پاؤں کی آواز سے وہ بیدار ہو کر شور مچا سکتا تھا۔ چنانچہ ندیم نے یہی فیصلہ کیا کہ وہ کسی جگہ سے دیوار پھاند کر بنگلے کے باغ میں اتر جائے گا۔ اس ارادے کے ساتھ وہ بنگلے کی عقبی دیوار کے قریب آیا ہی تھا کہ اسے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

ندیم کو جب یہ یقین ہو گیا کہ جسے وہ کسی کے قدموں کی چاپ سمجھ رہا تھا وہ محض اس کا وہم تھا۔ تو اس نے اندھیرے میں دیوار کا جائزہ لیا۔ دیوار کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑا ہوا تھا ایک جگہ سے اینٹ نکلی ہوئی تھی۔ ندیم نے اس میں پاؤں پھنسایا اور دیوار پر چڑھ کر بالکل سیدھا لیٹ گیا۔ اس نے دوسری طرف اندھیرے میں جھانکا، پپیتے کے درختوں کے نیچے ایک کھوکھا پڑا تھا۔ ندیم آہستہ سے دیوار کو ہاتھوں سے پکڑ کر دوسری طرف بنگلے کے باغ میں اتر گیا۔ پپیتے کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر اس نے بنگلے کے عقبی برآمدے کی طرف غور سے دیکھا۔ وہاں بھی کوئی روشنی نہیں تھی۔ وہ آہستہ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا کوٹھی کی دوسری طرف آ گیا۔ یہاں پہلی بار اسے کھڑکی میں سے ہلکی ہلکی روشنی باہر آتی نظر آئی۔ ندیم قریب گیا۔ کھڑکی بند تھی، اندر کی جانب پردہ گرا ہوا تھا۔ کھڑکی پر شیشے لگے ہوئے تھے۔ بھاری پردے کی وجہ سے اندر کی روشنی بہت ہلکی ہو کر باہر آ رہی تھی۔ عجیب بات تھی کہ بمبئی، کلکتے کے مکانوں، بنگلوں اور فلیٹوں کی طرح اس کھڑکی پر لوہے کی سلاخیں نہیں لگی تھیں۔ ندیم کو اندر سے انسانی آوازیں آتی محسوس ہوئیں۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیئے۔ اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اندر نجمی بول رہی تھی۔ وہ کسی سے کوئی بات کر رہی تھی۔ آواز بہت دھیمی تھی۔ ندیم یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ نجمی کس سے باتیں کر رہی ہے

اس نے ایک کان انگلی سے بند کر کے دوسرا کان کھڑکی کے شیشے کے بالکل ساتھ لگا دیا۔ نجمی غصے میں کسی سے کہہ رہی تھی۔

"اسے کہہ دو اس کی ماں مجرا کر کے ابھی آ رہی ہے۔ اگر زیادہ گڑبڑ کی تو میں چاقو مار کر اس کا پیٹ پھاڑ دوں گی۔ جاؤ۔ تم بھی دفعہ ہو جاؤ میرے کمرے سے۔"

یہ نجمی کا کمرہ تھا۔ نجمی کو شاید کوئی اپنے پاس بلا رہا تھا اور وہ مشتعل ہو رہی تھی۔ ندیم کو جانے کیوں اس نجمی کا خیال آ گیا جو لاہور کے یونیورسٹی کیمپس کے کیفے ٹیریا میں بیٹھ کر اس سے انگریزی لٹریچر پر بڑی شائستہ باتیں کیا کرتی تھی۔ اب نجمی کتنی بدل گئی تھی۔ ماحول نے اسے اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ کھڑکی کی دوسری طرف گہری خاموشی چھا گئی۔ پھر بتی بجھ گئی، ندیم سمجھ گیا کہ نجمی بستر پر سونے کے لیے لیٹ گئی ہے۔ ندیم شاید اس موقع کے انتظار میں تھا۔ اس نے کھڑکی پر آہستہ سے انگلی سے ٹھک ٹھک کی۔ دوسرے لمحے کمرے میں پھر روشنی ہو گئی۔ نجمی کی کرخت آواز بلند ہوئی "دھول تم رات بھر کھڑکی بجاتے رہو گے تب بھی میں نہیں کھولوں گی۔ دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

اب ندیم نے اپنا منہ کھڑکی کے ساتھ لگا کر آہستہ سے کہا "نجمی! میں ہوں ندیم۔"

کمرے کی روشنی فوراً ہی بجھ گئی۔ نجمی نے ندیم کی آواز سن لی تھی۔ کھڑکی آہستہ سے کھل گئی۔ اندھیرے میں ندیم کو نجمی کا دھندلا دھندلا چہرہ دکھائی دیا۔ نجمی نے جھک کر سرگوشی میں کہا "اندر آ جاؤ" ندیم کھڑکی میں سے اندر کمرے میں آ گیا۔ نجمی نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور اندھیرے میں ندیم کا ہاتھ پکڑ کر اسے پلنگ کی طرف لے آئی۔ خدا کا شکر ہے تم بچ کر نکل آئے۔ میں نے تمھیں فوجی جیپ میں جاتے دیکھا تھا۔ ندیم نے جلدی جلدی سارے واقعات نجمی کو بیان کیے اور بولا "نجمی! خدا کے لیے اب بھی میری بات مان لو۔ اور اس گناہ کی کیچڑ سے نکل کر میرے ساتھ مشرقی پاکستان چلی چلو۔ نجمی میری زندگی کا اب یہی مقصد ہے کہ میں تمھیں جس قدر سکھ پہنچا سکوں۔۔ پہنچاؤں لیکن اپنی زندگی بھی تم پر قربان کر دوں۔

نجمی نے ندیم کے چہرے کو اپنی ہتھیلیوں میں لیتے ہوئے کہا "ندیم! میں تمھارے اس جذبے اور محبت کی دل سے قدر کرتی ہوں لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ میں اب تمھارے لائق نہیں رہی۔

دوسری بات یہ کہ جب تک میں اپنے دشمنوں سے انتقام نہیں لیتی یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ یہ میں نے قسم کھا رکھی ہے۔"

ندیم کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے پر کسی نے زور سے ہاتھ مار کر کہا "دروازہ کھولو چندا بائی میں انسپکٹر منجریکر ہوں۔"

ندیم کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ کھڑکی کی طرف دوڑا۔ اس نے کھڑکی کھول دی اور باہر چھلانگ لگانے ہی لگا تھا کہ دو سپاہی رائفلیں تانے کر سامنے آ گئے۔ ایک نے چلا کر کہا "بھاگا تو شوٹ کر دوں گا۔"

انسپکٹر منجریکر دروازہ زور زور سے دھڑدھڑا رہا تھا۔ ایک سپاہی کود کر کمرے میں آ گیا اور ٹارچ روشن کر دی۔ نجمی اپنے دل کو پکڑ کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اب ندیم ان بھیڑیوں کے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتا۔ دوسرا سپاہی بھی کود کر کھڑکی میں سے اندر آ گیا اور اس نے رائفل کی نالی ندیم کی گردن پر رکھ دی۔ دوسرے سپاہی نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ مرہٹہ انسپکٹر منجریکر تین سپاہیوں کے ہمراہ کمرے میں گھس آیا۔ ندیم کو ٹارچ کی روشنی میں رائفل کی نالی کی زد میں دیکھا تو مسکرا دیا "چندا بھائی! مجھے پورا وشواش تھا کہ ہمارا مجرم اور پاکستانی جاسوس تمھارے کمرے کے سوا اور کہیں نہیں ہوگا۔" انسپکٹر نے کمرے کی بتی جلا دی۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا۔ ندیم نے نجمی کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ انسپکٹر منجریکر نے غراتے ہوئے حکم دیا "اسے ہتھکڑی لگا کر باہر جیپ میں لے چلو۔" ندیم کے ہاتھ پیچھے کر کے فوراً آہنی ہتھکڑی لگا دی گئی۔ سپاہی اسے کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ نجمی نے اپنے ہونٹ دانتوں سے کاٹتے ہوئے زہریلی نظروں سے انسپکٹر منجریکر کی طرف دیکھا اور کہا "تم ایک بے گناہ کو پھانسی کے تختے کی طرف لے جا رہے ہو۔ ندیم کا صرف اتنا قصور ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور صرف مجھ سے ملنے ویزے کی پابندیاں توڑ کر دلی سے کلکتے آ گیا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی قصور نہیں۔" انسپکٹر منجریکر نے آگے بڑھ کر زور سے نجمی کے گال پر ایک تھپیڑ مارا اور غضبناک آواز میں بولا "یہ سب کچھ جانتے ہیں چندا بائی! پر تم سے بھی نمٹ لیں گے۔"

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ نجمی انسپکٹر منجریکر کا تھپیڑ کھا کر پلنگ پر گر پڑی تھی۔

وہ گال پر ہاتھ پھیرتی ہوئی اٹھ کر کارنس پر رکھے آئینے کے سامنے آئی۔ آئینے میں اپنے چہرے کو دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے کونے میں سے خون کی ایک باریک لکیر بہنے لگی تھی۔ نجمی کو اس وقت اپنا چہرہ ایک ایسی شیرنی کی طرح لگا جو انسانی خون کی پیاسی ہو۔ انسپکٹر منجریکر کی شکل وہ اپنی آنکھوں کے سامنے لاتی ہوئی دل میں بڑبڑائی "منجریکر تیری باری سب سے پہلے آئے گی۔ وقت آنے پر میں اپنے ہاتھوں سے تیرا گلا کاٹوں گی۔" اور وہ پلنگ پر گر کر بے اختیار رونے لگی۔

ندیم کو پولیس کی بند گاڑی میں بٹھا کر دھرم تلہ کے بڑے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا گیا۔ ہتھکڑی تو اسے پہلے ہی لگی تھی۔ اب اس کے پاؤں میں بیڑیاں بھی ڈال دی گئیں۔ انسپکٹر منجریکر اب کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔

راتوں رات پولیس کے اعلیٰ حکام کو پاکستانی جاسوس کی گرفتاری کی اطلاع کر دی گئی۔ ملٹری پولیس کے کرنل وشوا ناتھ بھی رات کو تھانے پہنچ گئے۔ انھوں نے ندیم کو حوالات میں دیکھا اور تھانے سے ہی ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر کو فون کیا کہ میں آپ سے اسی وقت ملنا چاہتا تھا۔ کرنل وشوا ناتھ رات کے تین بجے انڈین ملٹری انٹیلی جنس کے ڈائریکٹر جنرل کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ آدھ گھنٹے کی بات چیت اور صلاح مشورے کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ "پاکستانی جاسوس ندیم کو کالے پانی کے سینٹینل جزیرے میں قید کر دیا جائے۔" سینٹینل جزیرہ انڈیمان کے دوسو جزیروں میں سے ایک جزیرہ ہے۔ انڈیمان کے جزائر خلیج بنگال میں برما اور انڈیا کے درمیان واقع ہیں۔ انھیں کبھی کالے پانی کے نام سے بھی پکارا جاتا تھا اور انگریزوں کے زمانے میں سیاسی قیدیوں اور انتہائی خطرناک مجرموں کو یہاں عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا جاتا تھا۔ یہاں انگریزوں نے اس مقصد کے لیے ایک بہت بڑی جیل بنائی تھی جس کے برآمدے اور راہ داریوں میں بھی لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سیاسی قیدیوں کو جزیرے میں کھلا چھوڑ دیا جاتا۔ انھیں اس بات کی بھی اجازت تھی کہ وہ جزیرے کے باشندوں کے ساتھ مل کر کوئی چھوٹا موٹا کام کریں۔ خطرناک مجرموں کو جیل کی کوٹھڑیوں میں بند کیا جاتا۔ ان جزیروں سے فرار نا ممکن تھا۔ یہ سارے کے سارے جزیرے سمندر میں گھرے ہوئے ہیں۔ یہ کالا سمندر تقریباً سارا سال ہی بپھرا رہتا ہے۔

مئی سے نومبر تک موسلا دھار بارشیں ہوتی ہیں۔ اور سمندر اس قدر بپھرا ہوا ہوتا ہے کہ کسی جہاز کا ساحل تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ یہاں گھنے جنگلوں میں دن کے وقت بھی اندھیرا چھایا رہتا ہے اور مکھیوں جتنے بڑے مچھر پائے جاتے ہیں۔ مقامی لوگوں میں یرقان، ملیریا اور زرد بخار عام ہوتا ہے۔ انگریزوں کے جانے کے بعد ان جزیروں پر بھارت نے قبضہ کر لیا اور اب انڈیا گورنمنٹ ہی ان جزیروں کا نظم و نسق چلاتی ہے۔ یہاں کی آبادی برمی، ملائی، بھارتی، حبشی اور مقامی قبیلے کے لوگوں پر مشتمل ہے۔ مسلمان سب سے پہلے ۱۷۸۰ء میں یہاں سیاحوں کی حیثیت سے آئے اور یہاں اسلام کی شمع روشن ہوئی۔ ان جزیروں میں آج بھی مسلمان ہزاروں کی تعداد میں اپنے دینی ارکان کی پابندی کرتے ہوئے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ دلکش دیپ کے جزیروں میں خوبصورت مساجد اور بزرگانِ دین کے مزار بھی ہیں۔

ندیم کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے کالے پانی بھیجے جانے کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام یہ چاہتے تھے کہ اس "پاکستانی جاسوس" ندیم کو سب سے پہلے کسی ایسی جگہ قید کر دیا جائے جہاں سے اس کے لیے فرار ہونا ناممکن ہو اور ایسی جگہ کالا پانی ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ ندیم سے ایک منصوبے کے تحت پوچھ گچھ کر کے اس کے ساتھیوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے۔

رات ندیم نے دھرم تلہ کی حوالات میں گزار دی۔ دوسرے دن اسے بند گاڑی میں ڈال کر کلکتے کی خضر پور جیٹی پر پہنچا دیا گیا۔ یہاں نیول گارڈ کی خصوصی حوالات میں دو روز اسے بند رکھا گیا۔ تیسرے دن ایک بھارتی نیوی کا جہاز مٹی کا تیل، پیاز، نمک اور چینی لے کر جزائر انڈیمان یعنی کالے پانی جا رہا تھا۔ ندیم کو اس جہاز پر اسپیشل گارڈز کی معیت میں سوار کرا دیا گیا۔ جہاز پر آنے کے بعد ندیم کو پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ اسے کالے پانی لے جایا جا رہا ہے۔ وہ سوائے خاموش رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن دل میں اس نے ایک بار پھر طے کر لیا تھا کہ وہ موقع ملتے ہی کالے پانی سے بھی فرار ہونے کی کوشش کرے گا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ کالے پانی کے جزیرے کیسے ہیں اور ان کا محلِ وقوع کیا ہے۔ ان جزیروں کے بارے میں اس نے صرف جغرافیہ کی کتاب میں ہی پڑھا تھا اور یہ سن رکھا تھا کہ انگریزوں کے زمانے میں یہاں

سیاسی قیدیوں کو عمر بھر کے لیے بھیج دیا جاتا تھا اور پھر ان کی کوئی خبر نہیں آتی تھی۔ ندیم سے دل میں کالے پانی کی دہشت ضرور تھی۔ اسے مال بردار جہاز کے نچلے ڈیک یعنی جہاز کی سب سے نچلی منزل میں پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر بند کر دیا گیا۔ صرف باتھ روم میں جاتے وقت اس کی بیڑیاں کھول دی جاتی تھیں۔ لوئر ڈیک میں اسپیشل فوجی گارڈ کے چھ ہنگامی فوجی ہر وقت اس کی نگرانی کے لیے موجود رہتے تھے۔ جہاز کلکتے کی بندرگاہ سے روانہ ہو کر دریائے ہگلی میں سے گزرتا ہوا خلیج بنگال کے کالے پانیوں میں داخل ہو گیا تھا۔ ندیم کو کچھ معلوم نہ تھا کہ کب دن ڈوبا کب رات ہوئی اور کب پھر سورج طلوع ہوا۔ بحری جہاز میں یہ اس کا پہلا سفر تھا۔ برسات کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ سمندر چڑھاؤ پر نہیں تھا۔ پھر بھی جہاز جب جزائر انڈیمان کے پانیوں میں داخل ہوا تو بری طرح ڈولنے لگا۔ اپنے گارڈز کی باتوں سے ندیم نے اندازہ لگایا کہ جہاز کو سمندر میں سفر کرتے آج تیسرا روز ہو گیا ہے۔ یہ مال بردار چھوٹا جہاز تھا اس کی رفتار بھی زیادہ نہیں تھی۔ پہلے اور دوسرے روز جہاز زیادہ نہیں ڈولا تھا۔ تیسرے روز اس نے آگے پیچھے دائیں بائیں ڈولنا شروع کر دیا تو ندیم کو چکر آنے لگے۔ وہ بیڑیوں سمیت جہاز کے ننگے فرش پر آنکھیں بند کیے چت پڑا رہا۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا کہ یہ کالے پانی کا سفر کبھی ختم نہ ہو گا۔ جیسے وہ آسمان و زمین کے درمیان لٹکا دیا گیا ہے اور طوفانی ہوائیں اسے آگے پیچھے جھولا جھلا رہی ہیں۔ یہ رات کا وقت تھا یا دن کا سماں تھا۔ ندیم نہیں جانتا تھا۔ خصوصی گارڈز کے سپاہی ہر وقت اس کے سر پر موجود رہتے لیکن اسے کوئی سوال پوچھنے کی اجازت نہیں تھی۔ جہاز بری طرح ڈول رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے باہر سمندر میں طوفان آیا ہوا ہے۔ لیکن جہاز کے نچلے حصے میں سوائے انجنوں کی آواز کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ خدا جانے کتنا وقت اس طرح گزر گیا۔ پھر اسے جہاز کے بھونپوں کے بار بار بولنے کی دھیمی آوازیں آئیں۔ جزائر انڈیمان کے جزیرہ سینٹیل کی جیٹی دور سے نظر آنے لگی تھی۔ اب جہاز کی رولنگ کافی حد تک کم ہو گئی تھی۔ جہاز کی گودی پر انڈیمان نیوی کے کچھ افسر اور ملاح کھڑے جہاز کی طرف مسلسل دیکھ رہے تھے۔ ایک اسٹیمر دوسری طرف سے نکل کر جہاز کی طرف بڑھا اور جیسے اسے راستہ دکھاتا اس کی راہنمائی کرتا آگے آگے سیاہ پانیوں کی لہروں میں چلنے لگا۔

جہاز سینیٹل بندرگاہ کی جیٹی سے کچھ فاصلے پر رک گیا۔ فوراً اس کا لنگر سمندر میں پھینک دیا گیا۔ سمندر میں غیر معمولی تموّج کی وجہ سے جہاز گودی سے تھوڑی دور سمندر میں ہی لنگر انداز ہو گیا تھا۔ جہاز کے انجن بند ہوئے تو ندیم نے سکون کا سانس لیا۔ اسے جس ستون کے ساتھ رسی سے باندھا ہوا تھا کھول دیا گیا۔ بیڑیاں اس کے پاؤں میں ویسے ہی پڑی تھیں۔ گارڈ کے سپاہی اسے چلاتے ہوئے اوپر والے ڈیک پر لے آئے۔ ندیم نے کئی دنوں کے بعد نیلے آسمان اور ساحل پر ہوا میں لہراتے ناریل کے درختوں کو دیکھا تو خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ جہاز میں سے زندہ بچ کر باہر آ گیا ہے۔ وہ جزیرے کی چھوٹی سی گودی اور اس کے پیچھے کنارے سے دور لہراتے ناریل کے جھنڈوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اسے یہاں سے ایک نہ ایک دن ضرور فرار ہونا تھا۔ کالے پانی کی جیل کے دو افسر اور سپاہی اس کو لینے وہاں آئے ہوئے تھے۔ ندیم نے جہاز سے اسٹیمر پر قدم رکھا تو اس کو ابھی تک چکر آ رہے تھے۔ لگتا تھا جیسے یہ چکر کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ جس طرح نجمی کے کمرے سے وہ گرفتار ہو کر دمدم تلہ کی حوالات میں پہنچا تھا۔ وہ سب کچھ ندیم کو ایک ڈراؤنے خواب کی طرح یاد آ رہا تھا۔ کالے پانی کی سینٹرل جیل کے سکھ چیف وارڈن خاکی وردی خاکی پگڑی میں جیٹی پر کھڑا "پاکستانی جاسوس" ندیم کو بھارتی ملٹری گارڈز کے گھیرے میں اس اسٹیمر کے ڈیک پر بیٹھا غور سے دیکھ رہا تھا۔ جو مال بردار جہاز میں سے انھیں جیٹی تک لا رہا تھا۔ کالے پانی کے جیل کے سکھ چیف وارڈن کا نام گنڈا سنگھ تھا۔ سیاہ کالی داڑھی اور پھولی ہوئی مونچھوں نے گنڈا سنگھ کے چہرے کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ توند باہر کو پھولی ہوئی تھی۔ وہ اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے بید کو آہستہ آہستہ اپنی ٹانگ پر مار رہا تھا۔ اسے پہلے سے اطلاع مل گئی تھی کہ ایک خطرناک پاکستانی جاسوس اس کی جیل میں لایا جا رہا ہے۔ جہاں فوجی حکام دو روز بعد اس سے پوچھ گچھ کرنے آئیں گے۔ ندیم کو سپاہیوں نے پکڑ کر جیٹی کے فرش پر کھڑا کیا تو ایک طرف کو گرتے گرتے اس نے بمشکل اپنے آپ کو سنبھالا۔

چیف وارڈن گنڈا سنگھ نے آگے بڑھ کر ندیم کی ٹھوڑی کے نیچے بید رکھ کر اس کے چہرے کو اوپر کیا۔ سرخ آنکھوں سے گھورتے ہوئے بولا۔ "میرا نام گنڈا سنگھ ہے۔ میں گڈ چھڈاں گا"

ندیم اسے بے بسی کی نگاہوں سے دیکھتا رہ گیا۔ جیٹی کے باہر ایک بند گاڑی موجود تھی۔ اسے

گاڑی میں بٹھا کر کالے پانی کی سینٹرل جیل کی طرف لے جایا گیا۔ اس چھوٹی سی بند گاڑی میں سلاخ دار ایک ہی کھڑکی تھی جس میں سے ندیم کو جزیرہ سینیٹل کے ناریل کے درخت اور گھاس پھونس کی جھونپڑیاں اور کہیں کہیں ڈھلانی چھت والی ایک آدھ عمارت نظر آ جاتی تھی۔ دھوپ کا رنگ پھیکا پڑ رہا تھا۔ سہ پہر کے چار بج رہے تھے۔ ہوا مرطوب تھی جس میں سمندر کی نمی اور مچھلی کی بو رچی ہوئی تھی۔ فضا میں حبس تھا اور بند گاڑی میں ندیم کو گرمی لگ رہی تھی۔ گاڑی جزیرہ سینیٹل کی مختلف چھوٹی بڑی سڑکوں پر سے ہوتی ہوئی ناریل اور سینیٹل کے درختوں میں گھری ہوئی اس پکی سڑک پر آ گئی جو سیدھی سنٹرل جیل کی طرف جاتی تھی۔ سنٹرل جیل کا لوہے کا پھاٹک بند تھا۔ اگرچہ اس جیل میں اب قیدیوں کی وہ تعداد نہیں تھی جو انگریزوں کے زمانے میں ہوا کرتی تھی لیکن یہ بات صرف جیل کے حکام اور انڈین ملٹری انٹیلی جینس کو ہی معلوم تھی کہ کانگریسی حکومت نے یہاں علیحدگی پسند تحریکوں کے جوشیلے لیڈروں کو بند کر رکھا ہے۔ ان بدنصیب قیدیوں کے لواحقین کو بھارت میں کچھ خبر نہیں تھی کہ یہ لوگ کہاں اچانک غائب ہو گئے ہیں۔ بھارتی حکومت نے ان کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر رکھا تھا کہ یہ تخریب کار ہمسایہ ملک میں تخریب کاری اور دہشت گردی کی ٹریننگ کرنے گئے ہوئے ہیں۔ ان ساری باتوں کا علم ندیم کو جیل میں آنے کے بعد ایک مسلمان بنگالی نژاد انڈیمانی مسلمان نذرل کے ذریعے ہوا۔ جو جیل میں نائب میٹ تھا اور اس کی ڈیوٹی صبح اور شام کے وقت ان مختصر قیدیوں کی گنتی کر کے بلند آواز میں "سب اچھا ہے" کا اعلان کرنا تھا۔ جیل کے آہنی گیٹ پر جیل کا بہاری ہندو سپرنٹنڈنٹ "پاکستانی جاسوس" کو انڈین ملٹری گارڈز سے وصول کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ نائب وارڈن، حوالدار اور میٹ بھی ایک طرف اٹین شن کھڑے تھے۔ حوالداروں میں چار سکھ تھے۔ انھوں نے رائفلیں کاندھوں پر اٹھا رکھی تھیں۔ گنڈا سنگھ چیف وارڈن ندیم کے ساتھ ہی گاڑی سے اترا۔ ندیم کے پاؤں میں بیڑی پڑی تھی جس کی وجہ سے اسے چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ انڈین گارڈز نے ندیم کو جیل سپرنٹنڈنٹ کے حوالے کر کے دستخط لیے اور وہاں سے گاڑی میں بیٹھ کر واپس چلے گئے۔ ندیم کو بیرک نمبر ۳ کی "چکی" میں بند کر دیا گیا۔ یہ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں کوئی کھڑکی یا روشندان نہیں تھا۔ فرش پر ناریل کی چھال بچھی تھی۔ کونے میں مٹی کا گھڑا رکھا تھا جس کے اوپر ناریل کا پیالہ اوندھا پڑا تھا۔ کوٹھڑی کے دروازے

لوہے کی سلاخیں لگی تھیں۔ سامنے ایک تنگ راہداری تھی جہاں سے کبھی کبھی حوالدار بندوق لیے گزر جاتا تھا۔ ندیم کو کالے پانی کی اس جیل میں آئے دو دن ہوئے تھے کہ انڈیا سے تین فوجی پوچھ گچھ کرنے آ گئے۔ ندیم کو جیل کے ایک تہہ خانے میں لے جایا گیا۔

ان فوجیوں میں ایک سکھ میجر بھی تھا۔ پہلے تو اس نے ندیم کے ساتھ بڑی ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے قائل کرنے کی کوشش کی اور اسے پیش کش کی کہ اگر وہ اپنے ساتھی جاسوسوں کے پتے بتا دے تو اسے کچھ نہیں کہا جائے گا۔ اس پر مقدمہ بھی نہیں چلایا جائے گا اور اسے پاکستانی سفارت خانے پہنچا دیا جائے گا۔ ندیم کا جاسوسی سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ پاکستانی جاسوس نہیں تھا، وہ تو صرف نجمی کی خاطر بھارت آیا تھا اور اس کا مقصد صرف نجمی کو اپنے ساتھ واپس پاکستان لے جانا تھا۔ اس نے یہی کہہ دیا کہ وہ جاسوس نہیں ہے۔ تب اس پر تشدد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے تو اسے بیدردی سے پیٹا گیا پھر اسے رسی کے ساتھ الٹا لٹکا دیا گیا۔ تشدد اور بربریت کا یہ سلسلہ دو روز تک جاری رہا۔ اس دوران ندیم کو سوائے چند گھونٹ پانی کے اور کچھ نہ دیا گیا۔ کئی بار وہ بے ہوش ہوا۔ اسے زبردستی ہوش میں لایا جاتا اور جسمانی اذیتوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو جاتا۔ پانچویں روز سکھ میجر نے جیل کے بہاری ہندو سپرنٹنڈنٹ کو بلا کر حکم دیا کہ اس "پاکستانی جاسوس" کی کڑی نگرانی کی جائے اور اسے کسی حالت میں بھی جیل کی کوٹھڑی سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ انڈین فوجی ہیلی کوپٹر میں بیٹھ کر کسی نئی منصوبہ بندی کے لیے واپس بھارت چلے گئے۔

ندیم کی گرفتاری کے بعد مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کو نجمی پر تشدد کرنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آ گیا۔ بنگال پولیس کے محکمے نے منجریکر کو تعریفی سند عطا کر دی اس نے ایک خطرناک "پاکستانی جاسوس" کو دوبارہ گرفتار کروایا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو اب کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ جب چاہتا نجمی کو اپنے فلیٹ پر بلا لیتا اور اسے اپنی حیوانی بربریت کا نشانہ بناتا۔ نجمی کے سینے میں جو لاوا ابل رہا تھا لگتا تھا کہ اب وہ پھٹنے ہی والا ہے۔ بہت جلد نجمی کو ایک ایسا موقع مل گیا جس کی وہ مدت سے تلاش میں تھی۔ ندیم کے بارے میں اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے گرفتاری کے بعد کہاں رکھا گیا ہے اور وہ کس حال میں ہے۔ ایک رات نجمی، چندا بائی کے روپ

میں سوناگاچی والے کوٹھے پر مجرا کر رہی تھی۔ رات کا ایک بجنے والا تھا۔ اکثر تماش بین جا چکے تھے صرف ایک سیٹھ بیٹھا ابھی تک سو سو کے نوٹ لٹا رہا تھا۔ نجمی مجرا کرتے کرتے تھک گئی تھی لیکن دھومل بدمعاش جس نے نکھی بائی کے قتل کے بعد اپنی بدمعاشی کے بل پر کرشنا بائی اور چندا کو اپنے قبضے میں لے لیا تھا، اسے مجرا جاری رکھنے کی ہدایت جاری کر رہا تھا کیونکہ سیٹھ دولت لٹا رہا تھا جسے دھومل سمیٹتا جا رہا تھا۔ کرشنا بائی اوپر والے کوٹھے پر سے اپنا دھندا ختم کر کے جا چکی تھی۔ اتنے میں ایک اونچا لمبا بڑی بڑی مونچھوں والا قوی ہیکل سرخ و سپید جوان رائفل ہاتھ میں لیے کاندھے پر گولیوں کی پیٹی لٹکائے، سر پہ لال صافہ باندھے دروازہ کھول کر بیٹھک میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے دو مسلح باڈی گارڈ بھی تھے۔ دھومل، نجمی اور سازندوں نے اس کی طرف سہمی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ مجرا رک گیا۔ نووارد جوان نے رائفل والا ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا "ناچ بند نہ کرو بائی ہم تمہارا گانا سننے آئے ہیں" اور سیٹھ کے پاس ہی چاندنی پر بیٹھ گیا۔

اس کے باڈی گارڈز دروازے کے قریب ہی دری پر بیٹھ گئے۔ نجمی نے مجرا شروع کر دیا۔ طبلے پر تھاپ پڑنے لگی مگر طبلچی خوف کی وجہ سے بے تالے ہو رہے تھے۔ اجنبی نوجوان کا چہرہ مہرہ بتا رہا تھا کہ وہ کوئی خونخوار ڈاکو ہے یا پھر پنجاب کا کوئی نامی گرامی بدمعاش ہے۔ اجنبی نوجوان نے جیب سے سو سو روپے کی دو گڈیاں نکال کر سامنے رکھ لیں۔ ان میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر نجمی کی طرف اچھالا اور کہا "چندا بائی! ہم نے تمہارے مجرے کی بڑی تعریف سنی تھی۔ سوچا آج چل کر تم سے ملاقات کی جائے۔ میرا نام لال خان ہے۔"

نجمی نے مسکرا کر اس کا شکریہ ادا کیا اور سو روپے کا نوٹ اٹھا کر دھومل بدمعاش کی طرف پھینک دیا جو لال خان کی موجودگی سے کافی حد تک مرعوب تھا۔ بنگالی سیٹھ تو اسی وقت اٹھ کر کوٹھے سے نیچے چلا گیا۔ نجمی نے لال خان کی فرمائش پر ایک اور غزل گانی شروع کر دی۔ اسے یہ خوبصورت اجنبی لال خان اچھا لگا تھا۔ ندیم کے بعد پہلی بار کوئی مرد اسے پسند آیا تھا۔ وہ ایک خاص کیفیت میں ڈوب کر غزل گا رہی تھی۔ لال خان اس پر خوش ہو کر سو سو کے نوٹ نچھاور کر رہا تھا۔ دھومل بدمعاش بے تابی سے نوٹ اٹھا اٹھا کر چاندی کے گول ڈبے میں

جمائے جا رہا تھا۔ ایک بار وہ نوٹ اٹھانے لگا تو لال خاں نے اپنے سامنے پڑی ہوئی رائفل بائیں ہاتھ سے اٹھائی۔ نالی کا رخ دھومل بدمعاش کی طرف کیا اور کرخت لہجے میں پوچھا "ابے چندا بائی کو بھی کچھ دے گا کہ سب اپنے پاس ہی رکھے گا؟"

دھومل بدمعاش نے ہاتھ جوڑے اور ڈری ہوئی آواز میں بولا "دادا بھائی یہ سارا مال چندا بائی ہی کا ہے۔ ہم تو اس کے داس ہیں۔"

لال خاں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا "ابے میں سب جانتا ہوں تم لوگوں کو۔" اس نے رائفل اپنے سامنے رکھ دی اور تکیے سے ٹیک لگا کر اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے مروڑتے ہوئے نجمی کی طرف مسکرا مسکرا کر دیکھنے لگا۔

نجمی غزل بھی گا رہی تھی اور نرت بھی کر رہی تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ سیڑھیوں پہ بھاری قدموں کی آواز سنائی دی۔ لال خان نے دروازے کی طرف دیکھا اور گرج کر کہا "جو کوئی بھی آ رہا ہے اسے واپس بھیج دو۔"

لال خان کے دونوں باڈی گارڈ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھے مگر اتنی دیر میں دوسرا اجنبی دروازے میں نمودار ہو چکا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر دھومل اور نجمی جیسے سکتے میں آ گئے۔

یہ مان سنگھ ڈکیت تھا جو اس کوٹھے میں کئی خون کرنے کے بعد نجمی کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔

لال خان نے مان سنگھ ڈکیت کو پہچان لیا تھا۔ مان سنگھ کے لیے لال خان اجنبی تھا۔ اس نے غرّاتے ہوئے کہا "کون ہو تم؟"

لال خاں اسی طرح تکیے کے سہارے بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں اور ان میں سے چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ اس کے باڈی گارڈ وہیں جم سے گئے تھے۔ مان سنگھ ڈکیت کے باڈی گارڈ بھی اب دروازے میں آ گئے۔ لال خان نے مان سنگھ ڈکیت کے چہرے پر اپنی نظریں گاڑ رکھی تھیں گہری آواز میں بولا "مان سنگھ کیا تو مجھے نہیں جانتا؟ میں لال خاں ہوں۔" مان سنگھ ڈکیت نے رائفل کا رخ لال خاں کی طرف کر دیا اور کرختگی سے بولا "تم جو کوئی بھی ہو۔ اگر جان پیاری ہے تو یہاں سے نیچے اتر جاؤ۔" لال خان نے مونچھیں مروڑتے ہوئے کہا "جان تو لال خان کو کبھی بھی پیاری نہیں ہوئی۔" اس کے ساتھ ہی ایک بجلی چمکی۔ کچھ پتہ نہ چل سکا

کہ کب لال خان کا ہاتھ رائفل کی طرف بڑھا، کب رائفل اٹھی اور کب اس نے آگ اگلی اور گولی مان سنگھ ڈکیت کے سینے سے پار ہو گئی۔ وہ منہ کے بل آگے کو گرا۔ لال خان کے باڈی گارڈوں نے گولیاں چلا کر مان سنگھ کے محافظوں کو خون میں لت پت کر دیا۔ نجمی نے اب جو لال خان کی طرف دیکھا تو وہ رائفل تانے چاندنی پر ٹانگیں پھیلائے کھڑا مان سنگھ ڈکیت کو نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ دھومل بدمعاش چاندی کے ڈبے کے پاس سہما ہوا بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ سازندے وہیں لڑھک کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ لال خان نے اپنے محافظوں سے کہا "اس کتے کے آدمی نیچے ہوں گے۔ انھیں بھی ڈھیر کر دو۔"

دونوں محافظ نیچے کو دوڑے اس کے ساتھ ہی لال خان نے نجمی کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "چندا بائی! تیرے کوٹھے کے فرش پر کافر کا خون بکھر گیا ہے کھنگی سے کہہ کر اسے صاف کرا دینا۔"

اسی لمحے نیچے بازار سے اوپر تلے چار گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی اور جیسے بازار میں بھگدڑ مچ گئی۔ لال خاں نیچے اترنے لگا تو نجمی نے لپک کر اس کا بازو تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے اعتماد کے ساتھ بولی "خان! مجھے اپنے پاس رکھو گے؟"

لال خان نے رائفل کاندھے پر ڈالتے ہوئے کچھ چونک کر نجمی کی طرف دیکھا۔ پھر چہرہ آگے کو جھکا کر کہا "تو ہرنی ہے۔ شیر کے ساتھ کیسے رہے گی؟"

نجمی نے فوراً جواب دیا "میں ہرنی نہیں شیرنی ہوں۔" اس کے ساتھ ہی نجمی نے پلک جھپکتے ہی لال خاں کے کاندھے سے رائفل کھینچ کر اپنے ہاتھوں میں لی اور اس کا رخ دھومل بدمعاش کی طرف کر دیا۔ دھومل بدمعاش بھیگی بلی بنا سہما ہوا بیٹھا تھا۔ طبلچی کو ہوش آ گیا تھا اور وہ خوف زدہ آنکھوں سے یہ سب کچھ ہوتا دیکھ رہا تھا۔

نجمی نے دھومل کو گالی دے کر کہا "تو میرا پہلا انتقام ہے دھومل" اور نجمی نے لبلبی دبا دی۔ دھماکہ ہوا۔ نالی نے شعلہ اگلا اور گولی دھومل کو خون میں لت پت کرتی اس کے سینے سے پار ہو گئی۔ نجمی نے سیفٹی کیچ کھینچ کر دھومل پر اوپر تلے مزید دو فائر کر دیئے دھومل کے جسم میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی اور پھر اس کا جسم ٹھنڈا ہو گیا۔

لال خان نے نجمی کے ہاتھ سے رائفل لے لی اور اس کی کمر کے گرد ہاتھ ڈال کر دروازے

کی طرف لے جاتے ہوئے بولا "چندا بائی! تو سچ مچ شیرنی ہے چل میرے ساتھ۔"

نجمی لال خان کے ساتھ نیچے بازار میں آ گئی۔ بازار میں جن پھر گیا لگتا تھا۔ مان سنگھ ڈکیٹ کی لاش کوٹھے پر دھوبل بدمعاش کی لاش کے ساتھ پڑی تھی اور نیچے بازار میں مان سنگھ کے چاروں ساتھیوں کی لاشیں ادھر اُدھر جیپ کے پاس پڑی تھیں۔ سامنے لال خان کی جیپ کھڑی تھی جس پر اس کے محافظ پہرہ دے رہے تھے۔ بازار خالی ہو گیا تھا۔ نجمی لال خان کے ساتھ جیپ میں بیٹھی اور جیپ ایک زناٹے سے آگے بڑھی اور سونا گاچی کے بازار میں سے نکل کر ایک کھلی کشادہ سڑک پر بھاگنے لگی۔

نجمی نے اپنے دل میں جو فہرست بنائی تھی اس میں سے دھوبل بدمعاش کا نام کاٹ دیا ابھی اس فہرست میں بہت سے ان لوگوں کے نام باقی تھے جنھوں نے نجمی کے دامنِ عفت کو تار تار کیا تھا اور اسے بازارِ حسن میں لا کر کوٹھے پر بٹھا دیا تھا۔ اب اس کی زندگی کا یہی مقصد تھا کہ وہ ایک ایک کر کے ان ظالم اور جابر لوگوں سے بھرپور انتقام لے اور انھیں جہنم واصل کرے۔ یہی وہ مقصد تھا جس کو اپنے سینے میں چھپائے وہ لال خان کے ساتھ بازارِ حسن سے شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ انتقام کی آگ کا یہی وہ شعلہ تھا جو اسے ندیم کے ساتھ واپس پاکستان جانے سے روکے ہوئے تھا۔ ندیم اس سے صرف محبت کرتا تھا اور نجمی کو محبت کی نہیں انتقام کی آگ بجھانے کی ضرورت تھی اور وہ جانتی تھی کہ ندیم اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ گناہ کے بازار میں دکانداری کرتے ہوئے نجمی کو انسانوں کے چہرے پڑھنے آ گئے تھے۔ اس نے لال خان کے چہرے پر وہ شرافت دیکھ لی تھی جو ایک بہادر اور غیرت مند انسان کے چہرے پر نمایاں ہو سکتی تھی۔ نجمی کو ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے لال خان کو دیکھتے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ چلی جائے گی اور جو کام وہ اکیلی نہیں کر سکتی وہ اس کے ساتھ مل کر کرے گی۔ یہی وہ آدمی تھا جس کے لیے اسے ایک روز بازارِ حسن چھوڑ دینا تھا۔ جیپ دھرم تلہ سے نکل کر ڈلہوزی اسکوائر کی طرف پوری رفتار سے دوڑی جا رہی تھی۔ نجمی نے جس وقت دھوبل پر گولی چلائی تھی۔ اس وقت طبلچی ہوش میں تھا اور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس قتل کا عینی گواہ تھا۔ نجمی چاہتی تھی کہ اس

قتل کا وہ پیچھے کوئی عینی شاہد چھوڑ جائے تاکہ اگر کبھی وہ خواہش بھی کرے تو واپس بازارِ حسن میں نہ جا سکے۔ اس قتل سے وہ اپنے دشمنوں کو ایک طرح سے دہشت زدہ بھی کرنا چاہتی تھی۔ تاکہ انھیں معلوم ہو جائے کہ بہت جلد ان کی باری بھی آنے والی ہے۔ نجمی نے دھوبل بدمعاش کو ہلاک کرنے سے پہلے جان بوجھ کر یہ جملہ بولا تھا کہ تم میرے پہلے انتقام ہو۔ نجمی کے انتقام کا دوسرا نشانہ مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر تھا۔ وہ اس سے کس طرح بدلہ لے گی؟ اور اسے کہاں اور کیسے موت کی نیند سلائے گی؟ یہ ابھی نجمی کے ذہن میں واضح نہیں۔

جیپ اب کلکتہ شہر سے باہر ہوڑہ برج کی طرف جا رہی تھی۔ لال خان خود جیپ چلا رہا تھا۔ اس کے چاروں محافظ جیپ میں پیچھے بیٹھے تھے۔ نجمی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ لال خان نے جیپ کے شور میں بلند آواز میں کہا "تم نے پہلے بھی کبھی رائفل چلائی تھی چندا بائی؟" نجمی نے اونچی آواز میں جواب دیا "ایک بار چلائی تھی۔ جب ذلیل مان سنگھ ڈکیٹ مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔"

لال خان نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے مان سنگھ ڈکیٹ کو گالی دے کر باہر تھوک دیا اور بولا "عورتوں کو اغوا کرنے والے گیدڑ ہوتے ہیں۔"

جیپ ہوڑہ برج عبور کر گئی۔ یہ لوگ چھ خون کر کے آ رہے تھے۔ پولیس مجرموں کی تلاش میں نکل چکی ہو گی۔ نجمی نے ایک بار پیچھے کی طرف دیکھا۔ لال خان کی آنکھیں جیپ کے باہر لگے ہوئے شیشے کو کبھی کبھی دیکھ لیتی تھیں۔ ان کے پیچھے کوئی گاڑی نہیں آ رہی تھی۔ پل کے دوسری طرف آ کر نجمی نے لال خان سے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

لال خان نے قہقہہ بلند کیا اور بولا "شیر کی کچھار میں۔"

جیپ کلکتے کے صنعتی علاقے سے گزر رہی تھی۔ اِدھر اُدھر کارخانوں میں بتیاں جل رہی تھیں مگر آدھی رات کے وقت سارا علاقہ سنسان پڑا تھا۔ جیپ اس علاقے سے گزرنے کے بعد دریا کے ساتھ اوپر کے رخ روانہ ہو گئی۔ نجمی کو لال خان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کوئی ڈاکو ہے یا کسی علاقے کا سردار ہے۔ اس کی شکل رنگ روپ اور اردو بولنے کا لہجہ اتر پردیش کا تھا۔ وہ کسی طرح سے بھی بنگالی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ پنجابی ہونے کا شبہ اس پر اس لیے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ

پاکستان بننے کے بعد مشرقی پنجاب سے مسلمان پنجابی ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے۔ صرف مالیر کوٹلہ ایک ایسی ریاست تھی جہاں پنجابی مسلمانوں کے کچھ گھرانے پیچھے رہ گئے تھے۔ لیکن ان کا لہجہ مختلف تھا۔ لال خان لکھنؤ، بریلی اور بدایوں کے لہجے میں اردو بولتا تھا۔ نجمی ان تمام لہجوں سے واقف تھی۔ اس کے کوٹھے پر بھانت بھانت کے بھارتی صوبوں کے لوگ اس کا گانا سننے آتے تھے۔

جیپ دریائے ہگلی کے دائیں کنارے سے ہٹ کر ناریل کے درختوں کے ایک گنجان ذخیرے میں گم ہو گئی۔ یہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جیپ کی روشنی میں نجمی کو درختوں کے سیدھے اور توسی تنے اور جھاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ جیپ ہچکولے کھاتی غیر ہموار کچے راستے پر چلتی جا رہی تھی۔ ایک بات نجمی کے ذہن میں بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب وہ واپس سوناگاچی نہیں جا سکتی۔ اس کے خلاف عینی شاہد طبلچی کے بیان کے مطابق قتل کے جرم میں مقدمہ درج کرا دیا جائے گا اور پولیس اب اسے پھانسی کے تختے تک پہنچانے کے لیے اس کی تلاش میں نکل کھڑی ہو گی۔ نجمی واپس جانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو ایک عرصے سے اس موقع کی کھوج میں تھی۔ اسے ایک ایسا بہادر ساتھی مل گیا تھا جو انتقام کی آگ بجھانے میں اس کی مدد کر سکتا تھا اور جس کو وہ پسند بھی کرنے لگی تھی۔ ناریلوں کا ذخیرہ ختم ہوا تو جیپ ایک بہت بڑی جھیل کے ساتھ اُگے ہوئے سنبل اور نار کے درختوں کے نیچے سے ہوتی ہوئی بانس کی ایک باڑھ کے پاس آ کر رک گئی۔ لال خان نے جیپ سے اترتے ہوئے اپنے محافظوں سے کہا کہ وہ پہرے پر جا کر کھڑے ہو جائیں اور نجمی کو ساتھ لے کر بانس کے باڑے میں داخل ہو گیا۔ آگے ڈھلان آ گئی۔ یہاں آم کے بہت ہی گھنے جھنڈ تھے۔ ان کے بیچ میں ایک چھوٹی سی ندی بہہ رہی تھی۔ ندی کے اس کنارے پر ایک ٹیلے کی اوٹ میں نجمی کو اندھیرے میں ایک کھنڈر کا ہیولا ابھرتا دکھائی دیا۔۔۔ لال خان نے نجمی کو بتایا کہ وہ اور اس کے ساتھی عارضی طور پر اس حویلی کے کھنڈر میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ حویلی کا محرابی دروازہ ایک طرف کو گرا ہوا تھا۔ ڈیوڑھی میں اندھیرا تھا۔

لال خان نے آواز دی "ابے جگو سو تو نہیں گیا؟"

ڈیوڑھی کی ایک گھور اندھیری کوٹھڑی میں سے ایک آدمی لپک کر سامنے آ گیا۔ اس نے سر پہ کپڑا

لپیٹ رکھا تھا۔ "خان! جاگ رہا ہوں۔" جگو نے لال خان کو سلام کیا۔

حویلی کے اندر ایک چھوٹا سا صحن تھا جہاں ایک طرف بانس کے ساتھ لٹکی ہوئی لالٹین جل رہی تھی۔ صحن کے آگے برآمدہ تھا جس کے ساتھ تین چار کوٹھڑیاں تھیں۔ لال خان نجمی کو ایک کوٹھڑی میں لے آیا۔ یہاں ایک دیا روشن تھا۔ دیوار کے ساتھ بانس کی چارپائی پر دری بچھی ہوئی تھی۔ لال خان نے نجمی سے کہا "چندا بائی! یہ تیری کوٹھڑی ہے اب تو یہاں آرام کر۔ کل تجھ سے بات ہو گی۔ اور ہاں اگر تو پولیس کی ٹاؤٹ نکلی تو تیری لاش کے ٹکڑے میں خود چاقو سے کروں گا۔"

لال خان چلا گیا۔ نجمی دروازہ بند کر کے چارپائی پر بیٹھ گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ دشمن کافروں سے خوفناک انتقام لینے کا طریق کار کیا ہو سکتا ہے؟

...   .

نجمی کافی دن چڑھے تک سوتی رہی ۔

جب وہ کوٹھڑی سے باہر نکلی تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور اس کی کوٹھڑی کے باہر ایک آدمی بندوق لیے پہرہ دے رہا تھا ۔ لال خان کو ابھی نجمی عرف چندا بائی پر پورا اعتماد نہیں تھا ۔ اس کے خیال میں چندا پولیس کی ایجنٹ بھی ہو سکتی تھی ۔ نجمی دل میں مسکرا دی ۔۔ ڈیوڑھی کے باہر آم کے درختوں تلے لال خان کے کچھ ساتھی بندوقیں ، رائفلیں قریب رکھے آگ جلائے بیٹھے ، کچھ پکا رہے تھے ۔ لال خان وہاں موجود نہیں تھا ۔

نجمی کو آتے دیکھ کر ایک آدمی اس کے پاس آیا اور بولا " چندا بائی ! تالاب اس طرف ہے "

نجمی خاموشی سے جس طرف تالاب تھا اس جانب چل گئی ۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں تالاب کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر نجمی نے غسل کیا اور بالوں کو جھٹکتی واپس حویلی کے کھنڈر میں آ گئی ۔ لال خان اس کی کوٹھڑی کے باہر گرد آلود برآمدے میں پڑے ہوئے لکڑی کے کھوکھے پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا ۔ رائفل اس کے گھٹنوں پر تھی ۔

وہ نجمی کو دیکھ کر بولا " چندا بائی ! کچھ کھا پی لو ۔"

تھوڑی دیر بعد نجمی کوٹھڑی میں بیٹھی چاول مچھلی کھا رہی تھی ۔ ایک آدمی چائے کی دو پیالیاں اور تام چینی کی کیتلی لے کر اندر رکھ کر چلا گیا اس کے جانے کے بعد لال خان آ گیا ۔ بانس کی چار پائی کے پاس دو کھوکھے پڑے تھے ایک کھوکھے پر چائے کی کیتلی اور پیالیاں رکھی تھیں ۔ لال خان دوسرے کھوکھے پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا " چندا بائی ! اب سچ سچ بتا تو میرے ساتھ کیوں آ گئی ۔۔۔ کیا تجھے پولیس نے بھیجا ہے ؟ "

نجمی نے پیالیوں میں چائے انڈیلی ایک پیالی لال خان کو دی دوسری اپنے ہاتھ میں تھامی اور بولی " لال خان ! سب سے پہلی بات تو میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں اور میرا نام چندا بائی نہیں نجمی ہے ۔۔۔۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں بنگال کی نہیں بلکہ پاکستان کی رہنے والی ہوں اور میرا تعلق لاہور سے ہے ۔"

لال خان پیالی ہاتھ میں لیے تعجب سے نجمی کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ پھر نجمی نے لال خان کو شروع سے لے کر آخر تک اپنی ساری داستان الم بیان کر دی ۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے ۔ اپنے اوپر ظلم کرنے والوں کا ذکر کرتے ہوئے نجمی کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بجائے چنگاریاں پھوٹنے لگیں ۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کر چکی تو لال خان نے چائے کی خالی پیالی کھوکھے پر رکھ دی ۔ وہ چائے کی تین پیالیاں اور چار سگریٹ پھونک چکا تھا ۔

نجمی نے ایک گہرا سانس بھر کر کہا " خان ! یہ تھی میری کہانی ۔۔۔۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ میں تمہارے ساتھ کیوں آئی ہوں ۔۔۔ میں نے نہ تو مبالغے سے کام لیا ہے اور نہ جھوٹ بولا ہے ۔۔۔۔ اپنی دکھ بھری زندگی کا ایک ایک ورق تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیا ہے ۔۔۔۔ اگر تم نے مجھے اپنے پاس نہ رکھنے کا فیصلہ کیا تو میں تمہیں اپنا فیصلہ واپس لینے پر مجبور نہیں کروں گی ۔۔۔ پھر میں خود اپنے دشمنوں سے انتقام لینے نکل کھڑی ہوں گی ۔۔۔ تم سے صرف اتنی درخواست کروں گی کہ مجھے ایک رائفل اور جتنے میرے دشمن ، میرے قاتل ہیں ۔ اتنی گولیاں گن کر مجھے دے دینا ۔۔۔ اس کے بعد چاہے میں پھانسی چڑھ جاؤں لیکن اپنے قاتلوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی ۔"

لال خان نے نجمی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ اس کی چیتے ایسی آنکھیں نجمی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں کہنے لگا " پڑھ کلمہ شریف "

کلمہ شریف پڑھتے ہوئے نجمی کی آنکھوں میں اپنے آپ آنسو چھلک پڑے ۔ لال خان نے نجمی کا ہاتھ چھوڑ دیا ۔ وہی ہاتھ گھٹنے پر پڑی رائفل پر رکھا اور خود کلمہ شریف پڑھا اور بولا ۔ " جس جس کافر نے تم کو اپنے ظلم کا نشانہ بنایا ہے میں جب تک ان کی لاشیں خاک و خون میں تڑپتے نہیں دیکھ لوں گا مجھے چین نہیں پڑے گا ۔۔۔ مجھے اپنے آدمی لے کر آج رات یہاں سے واپس اپنے جنگل والے ٹھکانے پر چلے جانا تھا مگر اب میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا ۔

جب تک تجھ پر ظلم کرنے والوں سے بدلہ نہیں لے لیتا۔"

نجمی نے لال خان کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "خان! ان لوگوں کو میں اپنے ہاتھوں سے ہلاک کرنا چاہتی ہوں۔" لال خان بولا "یہ کام تم ہی کرو گی مگر میں بھی تمھارے ساتھ ہوں گا... اب تم مجھے بتاؤ کہ پہلی گولی تم کس کے سینے میں اتارنا چاہتی ہو؟" نجمی نے کہا "میں پہلی گولی اپنے پہلے دشمن کے سینے میں اتار چکی ہوں اور اس کا نام دھومل بدمعاش تھا!... پھر نجمی نے لال خان کو ان تمام لوگوں کے نام اور پتے بتائے جہاں وہ رہتے تھے۔ ان میں انسپکٹر پولیس منجریکر کا نام سرِفہرست تھا۔ لال خان اپنی مونچھوں کو انگلیوں سے مروڑ رہا تھا۔ رائفل پکڑ کر اٹھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے... تم رات بھر کی جاگی ہو... ابھی آرام کرو... ہم آج رات انسپکٹر پولیس منجریکر کا حال چال پوچھنے اس کے مکان پر جائیں گے۔" لال خان چلا گیا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور تصور میں مرہٹہ پولیس انسپکٹر کی لاش کو خون میں تڑپتے دیکھا... پھر اسے نیند آ گئی۔ وہ کافی دیر تک سوتی رہی۔ جس وقت لال خان نے خود کوٹھری میں آ کر اسے جگایا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ حویلی کے کھنڈر کے صحن میں الاؤ روشن تھے۔ لال خان کے ساتھی کھانا کھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بھی بنگالی نہیں تھا سب کا تعلق اتر پردیش کے علاقے سے تھا اور سبھی بقول لال خان قتل اور ڈاکے کی وارداتیں کر کے بھاگے ہوئے تھے۔ لاکھی نام کا آدمی لال خان کا قریبی ساتھی تھا۔ یہ ہندو تھا مگر لال خان کو اس پر بے حد بھروسہ تھا۔ لال خان کے کہنے کے مطابق اس نے کئی بار اس کی جان بچائی تھی۔ نجمی نے ایک ہی دن میں محسوس کر لیا تھا کہ لاکھی کی نگاہ صاف نہیں ہے۔ نجمی لاکھ پردوں میں چھپی ہوئی نظروں کی حقیقت پہچان لیتی تھی۔

لاکھی پختہ عمر کا آدمی تھا، رائفل ہر وقت کاندھے پر رہتی تھی، ماتھے پر کسی گہرے زخم کا نشان تھا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ لال خان کے ساتھ ایک طرف بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتا اور سگریٹ وغیرہ پیتا رہا۔ نجمی کھانا کھانے کے بعد اپنی کوٹھری میں آ کر لیٹ گئی تھی۔ کوئی گیارہ بجے رات لال خان کوٹھری میں آیا۔ اس کے ہاتھ میں گٹھڑی تھی۔ نجمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ کہنے لگا۔ "یہ ساڑھی ٹھیک نہیں رہے گی..... یہ میں تمھارے لیے پتلون، قمیض لایا ہوں.... تم اسے پہن لو.... ہم بھی یہی پہنتے ہیں۔ ان کپڑوں میں واردات کرتے وقت آسانی رہتی ہے۔" وہ چلا گیا۔

نجمی نے گٹھڑی کھولی اس میں گہرے رنگ کی پتلون اسی رنگ کی پرانی قمیض اور ربڑ کے جوتے تھے۔ نجمی نے ساڑھی اتار کر یہ کپڑے پہن لیے۔ لال خان نے تھوڑی دیر بعد آ کر اسے دیکھا اور بولا۔ "اب تم بالکل ٹھیک لگتی ہو... یہ لو سر پہ ہماری طرح رومال بھی باندھ لو۔" نجمی نے سر پہ سرخ رومال یا صافہ باندھ لیا۔ لال خان نے ایک رائفل نجمی کو دی اور بولا "اس میں میگزین لوڈ ہے.... ایک گھنٹے بعد ہم چل دیں گے ... تمھیں کافر منجریکر کی کوٹھی کا پتہ معلوم ہے نا؟"

"ہاں" نجمی بولی۔ "ایک ایک کافر کے گھر کا پتہ میرے دل پر نقش ہے۔"

لال خان بغیر کوئی جواب دیئے باہر نکل گیا۔ نجمی نے رائفل کا سیفٹی کیچ کھولا پھر بند کر دیا۔ میگزین چیک کیا، چیمبر گولیوں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ سر پہ رومال باندھے، پتلون قمیض اور ربڑ کے سیاہ جوتوں میں چارپائی پر بیٹھ گئی اور اس وقت کا بے چینی سے انتظار کرنے لگی جب وہ وہاں سے نکل کر انتقام کی آگ بجھانے پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کی طرف جا رہی ہو گی۔ باہر صحن میں خاموشی چھائی تھی۔ کوٹھڑی میں مٹی کا دیا اپنی مدہم روشنی بکھیر رہا تھا۔ قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی۔

دروازہ کھول کر لال خان اندر آیا "چلو.... کافر سے بدلہ لینے کا وقت آ گیا ہے۔"

لال خان کے ساتھ اس کے قریبی دوست لاکھی کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نجمی لال خان کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ رات کی تاریکی میں تالاب کے قریب سے گزر کر وہ اوپر اس جگہ آ گئے، جہاں بانس کے باڑے کی ایک جانب ان کی جیپ کھڑی تھی۔ تینوں نے رائفلیں کاندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔ نجمی لال خان کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ جیپ کی کینوس کی چھت ڈال دی گئی تھی جس کی وجہ سے باہر سے ان لوگوں کو آسانی سے نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ لال خان کی پیٹی میں ریوالور بھی لٹک رہا تھا۔ اس کا ساتھی لاکھی جیپ میں پیچھے بیٹھ گیا۔ جیپ کلکتہ شہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی خضر پور کی آبادی میں واقع تھی۔ یہ کوٹھی اس نے رشوت کی کمائی سے بنوائی تھی۔ اس نے اپنے بال بچے پونا بھیج رکھے تھے اور اس کوٹھی میں اکیلا رہ کر عیش و عشرت کے دن گزارتا تھا۔ لال خان کے لیے کلکتہ شہر کوئی اجنبی شہر نہیں تھا۔ بچپن اور نوجوانی میں اس نے اس بڑے شہر میں فاقہ مستی کے بہت دن گزارے تھے۔ لال خان فیض آباد کے

ایک غریب مگر غیور گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ انتقال کر گئے اور وہ رشتے داروں کے ٹکڑوں پر پڑے رہنے کی بجائے کلکتہ آ گیا۔ کلکتے میں وہ ایک کارخانے میں نوکر ہو گیا جہاں اس نے کارخانے کے ہندو بنگالی مالک کو غریبوں اور مزدوروں پر بے پناہ ظلم کرتے دیکھا۔ یہاں سے وہ ایک ہندو تعلقدار کی عالی شان حویلی میں آ گیا۔ یہاں اس کا کام بگھی کی صفائی اور گھوڑوں کی رکھوالی کرنا تھا۔ ایک روز لال خان نے بنگالی تعلقدار کو ایک نوکرانی کو بے قصور بے دردی سے پیٹتے دیکھا تو اس نے اینٹ اٹھا کر مالک کے سر پر دے ماری اس کا سر کھل گیا وہاں شور مچ گیا اور لال خان بھاگ کھڑا ہوا۔ کلکتے میں ہی وہ آوارہ گردی کرتا رہا اور جرائم پیشہ لوگوں کے ایک گروہ میں شامل ہو گیا۔ اسی گروہ میں رہ کر وہ جوان ہوا اور جوانی کی سرحد سے گزرا تو اس کے ہاتھوں ایک آدمی کا خون ہو گیا۔ وہ روپوش ہو کر بہار کے جنگلوں کی طرف نکل گیا۔ یہاں اس نے اپنا ایک گروہ بنا لیا یہ سب مفرور قاتل اور ڈاکو تھے جو ایک ایک کر کے اس کے ساتھ ملتے گئے۔ اب وہ برسات کے بعد بہار کی سیاہ پہاڑیوں اور تاریک دشوار گزار جنگلوں سے نکل کر کلکتے جا کر کبھی ناریلوں کے جھنڈوں میں واقع ویران حویلی کے کھنڈر میں اور کبھی دریائے ہگلی کے ڈیلٹا کی دلدلوں میں اپنا ٹھکانا بناتا۔ شہر میں چار چھ سرمایہ دار ہندو سیٹھوں کے گھروں میں ڈاکا ڈال کر ان کے زیور، جواہرات لوٹتا اور واپس بہار کی طرف چلا جاتا تھا بنگال کی پولیس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ لال خان کا پیچھا کرتی۔ خاص طور پر جبکہ لال خان کی رائفل ہر وقت آگ اگلنے کو تیار رہتی تھی اور وہ کئی خون کر چکا تھا۔ یہ ساری باتیں لال خان نے نجمی کو بتا دی تھیں۔

جیپ دریائے ہگلی کے کنارے جا رہی تھی۔ جب دوسرے کنارے کی طرف خضر پور جیٹی کی روشنیاں نظر آنے لگیں تو لال خان نے جیپ روک دی۔ نیچے اتر کر اس نے اپنے ساتھی لاکھی سے کہا: "ادھر جا کر کوئی کشتی دیکھو.... ہم یہاں سے کشتی پر دریا پار کریں گے۔"

لاکھی اندھیرے میں دریا کے کنارے اس جانب چل دیا جدھر لالٹین کی روشنی ہو رہی تھی لال خان نے نجمی کو بتایا کہ ادھر مچھیروں کی چند جھونپڑیاں ہیں وہاں سے کشتی مل جائے گی۔ اگر ہم دریا

کے ساتھ ساتھ آگے جا کر ہوڑہ برج پار کر کے خضر پور جیٹی کی طرف آئیں تو یہ بڑا لمبا فاصلہ ہو جائے گا..... ویسے بھی اگر کوئی ایسی ویسی بات ہو گئی تو پولیس ہوڑہ پل کی ناکہ بندی کر سکتی ہے۔ اور ہم گھیرے میں آ جائیں گے.... بہتر یہی ہے کہ ہم اس جگہ سے دریا پار کریں۔ خضر پور جیٹی سامنے دوسرے کنارے پر ہے اور خضر پور کی آبادی اس کے پیچھے ہی واقع ہے۔

نجمی خضر پور جیٹی کی روشنیوں کو تکنے لگی جن کا عکس دریا میں پڑ رہا تھا۔ یہاں دریا کا پاٹ کافی چوڑا تھا۔ اس کے خیال میں لال خان نے بالکل ٹھیک سوچا تھا انھیں اسی جگہ سے دریا پار کرنا چاہیئے تھا کیونکہ خضر پور کی آبادی وہاں سے بہت قریب تھی۔ لاکھی تھوڑی دیر میں کشتی کو کھیتا ان کے پاس آ گیا۔

کشتی کو اس نے رسے سے ایک بانس کے ساتھ باندھا اور بولا "خان! تم بیٹھو... میں جیپ جھاڑیوں کے پیچھے کھڑی کر کے آتا ہوں۔"

نجمی اور لال خان کشتی میں بیٹھ گئے۔ لاکھی جیپ کو جھاڑیوں کے پیچھے لے گیا۔ پھر اندھیرے میں نمودار ہوا اور کشتی میں بیٹھتے ہی اس نے چپو سنبھال لیے، کشتی چھوٹی تھی اور دریا کی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ دریا پرسکون حالت میں تھا۔ بہت جلد انھوں نے دریا پار کر لیا۔ وہ خضر پور جیٹی سے کافی پیچھے ہٹ کر کنارے پر اتر گئے۔ کشتی کو لال خان اور لاکھی نے کھینچ کر کنارے کی گھاس میں چھپا دیا۔ اب وہ نجمی کو ساتھ لے کر دریا کے کنارے کے درختوں میں سے ہوتے ہوئے خضر پور روڈ پر نکل آئے۔ یہ سڑک کافی کشادہ ہے۔ ایک گاڑی روشنی ڈالتی بندرگاہ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ یہ لوگ فٹ پاتھ کے درختوں کے پیچھے ہو گئے۔ گاڑی گزر گئی تو انھوں نے دوڑ کر سڑک پار کر لی سڑک کی دوسری جانب ڈھلان میں اتر کر وہ خضر پور آبادی کی طرف چلنے لگے۔ اس آبادی کے مکانوں کی جھلملاتی روشنیاں دور ہی سے نظر آ رہی تھیں۔ خضر پور نام کا ایک گاؤں بھی وہاں آباد تھا۔ جہاں بندرگاہ کے قلی مزدور اور مچھیرے رہتے تھے۔ نئی آبادی اس کے عقب میں کوٹھیوں اور بنگلوں پر مشتمل تھی۔ ان میں زیادہ تر بندرگاہ پر ملازم، سرکاری افسر اور سیٹھ لوگوں کی رہائش گاہیں تھیں۔ کوٹھیوں کے بیچ میں پکی سڑکیں بنی تھیں جن کی دونوں جانب بجلی کے کھمبوں پر ٹیوب لائٹیں روشن تھیں۔ نجمی لال خان اور لاکھی کو لے کر مرہٹہ انسپکٹر پولیس کی کوٹھی کے عقبی حصے کی

طرف آ گئی۔ یہ کوٹھی آبادی کے آخری کنارے پر بنی ہوئی تھی اور کوٹھی کے پیچھے ایک ویران ریتیلا میدان تھا جہاں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ لال خان، لاکھی اور نجمی کوٹھیوں کی عقبی دیوار کے ساتھ لگ کر آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہے تھے۔ لاکھی ان کے پیچھے تھا اور چند قدم چلنے کے بعد پیچھے گھوم کر دیکھ لیتا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کی دیوار کے نیچے پہنچ کر نجمی رک گئی۔ دیوار کی دوسری طرف جو جنگلی بیل لگی تھی اس کی شاخیں باہر کی طرف ہی لٹک رہی تھیں۔ لاکھی اور لال خان نے ارد گرد دیکھا۔ سارا علاقہ سنسان تھا۔ نجمی نے آہستہ سے کہا "یہی کوٹھی منجریکر کی ہے۔"

لال خان نے لاکھی کو اشارہ کیا۔ وہ دیوار کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لال خاں اس کے کاندھے پر پاؤں رکھ کر دیوار کے اوپر چڑھ گیا۔ دوسری طرف دیکھا۔ پھر نیچے اتر آیا۔ لاکھی سے کہا کہ وہ اسی جگہ رہے۔ پہلے اس نے نجمی کو دیوار پر چڑھایا اس کے بعد خود بھی اوپر آ گیا۔ کوٹھی کا عقبی لان زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ سامنے کوٹھی کے برآمدے میں ایک بلب روشن تھا۔ لان میں کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ نجمی اور لال خان لان میں کود گئے۔ دیوار کے ساتھ جھک کر چلتے ہوئے وہ کوٹھی کے سامنے والے برآمدے کے قریب آ کر لکڑی کے بڑے بڑے گملوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ اس برآمدے میں بھی بلب جل رہا تھا۔ وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ نجمی نے دیکھا کہ کھلے گیراج میں منجریکر کی گاڑی موجود نہیں تھی۔ اس نے لال خان کو بتا دیا تھا کہ انسپکٹر منجریکر اس کوٹھی میں اکیلا رہتا ہے۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ نجمی اور لال خان نے رومال سر پر سے اتارا اور اسے دوبارہ اس طرح باندھ لیا کہ چہرے پر ان کی صرف آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ لال خان نے نجمی کو اشارہ کیا اور گملے کے پیچھے سے نکل کر کوٹھی کے برآمدے میں آ گئے۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا تھا۔ اندر سے کوئی آواز بھی نہیں آ رہی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ گئے اور کونے والے کمرے کی طرف بڑھے۔ اس کمرے کے باہر بھی تالا نہیں لگا تھا۔ لال خان نے آہستہ سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ اچانک کسی مرد کی دھیمی آواز سنائی دی۔ لال خان نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نجمی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ دونوں نے اپنے کان دروازے سے لگا دیئے۔ اندر سے کسی عورت کے سسکیاں بھرنے اور رونے کی آواز آئی۔ مرد نے اسے بنگلہ میں گالی دے کر چپ رہنے کو کہا۔ عورت نے بنگلہ میں کہا "بھگوان کے لیے مجھے برباد نہ کرو۔

میری پرسوں شادی ہونے والی ہے۔"

مرد نے غلیظ گالی دے کر کہا "اسی لیے تو میں تمہیں اٹھا کر لایا ہوں۔"

لال خان کا خون کھول اٹھا۔ عورت کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے والوں کو خان نے کبھی معاف نہیں کیا تھا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی اور جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا۔ دوسری طرف نجمی بھی اندھیرے میں ہو گئی۔ اندر ایک دم سے خاموشی چھا گئی۔

پھر اسی مرد نے بنگلہ میں کرخت لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

لال خان نے نجمی کو اشارہ کیا۔

نجمی نے بڑی رحم طلب آواز بنا کر بنگلہ میں کہا "مجھے اندر آنے دو، میں بھوکی ہوں۔"

ایک پل کے لیے پھر وہی خاموشی طاری ہو گی۔ اندر سے چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔ پھر دروازے کا ایک پٹ کھلا۔ اس کے ساتھ ہی لال خان اور نجمی اندر گھس گئے اور رائفلیں تان لیں۔ کمرے میں میز پر موم بتی جل رہی تھی اور ایک عورت پلنگ پر اس طرح پڑی تھی کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں سے پلنگ کے ساتھ باندھ دیئے گئے تھے۔ نجمی نے مرد کو پہچان لیا۔ یہ مرہٹہ انسپکٹر منجریکر کا ایک دوست تھا جو درگاپور سے ہفتے میں ایک بار وہاں آیا کرتا تھا۔ نجمی اس اوباش آدمی کے بھی ستم کا نشانہ بن چکی تھی۔ اپنے سامنے دو رائفلوں کو دیکھ کر اس اوباش کی گھگھی بندھ گئی۔

نجمی نے رائفل کی نالی اس کے سینے سے لگا کر اسے فرش پر بٹھا دیا اور پوچھا "منجریکر کہاں ہے؟"

اس آدمی نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "وہ آج ہی تفتیش کے سلسلے میں آنسول گیا ہے۔ بھگوان کی قسم ہے میں جھوٹ نہیں بول رہا۔"

نجمی نے لال خان سے کہا "خان جی! تم اس بے زبان عورت کو کھول دو۔ مجھے اس آدمی سے بھی انتقام لینا ہے۔"

لال خان بندھی ہوئی عورت کی طرف بڑھا۔ نجمی نے رومال چہرے پر سے نیچے کھسکا دیا اور دانت پیستے ہوئے نفرت سے کہا "میں تمہارا نام نہیں جانتی مگر تم نے مجھے پہچان لیا ہو گا۔

میں وہی چندا ہوں جس کی عزت کو تم نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا تھا۔ اب تمھیں وہ رات یاد آ گئی ہو گی جب میں نے بھی اس معصوم عورت کی طرح تمھیں اپنی عزت اور بھگوان کا واسطہ دیا تھا۔"

نجمی نے رائفل کی نالی کو ذرا سا اوپر اٹھا لیا۔ اوباش مرد گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگنے لگا دوسری عورت پلنگ پر ایک طرف ہو کر سہمی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ لال خان نے کہا "اسے ختم کرو نہیں تو میں گولی چلاتا ہوں۔"

نجمی نے رائفل کا بٹ اپنے سینے سے لگا کر کہا "یہ میرا قاتل ہے۔ میری ہی گولی پر اس کا نام لکھا ہے خان" اور نجمی نے لبلبی دبا دی۔ دھماکے کے ساتھ رائفل کی نالی میں سے گولی آگ اگلتی نکلتی اور اوباش آدمی کی کھوپڑی کو اڑاتی ہوئی سامنے والی دیوار میں گھس گئی۔

لال خان نے پلنگ پر سہمی بیٹھی ہوئی عورت سے کہا "بھاگ جا یہاں سے۔"

عورت کے خوف کے مارے دانت بج رہے تھے۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑی اور باہر نکل گئی۔

لال خان بولا "اس حرامی کو تلاش کرو وہ ضرور یہیں کہیں ہوگا۔"

نجمی اور لال خان عقبی دروازے سے دوسرے کمرے میں آ گئے۔ یہ منیجر یکر کا بیڈ روم تھا۔ کارنس پر اس کی تصویر فریم میں لگی رکھی تھی۔ نجمی نے تصویر کو نشانہ بنا کر ایک اور فائر کر دیا۔

لال خان نے پلٹ کر دیکھا اور غصے میں بولا "اصلی آدمی پر گولی چلاتا۔" انھوں نے کوٹھی کے سارے کمرے چھان مارے۔ باتھ روم بھی دیکھ لیے مگر منیجر یکر وہاں نہیں تھا۔ رائفل کے دھماکوں سے ساتھ والی کوٹھیوں میں جو لوگ جاگ رہے تھے وہ وہیں سہم گئے تھے۔ دیوار کے پیچھے بیٹھے لاکھی نے رائفل کا سیفٹی کیچ چڑھا دیا تھا اور رائفل تانے دونوں جانب گھورتے ہوئے خطرے کے مقابلے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ کوٹھی کے اندر ہونے والے گولیوں کے دھماکوں نے اسے بتا دیا تھا کہ دو خون ہوئے ہیں۔ اتنے میں نجمی اور لال خان نے دیوار سے نیچے چھلانگیں لگا دیں۔

لال خان بولا "لاکھی! ہمارا اصلی بندہ نہیں ملا۔ اس کے ایک بدمعاش ساتھی کا خون کر

دیا ہے۔ اب یہاں سے نکل چلو۔"

نجمی کو یاد آ گیا کہ اس حفظ پور کی بستی میں ہریل بدمعاش اور اس کی بیوی رانی بھی رہتی ہے جہاں بردہ فروش موجمدار نے اسے لا کر فروخت کیا تھا اور پھر ہریل اور اس کی بیوی نے نجمی کو آگے روپا اور کالی بدمعاش کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا جنھوں نے اسے بازار حسن میں پہنچا دیا تھا۔ ہریل بدمعاش کا کوارٹر وہاں سے دور نہیں تھا۔ اس نے لال خان سے کہا کہ وہ ہریل اور اس کی بیوی رانی کو اسی وقت ہلاک کرنا چاہتی ہے۔

لال خان بولا "کہاں ہے ان کا مکان؟"

نجمی نے ایک طرف اشارہ کیا۔ وہ تینوں اس مکان کی طرف اندھیرے میں تیز تیز چلنے لگے۔ ہریل بدمعاش کا اکیلا کوارٹر حفظ پور کی پرانی بستی کے کنارے پر تھا۔ رائفل کی آواز پر کوئی بھی آدمی اپنی کوٹھی سے باہر نہیں نکلا تھا۔ سب نے یہی کہہ کر اپنے آپ کو تسلی دے لی تھی کہ یہ گولی کی نہیں بلکہ پٹاخوں کی آواز تھی۔ افسر لوگوں میں اتنی ہمت کہاں ہوتی ہے کہ وہ برستی گولیوں میں گھر سے باہر نکلیں۔

ہریل کے کوارٹر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ نجمی اور لال خان اس کوارٹر کی دیوار پھاند کر اندر چلے گئے۔ لاکھی یہاں بھی رائفل تانے ایک طرف بیٹھ کر پہرہ دینے لگا۔ کوارٹر کے چھوٹے سے صحن میں اندھیرا تھا۔ گلی بتی کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ صحن میں طوطے کا پنجرہ لٹکا ہوا تھا۔ طوطا ٹیں ٹیں کرنے لگا۔ نجمی کو پہلی بار مشرقی پاکستان سے اغوا کر کے اسی جگہ لایا گیا تھا۔ دروازہ بند تھا۔ نجمی دروازے پر ہاتھ مارنے ہی لگی تھی کہ اندر سے کسی مرد کی آواز آئی! اس نے بنگلہ زبان میں طوطے سے کہا کہ وہ کیوں شور مچا رہا ہے۔ طوطا کم بخت بولے جا رہا تھا۔ لال خان نے نجمی کو پیچھے کی طرف کھینچ لیا۔

نجمی سرگوشی میں بولی "تم پیچھے ہٹ جاؤ میں اندر جاؤں گی یہ اسی حرامی کی آواز تھی۔"

نجمی نے ہریل کی آواز پہچان لی تھی۔ جب طوطا چپ نہ ہوا تو ہریل نے دروازہ کھول دیا وہ باہر نکلا ہی تھا کہ نجمی نے پوری طاقت سے رائفل کا بٹ اس کی ٹھوڑی پر دے مارا۔ وہ ہائے کہہ کر پیچھے کمرے کے اندر گر پڑا۔ نجمی اور لال خان لپک کر کمرے میں آ گئے۔ لالٹین کی دھیمی

روشنی میں چار پائی پر سے ہریل کی موٹی بیوی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور دو انسانوں کو اندر آتے اور اپنے خاوند کو گرتے دیکھ کر چیخ اٹھی۔

لال خان نے آگے بڑھ کر اس کی گردن پر رائفل کی نالی رکھ دی اور بنگلہ میں کہا "بدبخت اگر آواز نکالی تو یہیں ختم کر دوں گا۔"

نجمی نے رومال منہ پر سے ہٹا دیا۔ ہریل اور اس کی بیوی رانی نے اسے صاف پہچان لیا نجمی نے اپنا پاؤں نیچے گرے ہوئے ہریل کے سینے پر رکھ دیا تھا۔ ہریل نے بھی چندا کو پہچان لیا تھا۔

وہ ہاتھ باندھ کر گھگھیایا "چندا! میں تو تیرا داس ہوں یہ تم کیا کر رہی ہو۔"

نجمی نے رائفل کی نالی اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے ساتھ لگا دی اور غصے سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا "ہریل! اب تک مجھ سمیت کتنی لڑکیوں کو بازار میں بٹھا چکا ہے رے؟"

ہریل کا جسم ٹھنڈا پڑ گیا موت اس کے سینے پر کھڑی تھی۔ سمجھ گیا کہ اب بچ نہیں سکتا۔ آدمی بدکردار تھا۔ موت کو سامنے دیکھ کر رونے لگا۔

لال خان غرایا "کسی کی ماں بہن کو چکلے میں بٹھاتے وقت تیرا دل نہیں پگھلا تھا۔ اب کیوں روتا ہے مردار؟"

نجمی کے پاس وقت نہیں تھا اس نے رائفل کی نالی ہریل کے پیٹ کے اوپر رکھی ہوئی تھی وہیں اس نے لبلبی دبا دی۔ دھڑاک کی آواز کے ساتھ ہریل کا پیٹ اوپر کو اچھلا۔ گولی اس کے پیٹ کو پھاڑتی ہوئی نیچے فرش کو توڑ چکی تھی۔ ہریل کی نائیکہ بیوی رانی نے چیخ ماری تو نجمی کی نالی کا رخ اس کی طرف اٹھ گیا۔ فائر کا دوسرا دھماکہ ہوا اور رانی کے سینے سے خون کا فوارا اچھلنے لگا۔ وہ وہیں بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ لال خان نجمی کو لے کر کوارٹر سے باہر نکل آیا۔ گلی میں کوئی شخص اپنے گھر سے باہر نہیں نکلا تھا۔ مگر فائرنگ کی آواز علاقے میں گشت کرتی پولیس کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ اس کا لال خان کو احساس تھا تھوڑی دیر کے وقفے سے ایک ہی علاقے میں رائفل کے چار دھماکے ہوئے تھے۔ رات کے سناٹے میں فائرنگ کی آواز خضر پور چھاؤنی تک گئی تھی۔

لاکھی نے سرگوشی میں کہا "خان! ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیئے۔ چھاؤنی کی طرف سے سکیورٹی گارڈز کی جیپ یہاں نہ پہنچ جائے۔"

نجمی کے سینے میں بھڑکتے ہوئے شعلوں میں سے تین کی آگ بجھ چکی تھی ابھی کئی دوسرے شعلوں کی زبانیں لہرا لہرا کر اسے جلا رہی تھیں۔ اس نے رائفل کاندھے پر ڈالی اور خضر پور روڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر بولی "اس طرف چلو خان جی۔ منجر یکہ میرے ہاتھ سے بچ گیا ہے۔ لیکن میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" لال خان تیز تیز قدموں سے خضر پور روڈ کی طرف چلتے ہوئے بولا۔ "اس کا فکر کرنے کا وقت بھی آ جائے گا۔" ابھی انھوں نے خضر پور روڈ عبور کی ہی تھی کہ بندرگاہ کی طرف سے الفیں پولیس کی گاڑی کا الارم سنائی دیا۔ پولیس کو شاید خضر پور کی اس کوٹھی سے فون کر دیا گیا تھا جہاں نجمی نے منجر یکہ کے اوباش دوست کا خون کیا تھا۔

لاکھی بولا "جلدی کرو خان یہ پولیس کی گاڑی کی آواز ہے۔"

لال خان نے اسے جھڑک کر کہا "مرا کیوں جا رہا ہے۔ لال خان پولیس سے نہیں ڈرتا۔"

نجمی کو لال خان کا یہ دلیرانہ جملہ بڑا اچھا لگا۔ وہ سڑک کی ڈھلان سے بھاگ کر اترے اور دریا کے کنارے والی جھاڑیوں میں آ کر دریا کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کی کشتی دریا کے کنارے جھاڑیوں میں اپنی جگہ موجود تھی۔ لاکھی نے کشتی کو دریا میں کھینچا۔ وہ کشتی میں بیٹھے اور کشتی نے دریا کے پاٹ کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔ دریا کی لہروں پر پہنچ کر نجمی اور لال خان نے خضر پور چھاؤنی کی طرف نگاہیں اٹھائیں۔ ادھر سے پولیس کی گاڑی کے الارم کی دھیمی آواز ابھی تک آ رہی تھی۔

لال خان نے نجمی کے کاندھے پر ہاتھ مار کر کہا "شاباش چندا.... تو نے شیر مردوں ایسا کام کیا ہے آج.... میں تم سے بڑا خوش ہوں۔"

نجمی نے لال خان کو خاص طور پر ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے سوا اور کسی کو یہ نہ بتائے کہ چندا ہندو نہیں مسلمان ہے اور اس کا نام نجمی ہے۔ چنانچہ لال خان اسے اکیلے میں بھی چندا کے نام سے پکارتا تھا۔ کشتی دریا کے دوسرے کنارے پر چھوڑ کر لال خان نجمی اور لاکھی جیپ میں سوار ہوئے اور اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔ اپنی کمین گاہ میں پہنچنے کے بعد لال خان نے نجمی کو اس کی کوٹھری میں بھیج دیا۔ نجمی اپنے سینے پر جو بوجھ ایک عرصے سے لیے لیے پھر رہی تھی وہ بہت ہلکا ہو

گیا تھا۔ مگر انسپکٹر منجریکر کے مکان پر نہ ملنے کا اسے بہت افسوس ہوا تھا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ دوسری رات پھر اس کو ہلاک کرنے کی کوشش کرے گی۔

حویلی کی دوسری کوٹھری میں لال خان اپنی چارپائی پر لیٹا تھا اور اس کا ہندو دوست لاکھی رائفلوں کو کونے میں رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا ”خان! تم ایک بازاری عورت کی خاطر اس قاتل لڑکی میں کیوں شامل ہوئے تھے؟ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔“

لال خان ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا اور لاکھی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور غضبناک آواز میں کہا.... ”لاکھی .... آئندہ چندا کو بازاری عورت کہا تو میں سب سے بڑا دشمن ہوں گا۔“ پھر اسے پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔

لاکھی کے ساتھ لال خان کبھی اس طرح پیش نہیں آیا تھا۔ اتنا وہ ضرور سمجھ گیا کہ لال خان اس عورت کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے لیکن اس رویئے سے لاکھی کو اپنی سخت بے عزتی محسوس ہوئی تھی۔ وہ بڑبڑاتا ہوا کوٹھری سے نکل گیا۔

دوسرے دن لال خان نے اپنے ایک آدمی کو بھیس بدلوا کر شہر کی طرف بھیجا کہ وہ معلوم کرے شہر کے حالات کیسے ہیں اور پولیس کیا کارروائی کر رہی ہے۔ دوپہر کے بعد یہ مخبر واپس آیا اور اس نے خبر دی کہ شہر میں خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے اور ایسا کیوں نہ ہوتا۔ دو راتوں میں سونا گاچی اور خضر پور کے علاقے میں آٹھ خون ہو گئے تھے۔ یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ شہر کی ساری پولیس حرکت میں آگئی تھی۔ جگہ جگہ قاتلوں کی تلاش میں چھاپے مارے جا رہے تھے۔ انسپکٹر منجریکر کو فوراً آنسول سے بلا لیا گیا تھا۔ اسے اپنی ہی کوٹھی میں دوست کے قتل کی خبر ملی تو وہ دھک سے رہ گیا۔ جس عورت کو لال خان نے انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی سے بھگا دیا تھا پولیس نے اسے بھی شامل تفتیش کر لیا۔ اسے ذرا ڈرایا دھمکایا گیا تو اس نے اس عورت کا حلیہ بیان کر دیا جس نے منجریکر کے دوست کو ہلاک کیا تھا اور یہ بھی کہا کہ اس عورت نے اپنا نام چندا بتایا تھا۔ انسپکٹر منجریکر کو اس سے پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ چندا اپنے کوٹھے سے غائب ہے اور اس کے طبلچی نے بھی یہی بیان دیا تھا کہ چندا نے ہی کوٹھے پر دھومل بدمعاش کو گولی ماری تھی۔ طبلچی نے یہ بھی بتایا تھا کہ جو اونچا لمبا آدمی کوٹھے پر رائفل لے کر آیا تھا اس نے ہی ڈاکو مان سنگھ کو قتل کیا تھا۔

اور چندا اسی کے ساتھ فرار ہوئی تھی۔ انسپکٹر منجریکر کو اب اس اونچے لمبے آدمی کی تلاش تھی جو چندا کو ساتھ لیے کلکتہ شہر کے علاقے میں کسی جگہ چھپے ہوئے تھے۔ انسپکٹر منجریکر کو اپنی جان کی بھی فکر ضرور پڑ گئی تھی۔ کیونکہ چندا نے جن تین انسانوں کو قتل کیا تھا وہ وہی لوگ تھے جو چندا کو بازار حسن میں بٹھانے کے ذمے دار تھے۔ یعنی دھومل، ہریال اور اس کی بیوی رانی .... آئی جی اور ڈی آئی جی پولیس نے اسپیشل پولیس کے دستے شہر میں پھیلا دیئے تھے۔ خاص طور پر خضر پور جیٹی کے سارے علاقے کو گھیرے میں لے کر پولیس نے گھر گھر تلاشی لینی شروع کر دی تھی۔

جب لال خان کے آدمی نے واپس آکر اسے بتایا کہ شہر میں پولیس گشت کر رہی ہے اور خضر پور کے علاقے میں پولیس تلاشیاں لے رہی ہے تو لال خان نے نجمی کو ایک طرف لے جا کر کہا ”شہر کے حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ میں آج رات یہاں سے نکل کر واپس اپنے جنگل کی کمین گاہ میں جا رہا ہوں کیا تم میرے ساتھ چلو گی؟“

نجمی نے اس رات انسپکٹر منجریکر کو جہنم واصل کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ وہ لال خان کا منہ تکنے لگی۔

جب اس نے اپنے دل کا حال اسے بتایا تو وہ بولا ”اس کافر کے بچے کی تم فکر نہ کرو۔ وہ اب میرا شکار ہے میں خود اسے قتل کروں گا اور تم میرے ساتھ ہو گی۔ لیکن اس وقت شہر کو پولیس نے گھیر رکھا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ پولیس فوج سے بھی مدد مانگ لے۔ دو دنوں میں آٹھ خون ہو گئے ہیں۔ اگر فوج اس کیس میں کود پڑی تو وہ یہاں تک ضرور پہنچ جائے گی مصلحت اس میں ہے کہ ہم اس وقت یہاں سے چلے جائیں۔ ذرا حالات معمول پر آجائیں تو پھر واپس آکر انسپکٹر منجریکر کا بھی کام تمام کر دیں گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔“

نجمی مجبور ہو گئی۔ لال خان کے آدمیوں نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ جب رات کو اندھیرا پھیلا تو لال خان کے سارے آدمی جن کی تعداد دس گیارہ کے قریب تھی، جیپوں میں سوار ہو گئے۔ ایک جیپ میں انگیٹھی برتن اور بستر وغیرہ رکھ دیئے۔ آگے آگے لاکھی چار آدمیوں کے ساتھ چل پڑا۔ اس کے پیچھے لال خان جیپ چلا رہا تھا۔ نجمی اس کے پہلو والی سیٹ میں بیٹھی تھی۔ اس نے عام بنگالی عورتوں کی طرح گہرے رنگ کی سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔

دریا پار کے ویران علاقے سے تینوں جیپیں نکل کر ایک کچے راستے پر ہو گئیں جو تاڑ کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ یہاں اندھیرا تھا۔ صرف اگلی جیپ کی بتیاں روشن تھیں۔ لال خان ان جنگلی راستوں سے واقف تھا۔ وہ انھی راستوں سے کلکتے آتا جاتا تھا۔ اس نے نجمی کو بتایا کہ صوبہ بہار کی سرحد پر واقع اس کی خفیہ کمین گاہ تک ایک رات اور ایک دن کا سفر ہے۔ اس بیچ وہ دو بار راستے میں آرام بھی کریں گے۔

ساری رات ویران جنگلوں میں سفر جاری رہا۔ اس دوران وہ بردوان، درگاپور اور آسنسول سے نکل آئے تھے اور اب وہ دھنباد کی طرف جا رہے تھے۔ جب سورج نکلا تو لال خان نے جیپ روک دی اور وہیں درختوں اور کالی کالی چٹانوں کے درمیان پڑاؤ ڈال دیا۔ دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد ڈاکوؤں کا یہ قافلہ ایک بار پھر آگے روانہ ہو گیا۔

نجمی لال خان کے ساتھ بیٹھی تھی۔ لال خان کہہ رہا تھا "دھنباد سے صوبہ بہار کی سرحد شروع ہو جاتی ہے اس کے آگے بہار کا بڑا شہر "گیا" ہے جہاں کبھی مہاتما بدھ کو گیان حاصل ہوا تھا۔ مگر ہم "گیا" اور دھنباد کے آدھے راستے میں ہی گوما کے ریلوے سٹیشن سے بائیں جانب دریائے گومتی کی طرف مڑ جائیں گے۔ ہم رات ہونے تک اپنی منزل پر پہنچ چکے ہوں گے۔"

دوپہر کو ایک جگہ ندی کنارے جیپیں روک کر کھانا کھایا گیا اور پھر سفر شروع ہو گیا۔ سورج غروب ہو رہا تھا کہ لال خان نے دور ٹیلیگراف کے کھمبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نجمی کو بتایا کہ یہ کھمبے "گیا" اور "پٹنہ" تک جاتے ہیں۔ وہ جس ویران راستے پر جا رہے تھے وہ اونچی نیچی ٹیکریوں پر سے گزرتا تھا۔ آگے ریلوے لائن آ گئی۔ کچھ فاصلے پر غروب ہوتے سورج کی ملگجی چمک میں ریلوے کے سگنل دکھائی دے رہے تھے۔ لال خان نے بتایا کہ یہ گوماہ کے ریلوے اسٹیشن کے آؤٹر سگنل ہیں۔ یہاں سے ریلوے لائن پار کر کے وہ جنوب کی طرف مڑ گئے۔

شام کا اندھیرا چھانے لگا اب پستہ قد کے اور پھیلی ہوئی شاخوں والے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ یہ سلسلہ ایک اونچے درختوں کے جنگل میں جا کر گم ہو گیا۔

لال خان نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم اپنے علاقے میں آ گئے ہیں۔"

ڈیڑھ دو گھنٹے تک جیپیں اس جنگل کے ناہموار راستوں پر آہستہ آہستہ چلتی رہیں۔ پھر ایک

چھوٹی سی ندی کا پل آ گیا۔ یہ پل بانس کا بنا ہوا تھا۔ جیپیں اس پل پر سے گزر کر ندی کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں۔ اندھیرے نے چاروں طرف سے انھیں گھیر لیا تھا۔ صرف اگلی جیپ کی روشنی میں درختوں کے تنے نظر آ رہے تھے۔ کافی اندر جانے کے بعد جیپیں ایک ٹیلے کی اوٹ میں رک گئیں۔ یہ ٹیلہ سیاہ ڈھلانی چٹانوں کا تھا اس کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی نیچے ڈھلان کو جاتی تھی۔ اس پگڈنڈی سے گزرنے کے بعد بانس کی ایک اونچی باڑھ آ گئی۔ لال خان یہاں رک گیا۔ اس نے منہ سے کوئل کی آواز نکالی۔ باڑھ کے پیچھے جو گھنے درخت تھے ان میں سے بھی جواب میں کسی نے کوئل کی آواز نکالی۔

لال خان نے لاکھی سے کہا "لاکھی! تم جیپوں پر جھاڑیاں وغیرہ ڈال کر آ جاؤ۔"

باڑھ کی دوسری جانب چار آدمی رائفلیں تھامے اندھیرے میں سے نکل آئے۔ انھوں نے لال خان کو سلام کیا اور اسے واپس آنے پر مبارکباد دی۔ یہ لال خان کی خفیہ کمین گاہ تھی جو بانس کی اونچی باڑھ کے پیچھے آم کے گنجان درختوں کے بیچ مٹی کے ایک ٹیلے کو کھود کر سرنگ کی شکل میں بنائی گئی تھی۔ اس ٹیلے کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی ندی گزرتی تھی۔ اس ندی کے کنارے اینٹیں جوڑ کر چولھے بنائے گئے تھے جن پر ان لوگوں کا کھانا پکتا تھا۔ کمین گاہ والی غار کے سامنے بانس کی دس بارہ چارپائیاں بچھی تھیں اور ایک لالٹین درخت میں کیل ٹھونک کر لٹکائی ہوئی تھی۔ لال خان نے نجمی سے کہا کہ وہ غار سے پیچھے ندی پر جا کر منہ ہاتھ دھو لے۔ پھر کھانا کھائیں گے۔ پیچھے وہ ڈاکو پہرے پر تھے۔ انھوں نے اپنے لیے کھانا تیار کر رکھا تھا۔ لال خان کے آنے کی ان کو خبر نہیں تھی۔ جلدی سے ایک بکرا ذبح کر کے اسے آگ پر چڑھا دیا گیا۔

نجمی ٹیلے کے عقب میں بہتی ندی پر آ گئی۔ یہاں گہرا سناٹا تھا۔ ندی پار جنگل میں جھینگر بول رہے تھے۔ نجمی نے ندی کنارے بیٹھ کر منہ ہاتھ دھویا۔ بالوں پر جمی ہوئی گرد صاف کی اور واپس آئی تو غار کے باہر چھوٹا سا الاؤ روشن تھا۔ ڈاکو اس الاؤ کے گرد بیٹھے تھے۔ الاؤ کے اوپر بکرا بھونا جا رہا تھا۔ لال خان نے نجمی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور باقی ساتھیوں سے اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری نئی ساتھی چندا ہے۔ یہ مسلمان ہے مگر بنگال میں جیسا دستور ہے کہ ایک نام ہندوانہ ٹائپ کا رکھ دیا کرتے ہیں۔ چندا کا اصلی نام نجمی ہے اور یہ پنجاب سے بنگال آئی تھی۔ اس نے

میری جان بچانے کے لیے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا۔ اس لیے اب یہ ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔

سوائے لال خان کے قریبی ساتھی لاکھی کے سب نے خوشی کا اظہار کیا۔ لاکھی کے دل میں نجمی کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ نجمی ایک مسلمان عورت تھی اور دوسری سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس مسلمان عورت نے ایک ہندو عورت رانی کا بے دردی سے خون کیا تھا۔ بیا ہے وہ عورت بدکردار ہی تھی مگر لاکھی کے خیال میں وہ معزز عورت تھی اور اسے ایک مسلمان عورت نے قتل کیا تھا۔ لاکھی نے دل میں طے کر لیا تھا کہ وہ نجمی عرف چندا سے بھیانک انتقام لے گا۔ ایک اسکیم اس نے اپنے دماغ میں سوچ لی تھی۔ اسکیم یہ تھی کہ وہ لال خان کو ہلاک کر کے خود ڈاکوؤں کا سرغنہ بن جائے گا اور نجمی عرف چندا کو اپنی رکھیل بنا کر رکھے گا اور اسے اذیتیں دے دے کر اس سے ہندو عورت کے قتل کا بدلہ لے گا۔ لال خان کے بعد سارے آدمی لاکھی کا بڑا احترام کرتے تھے اور اس کے آگے نہیں بولتے تھے۔ اپنی کمین گاہ میں واپس آئے دو دن ہی ہوئے تھے کہ مکار لاکھی نے لال خان کو قتل کرنے کے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ لال خان کو اس طرح قتل کرنا چاہتا تھا کہ کسی کو اس پر شک نہ ہو اور سب یہی سمجھیں کہ رات کو دشمن کا کوئی آدمی آکر خان کو ہلاک کر گیا ہے۔ اس رات آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ لال خان غار کے آگے چارپائی پر رائفل نیچے رکھے گہری نیند سو رہا تھا۔

غار کے اندر نجمی نے بھی لالٹین بجھا دی تھی۔ مگر اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اسے ندیم کی یاد ستا رہی تھی کہ خدا جانے جیل میں اس پر بھارتی پولیس کیسے کیسے ستم توڑ رہی ہوگی۔

اچانک اسے باہر سے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی پنجوں پر چل رہا ہو۔ نجمی نے رائفل اٹھائی اور دبے پاؤں اندھیرے میں غار کے منہ پر ایک طرف جھک کر باہر دیکھنے لگی۔ اندھیرے میں اسے ایک سایہ لال خان کی چارپائی کی طرف بڑھتا نظر آیا۔

٭٭٭

نجمی نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں غور سے دیکھا۔ انسانی سایہ لال خان کی چارپائی کی طرف دبے پاؤں بڑھ رہا تھا۔ نجمی نے پہلے تو یہ خیال کیا کہ ہو سکتا ہے کہ یہ لال خان کا کوئی ساتھی ہو اور وہاں زمین پر سونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر رہا ہو۔ لیکن جب انسانی سائے نے اپنا ایک ہاتھ بلند کیا تو نجمی کو اس کے ہاتھ میں خنجر دکھائی دیا۔ نجمی نے تیزی سے رائفل اٹھائی اور انسانی سائے پر فائر کر دیا۔ لیکن نجمی نے دیر کر دی تھی۔ انسانی سایہ لال خان کا ہندو ساتھی لاکھی تھا جس کا خنجر لال خان کے سینے میں اتر چکا تھا۔ لیکن نجمی کی گولی نے لاکھی کا بھی کام تمام کر دیا تھا۔ سارے ڈاکو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے اور اپنی اپنی رائفلوں کی طرف لپکے۔ نجمی دوڑ کر لال خان کی چارپائی کے پاس آگئی۔ لال خان کے سینے میں لاکھی کا خنجر آدھے سے زیادہ اتر چکا تھا اور لال خان خون میں لت پت آخری سانس لے رہا تھا۔ پاس ہی زمین پر لاکھی کی لاش پڑی تھی۔ نجمی کی گولی نے اس کی گردن آدھی سے زیادہ اڑا دی تھی۔ ڈاکو لالٹین لے کر آ گئے۔ ہر کوئی اپنے سردار کو خون میں لت پت دیکھ کر دہشت زدہ اور دردناک تھا۔ نجمی نے جب سارا واقعہ بیان کیا تو ڈاکوؤں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لال خان کے سینے سے نجمی نے خنجر نکالنے کی کوشش کی تو خان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لال خان کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ خنجر دل کو ایک طرف سے چیر گیا تھا۔

لال خان نے انتہائی کمزور آواز میں کہا: "لاکھی نے غداری کی۔ چندا نے اس سے میرا بدلہ لے لیا ہے۔ اب سنو۔ میرے پاس بہت تھوڑا وقت ہے۔ میرے بعد چندا کو اپنا سردار سمجھنا۔ اس کے ہر حکم پر عمل کرنا۔" نجمی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس کے ہاتھ پر لال خان کے ہاتھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور پھر وہ ایک طرف کو لڑھک گیا۔ لال خان خدا کو پیارا ہو چکا تھا۔ نجمی نے روتے

ہوئے لال خان کا مردہ ہاتھ اپنے سینے سے لگا لیا۔

لال خان کے مسلمان ساتھی بادل نے نجمی کے سر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہمیں صبر سے کام لینا ہوگا چندا بی بی۔ آج سے تم ہماری سردار ہو۔ ہم لال خان کے حکم کی ہمیشہ پابندی کریں گے۔" لاکھی کی لاش کو اٹھا کر وہاں سے دور ایک گڑھے میں گدھوں اور جنگلی جانوروں کی خوراک بننے کے لیے پھینک دیا گیا اور لال خان کو ندی کے پانی سے غسل دے کر کھدر کی چادر کا کفن پہنا کر لاش چارپائی پر رکھ دی گئی۔ بادل اور دوسرے مسلمان ساتھی چارپائی کے گرد بیٹھ کر ساری رات کلمہ شریف کا ورد کرتے رہے۔ دوسرے دن خان کی لاش کو پورے احترام کے ساتھ وہیں جنگل میں درختوں کے نیچے قبر کھود کر دفنا دیا گیا۔

یہ سب کچھ اچانک ہو گیا تھا۔ نجمی کو سخت ملال تھا کہ وہ بروقت فائر کر کے لال خانؒ کی جان نہ بچا سکی تھی۔ لیکن شاید قدرت کو یہی منظور تھا۔ موت کا ایک وقت معین ہوتا ہے۔ شاید وہ چاہتی بھی تو لال خان کو لاکھی کے خنجر کی ضرب سے نہیں بچا سکتی تھی۔ بہر حال اسے اتنی تسلّی ضرور تھی کہ اس نے خان کے قاتل کو بھی زندہ نہیں چھوڑا تھا۔ حالات نے نجمی کو ان ڈاکوؤں کا سردار بنا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ کلکتے واپس اپنے کوٹھے پر نہیں جا سکتی تھی۔ وہ قتل کے جرم میں پولیس کو مطلوب تھی وہ زیادہ لمبے عرصے تک روپوش نہیں رہ سکتی تھی۔ اسے پولیس کہیں نہ کہیں سے ضرور گرفتار کر لیتی اور پھر پھانسی کا پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا جاتا۔ ڈاکوؤں کی سردار بن جانے کے کئی فائدے تھے۔ پہلا فائدہ تو یہ تھا کہ وہ محافظوں کے درمیان آ گئی تھی۔ دوسرا فائدہ یہ تھا کہ وہ اس پوزیشن میں تھی کہ انسپکٹر منجر یکر اور اپنے دوسرے دشمنوں سے انتقام لے سکے۔ اس کی عزت کے قاتلوں کی فہرست میں روپا بدمعاش اس کے ساتھی ہری، انسپکٹر منجر یکر اور مونچھوں والے موجمدار کے نام باقی رہ گئے تھے سب سے پہلے وہ انسپکٹر منجر یکر سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم اور بربریّت کا بدلہ لینا چاہتی تھی۔ نجمی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ لال خان کے دوسرے قریبی مسلمان ساتھی بادل کو اپنے اعتماد میں لے لیا۔ نجمی بہر حال عورت تھی اور گروہ میں سے کسی آدمی کو اپنے اعتماد میں لینا ضروری تھا۔ بادل پختہ عمر کا ایک دلیر مسلمان تھا اور ضلع بارہ بنکی میں چار ہندو جاگیرداروں کو قتل کر کے بھاگا ہوا تھا۔ لال خان کی طرح اس کی آنکھوں میں بھی حیا اور غیرت تھی اور نجمی نے بہت جلد اندازہ لگا لیا تھا کہ بادل

ایک بلند کردار انسان ہے۔ یہ سارے کے سارے ڈاکو لال خان کے فدائی تھے اور اس کی وصیّت کے مطابق اب نجمی کے بھی فدائی بن گئے تھے۔ ان سبھوں نے باری باری نجمی کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر حلف اٹھایا تھا کہ وہ چندا بی بی پر اپنی جان بھی قربان کر دیں گے۔ سب نجمی کو چندا بی بی کہہ کر پکارنے لگے نجمی کو یہ نام پسند آیا۔ ایک ہفتہ وہیں گزر گیا نجمی نے اپنا حلیہ مردوں جیسا بنا دیا تھا۔ اس نے اپنے بال کاٹ دیئے تھے اور سر پہ لال خان کی طرح سرخ رنگ کا صافہ باندھنے لگی تھی۔ ساڑھی اس نے ترک کر دی تھی اور ہر وقت نیلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنے رہتی تھی۔ بادل کا بھی یہی لباس تھا۔ نجمی صبح اور شام کے وقت بادل کے ساتھ جنگل میں نشانہ بازی بھی کرتی تھی۔ ایک ہفتہ گزر گیا تو نجمی نے اپنے ایک آدمی کو کلکتہ بھیجا کہ وہ جا کر پتہ کرے کہ حالات کیسے ہیں اور پولیس لال خان اور چندا بائی کی تلاش کے سلسلے میں کیا لائحہ عمل اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ ڈاکو فقیر کا بھیس بدل کر گوماہ کے ریلوے اسٹیشن سے کلکتے کی جانب روانہ ہو گیا۔

چار دنوں کے بعد یہ مخبر واپس آیا۔ اس نے بتایا کہ ساری بنگالی پولیس کلکتے کے کونے کونے میں بکھر گئی ہے اور لال خان اور چندا بائی کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ لال خان کی موت کی خبر کو پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ مخبر نے یہ بھی خبر دی کہ مشرقی پاکستان میں بڑی گڑبڑ ہے۔ بھارت اپنے کمانڈو مکتی باہنی والوں کے ساتھ مشرقی پاکستان میں تخریب کاریوں کے لیے دھڑا دھڑ بھیج رہا ہے اور انڈین فوج سے بھرے ہوئے ٹرک مشرقی پاکستان کی سرحد کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ نجمی نے بادل کو بھی اپنی زندگی کی ساری کہانی شروع سے آخر تک بنا دی تھی اور بادل کو معلوم تھا کہ نجمی نے کن کن بدمعاشوں سے اپنی زندگی کی بربادی کا بدلہ لینا ہے۔ نجمی نے بادل سے مشورہ کیا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے وہ کہنے لگا "ہم اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر انسپکٹر منجر یکر کو قتل کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔" چندا نے کہا "میں چاہتی ہوں کہ یہ کام میں اکیلی کلکتے جا کر کروں۔"

بادل نے فکر مندی کے ساتھ پوچھا "چندا بی بی! تم اکیلی گئیں تو پکڑے جانے کا خطرہ ہے میں تمہارے ساتھ جاؤں گا۔"

کافی سوچ بچار کے بعد انھوں نے فیصلہ کیا کہ انھیں بھیس بدل کر اس مشن پر نکلنا ہوگا۔ کمین گاہ میں بھیس بدلنے کا تھوڑا بہت سامان موجود تھا۔ کیونکہ لال خان مہینے میں دو بار اپنے مخبر کو بھیس بدلوا

کہ شہروں میں حالات کا جائزہ لینے بھیجا کرتا تھا۔ ایک روز نجمی اور بادل نے بیراگن اور بیراگی کا بھیس بدلا اور خفیہ کمین گاہ سے گوماہ ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئے۔ نجمی نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ وہ انسپکٹر منجریکر کو قتل کرنے جا رہے ہیں اور وہ اس مشن میں کامیاب ہو کر ہی لوٹیں گے۔ نجمی نے سواری رنگ نیل میں گھول کر اپنے چہرے، گردن، بازوؤں اور ٹانگوں پر مل رکھا تھا جس سے اس کا رنگ گہرا نسواری ہو گیا تھا۔ یہ رنگ ایسا تھا کہ پانی سے ہاتھ منہ دھونے پر بھی نہیں اتر سکتا تھا۔ گہرے رنگ کی بیراگنوں والی ساڑھی پہن لی تھی۔ سر کے بالوں کو اس نے استرے سے مونڈ ڈالا تھا اور ماتھے پر نشان بنا لیا تھا۔ گلے میں منکوں کی مالائیں ڈال لی تھیں۔ بغل میں جھولا ڈال لیا تھا۔ بادل نے بھی ایسا ہی حلیہ بنا لیا تھا۔ دونوں بنگال کے بیراگی لگ رہے تھے۔ بنگال میں اس قسم کے بیراگی اور بیراگنیں عام طور پر دیکھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ درگاریوں کے بھجن گا کر بھیک مانگتے ہیں۔ بادل نے اپنے ہاتھ میں اکتارا بھی پکڑ رکھا تھا۔ ان تمام باتوں کے علاوہ انھوں نے اپنے لباس کے اندر دو چھوٹے ریوالور بھی چھپا رکھے تھے جو بارہ بارہ گولیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک عام سا چاقو بادل نے اپنے جھولے میں بھی رکھ لیا تھا۔ کچھ روپے بھی بادل کی صدری کی جیب میں موجود تھے۔ اس حلیے میں نجمی بالکل پہچانی نہیں جاتی تھی۔ گوماہ کے ریلوے اسٹیشن تک وہ کچھ پیدل چل کر باقی راستہ ایک کسان کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر گئے۔

ریلوے اسٹیشن پر وہ دوپہر کے وقت پہنچے اور پلیٹ فارم کے کونے میں اپنے جھولے رکھ کر بیٹھ گئے۔ بادل بیڑی پیتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہاں کوئی پولیس والا نہیں تھا۔ آدھ گھنٹے بعد گاڑی آ گئی اور وہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں سوار ہو گئے۔ بنگال میں بیراگی بیراگنوں سے ریل کا ٹکٹ نہیں پوچھا جاتا۔ یہ لوگ جہاں چاہیں بے ٹکٹ سفر کر سکتے ہیں۔ گاڑی گوماہ سے چل کر تین گھنٹے کے سفر کے بعد دھنباد پہنچی۔ یہاں سے چلی تو شام کے وقت آنسول کے اسٹیشن پر پہنچ کر رک گئی۔ یہ بنگال کا اسٹیشن تھا۔ نجمی اور بادل محتاط ہو گئے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر اترنے کی بجائے ڈبے میں ہی بیٹھے رہے۔ یہ پسینجر ٹرین تھی اور گیا سے کلکتے جا رہی تھی۔ ڈبے میں بیٹھے بیٹھے نجمی اور بادل نے مٹی کے آبخوروں میں چائے منگوا کر پی۔ خدا خدا کر کے آنسول سے گاڑی چلی۔ اب آگے دوسرا بڑا اسٹیشن درگاپور تھا۔ ویسے یہ ٹرین ہر اسٹیشن پر تھوڑی دیر کے لیے

رکتی تھی۔ رات ہو گئی تھی کہ ٹرین درگاپور پہنچ گئی۔ یہاں سے چلی تو ڈیڑھ گھنٹے کے بعد بردوان آ گیا۔ بردوان سے آگے بڑا اسٹیشن کلکتہ ہی تھا۔ یہ کافی لمبا سفر تھا۔ بردوان کے پلیٹ فارم پر نجمی نے ریلوے پولیس کے دو تین آدمیوں کو گھومتے دیکھا۔ مگر یہ ان کی نارمل گشت تھی۔ رات کے دس بج رہے تھے کہ پسینجر ٹرین کلکتہ کے دوسرے بڑے اسٹیشن ہوڑہ کے پلیٹ فارم میں داخل ہو گئی۔ ڈبہ مسافروں سے بھرا ہوا تھا۔

بادل نے نجمی کے کان کے قریب ہو کر آہستہ سے کہا "ہم یہاں سے کالی ماتا کے مندر کی طرف جائیں گے۔" یہ بات انھوں نے پہلے ہی طے کر رکھی تھی کہ وہ کالی ماتا یعنی درگا دیوی کے اس مندر میں جا کر رات بسر کریں گے جو خضر پور آبادی کے پچھواڑے کافی آگے جا کر دریا کے کنارے بنا ہوا تھا۔ یہاں سے انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی زیادہ دور نہیں پڑتی تھی۔ نجمی اور بادل کے بیراگیوں ایسے حلیے کی وجہ سے کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی۔ دونوں اسٹیشن سے باہر آ کر ایک طرف چلنے لگے۔ چوک میں وہ ایک طرف رک گئے۔ ایک خالی رکشا پاس ہی کھڑا تھا۔ بادل نے آگے بڑھ کر بنگالی رکشا ڈرائیور کو ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بنگالی زبان میں کہا "بھیا ہم درگا ماتا کے پجاری بیراگی ہیں۔ میری پتنی میرے ساتھ ہے ہم خضر پور والے درگا ماتا مندر میں دیوی کو ماتھا ٹیکنے آئے ہیں۔ ہمیں وہاں تک پہنچا دو گے۔"

رکشا ڈرائیور نے بیڑی کا کش لگا کر کہا "گوروجی میں وہاں جانے کے دس روپے لیتا ہوں۔ آپ سے پانچ روپے لوں گا۔ کیا پانچ روپے تمھارے پاس ہیں؟"

بادل کے پاس پانچ سو روپے موجود تھے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھائی ہم غریب بیراگی ہیں پیسہ پیسہ بھیک میں لے کر جمع کیا ہے پانچ روپے بھگوان نے چاہا تو نکل آئیں گے۔ تم ہمیں درگا دیوی کے مندر پہنچا دو۔"

رکشا ڈرائیور تیار ہو گیا۔ نجمی اور بادل رکشا میں بیٹھ گئے اور رکشا خضر پور کی جانب چل پڑا۔ یہ بھی کافی لمبا راستہ تھا۔ آدھ گھنٹے میں وہ خضر پور کے پچھواڑے دریا کے کنارے والے درگا دیوی کے مندر کے قریب آ کر اتر گئے۔ رکشا والے کو پانچ روپے دیے اور مندر کی طرف رخ کیا۔ یہ مندر زیادہ بڑا نہیں تھا۔ ایک بہت بڑے چبوترے پر یہ مندر بنا ہوا تھا۔ سامنے ریلی

اور سنبل کے گھنے درخت تھے۔ مندر میں روشنی ہو رہی تھی۔ سامگریاں سلگ رہی تھیں۔ گھنٹیوں اور کھڑتالوں کی آواز کے ساتھ بھجن گانے کی ہلکی ہلکی آوازیں مندر سے نکل رہی تھیں۔ ایک جانب درختوں کے نیچے کچھ سادھو الاؤ جلائے رنگ بھبھوت ملے بیٹھے تھے۔ عقیدت مند ہندو بنگالی مندر سے نکلتے تو ان سادھوؤں کو بھی کچھ پیسے یا مٹھائی پیش کرتے۔ نجمی اور بادل مندر کے باہر ایک جانب ناریل کے درخت کے نیچے بیٹھ کر ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ انھیں بھوک نہیں تھی۔ تھوڑا بہت کھانا انھوں نے بردوان اسٹیشن پر ہی کھا لیا تھا۔ بادل اور نجمی کو معلوم تھا کہ درگا دیوی کے ہر مندر کے ساتھ ایسی چھوٹی چھوٹی چھ سات اندھیری کوٹھریاں ضرور ہوتی ہیں۔ جہاں باہر سے آئے ہوئے سادھو اور بیراگی لوگ ٹھہرتے ہیں۔ بادل نے نجمی کو وہیں بیٹھنے کی ہدایت کی اور خود اٹھ کر مندر کے پچھواڑے کی طرف آ گیا۔ یہاں اسے سامنے کچھ پرانی کوٹھریاں نظر آئیں۔ کونے میں دیوار کے ساتھ بجلی کا ایک بلب روشن تھا۔ ایک بنگالی چوکیدار کوٹھری کے آگے زمین پر بیٹھا ناریل پی رہا تھا۔ بادل نے قریب جا کر اسے پرنام کیا اور عاجزی سے بنگلہ زبان میں کہا۔

"بھیا! ہم بیراگی ہیں۔ ترپورہ سے درگاہ میا کے درشنوں کو آئے ہیں۔ میری پتنی بھی میرے ساتھ ہے کیا یہاں دو ایک راتیں بسر کرنے کو جگہ مل جائے گی۔"

بنگالی چوکیدار پر کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح بیٹھا ناریل گڑگڑاتا اور بادل کو دیکھتا رہا۔ بادل نے اپنے جھولے میں سے دس روپے کا نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھایا اور کہا "بھیا جی! ہم سادھو لوگ ہیں۔ لوگوں سے دکھشنا لے لے کر بیس پچاس روپے جمع کیے ہیں یہ تم دس روپے رکھ لو۔ بھگوان نے چاہا تو تمھاری اور بھی خدمت کر دیں گے۔"

چوکیدار دس روپے کا نوٹ لے کر بڑا خوش ہوا۔ اس نے فوراً سامنے والی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا اور بنگلہ زبان میں بولا۔

"تم اس کوٹھری میں جتنے دن چاہے رہو۔ مگر میں تم سے ہر روز پانچ روپے وصول کروں گا۔ اگر تم نے یہ بات پجاری کو بتا دی تو یہاں سے بوریا بستر گول کر دوں گا۔"

بادل نے ہاتھ جوڑ دیئے اور بولا "بھگوان تیرا بھلا کرے بھائی۔ میں پجاری کو کیوں بتانے لگا۔ بھلا تو نے ہمیں سر چھپانے کو جگہ دی۔ ہم تمھارے دھنباد ی ہیں۔"

چوکیدار نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اس کے پیچھے تالاب ہے اور غسل خانہ بھی ہے عورت یاتریوں کے لیے۔ اندر ایک چارپائی پڑی ہے۔ اپنی پتنی کو لے کر آ جاؤ۔"

بادل اسی وقت نجمی کو لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ بنگالی چوکیدار جوانی کی سرحد سے گزر چکا تھا مگر ایک جوان بیراگن کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں عجیب سی حیوانی چمک پیدا ہوئی۔ وہ ناریل گڑگڑاتا مندر کی طرف چلا گیا۔ رات نجمی اور بادل نے اس طرح گزاری کہ نجمی چارپائی اور بادل زمین پر چادر ڈال کر سو گیا۔

انسپکٹر منجر یکھنہ کی کوٹھی پر حملہ کرنے کا ان کا اگلی رات کا پروگرام تھا۔ دوسرے دن صبح صبح بادل اٹھ کر مندر میں آ گیا۔ یونہی درگا دیوی کے استھان پر پھول ارپن کیے اور پیچھے تالاب پر جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ اتنی دیر میں نجمی بھی بیدار ہو کر وہاں آ گئی۔ وہ دانت صاف کرنے لگی۔

بادل اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا اور بولا "تم زیادہ دیر کوٹھری میں ہی رہنا۔ میں تمھارے لیے چائے پانی وہیں لے آؤں گا۔"

نجمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ بادل کوٹھری کی طرف چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد نجمی بھی کوٹھری میں آ گئی۔ بادل کھانے کو کچھ لینے مندر کی طرف چلا گیا۔ وہ مندر کے باہر ایک طرف اکتارہ لے کر بیٹھ گیا وہ یونہی بنگلہ بھجن آہستہ آہستہ اکتارہ بجاتے ہوئے گانے لگا جو لوگ پوجا کرنے آ رہے تھے اپنے ساتھ سادھوؤں کے لیے پوری حلوہ بھی لے کر آتے تھے۔ بادل کے پاس بھی انھوں نے پوریوں اور حلوے کے دونے رکھ دیئے۔ بادل یہ دونے لے کر کوٹھری میں آ گیا۔ ان دونوں نے خوب مزے سے حلوہ پوری کھایا۔ نجمی چارپائی پر لیٹ گئی۔ بادل کوٹھری کی باہر سے کنڈی لگا کر مندر کے چبوترے سے کچھ دور ایک درخت تلے بیٹھ کر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔ حقیقت میں وہ گوشہ چشم سے ماحول کا برابر جائزہ لے رہا تھا کہ کہیں سے کوئی پولیس والا تو ادھر نہیں آ نکلتا۔ پولیس کا باوردی سپاہی تو وہاں کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن سی آئی ڈی والا وہاں موجود ہو سکتا تھا۔ بادل ہر نئی شکل کو بڑے غور سے دیکھتا ابھی تک اسے کسی آدمی پر بھی سی آئی ڈی والے کا شبہ نہیں پڑا تھا۔

بنگالی چوکیدار اس کے پاس آکر بیٹھ گیا اور بولا "گورو جی پانچ روپے شام کو لے لوں گا۔ میرے لیے پیسے جمع کر کے رکھ لینا۔"

بادل نے ہاتھ جوڑ کر کہا "بھیا جی! چنتا نہ کرو۔ تمہارا بھاڑا تمھیں شام کو مل جائے گا۔"

چوکیدار اٹھ کر چل دیا۔ بادل کو اس چوکیدار سے کسی قسم کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ بے خیالی میں اس کی نظریں بنگالی چوکیدار کا تعاقب کر رہی تھیں اس نے دیکھا کہ چوکیدار مندر کے چبوترے کے کونے میں جا کر کھڑا ہو گیا ہے اور ایک دبلا پتلا دھوتی کرتے والا آدمی جس نے کاندھے کے ساتھ چھتری لٹکا رکھی ہے اس سے باتیں کرنے لگا ہے۔ بادل آخر ڈاکو تھا اس کا ماتھا ٹھنکا جب چوکیدار نے اس دھوتی پوش سے باتیں کرتے ہوئے بادل کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو بادل چوکنا ہو گیا۔ دال میں کچھ کالا تھا۔ دھوتی پوش سی آئی ڈی کا آدمی ہو سکتا تھا۔ بادل بیراگی کی شکل میں وہاں نیا نیا آیا تھا اور اس پر شک کیا جا سکتا تھا۔ شہر میں ایک ساتھ آٹھ خون ہو چکے تھے۔ پولیس نے اپنے خفیہ آدمی کو خسر والی آبادی کے آس پاس خاص طور پر چھوڑ رکھے تھے۔ بادل اپنی جگہ سے بالکل نہ اٹھا۔ وہیں سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مارے بیٹھا نیم وا آنکھوں سے بنگالی چوکیدار کو دھوتی پوش سے باتیں کرتے دیکھتا رہا۔ پھر چوکیدار بازار کی طرف اور دھوتی پوش سامنے والے درختوں کی طرف چلا گیا۔ جب وہ بادل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو بادل درگا دیوی کے مندر کے دروازے کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتا ہوا اپنی کوٹھری کی طرف آ گیا۔ کوٹھری میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کیا اور دیکھا کہ نجمی گہری نیند سو رہی تھی۔

اس نے نجمی کو جگا کر سارا ماجرا سنایا اور بولا۔

"مجھے یقین ہے کہ وہ دھوتی پوش سی آئی ڈی کا آدمی تھا۔"

نجمی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اپنے منڈے ہوئے سر پر گیروے رنگ کا رومال لپیٹا اور بولی "کچھ بھی ہو ہمیں یہاں سے کہیں نہیں جانا چاہیئے۔

آج آدھی رات کے بعد ہم انسپکٹر منجر یکمہ کی کوٹھی میں داخل ہو رہے ہیں۔ تب تک ہمارا اس کوٹھری میں رہنا بہت ضروری ہے۔"

بادل کچھ سوچ رہا تھا۔ بولا "اور اگر وہ سی آئی ڈی والا پولیس کو لے کر یہاں آ گیا تو؟"

نجمی نے گہرا سانس لیا اور چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بادل کی طرف دیکھ کر بولی "تمہارے خیال میں ہمیں کیا کرنا چاہیئے۔؟"

بادل چارپائی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گیا۔ کوٹھری میں اندھیرا تھا۔ صرف دیوار کے اوپر والے روشندان سے دن کی ہلکی ہلکی روشنی اندر آ رہی تھی بادل سر جھکائے کچے فرش پر لکیریں کھینچنے لگا۔ وہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ باہر سے کسی نے بنگلہ زبان میں آواز دی "مہاراج دکھشنا لیجیئے۔"

بادل جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ نجمی نے منکوں کی مالا اپنے ہاتھ میں لے کر پھیرنی شروع کر دی بادل نے دروازہ کھولا تو کوٹھری کے آگے وہی دھوتی پوش کاندھے سے چھتری لٹکائے ہاتھ میں مٹھائی کا دونا لیے کھڑا تھا۔ بادل کے سینے میں دل ایک بار زور سے دھڑکا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور بنگلہ میں بولا۔ مہاراج آپ کی بڑی کرپا ہے۔ دھنباد! دھنباد بادل نے آگے بڑھ کر مٹھائی کا دونا لینا چاہا! تو دھوتی پوش نے ہاتھ پیچھے کر لیا اور بولا۔

"مہاراج! میں اسے اپنے ہاتھ سے آپ کی تپنی بیراگن کو پیش کروں گا۔"

اور اس سے پہلے کہ بادل اسے روکتا وہ کوٹھری میں آ گیا۔ نجمی مالا کا جاپ کر رہی تھی۔ دھوتی پوش کو دیکھتے ہی وہ سمجھ گئی کہ یہ وہی دھوتی پوش چھتری والا ہے جس کے بارے میں بادل نے بتایا تھا کہ مجھے پولیس کا آدمی لگتا ہے۔

دھوتی پوش نے مٹھائی کا دونا نجمی کے آگے رکھتے ہوئے کہا۔۔۔ "دیوی جی! میری بیوی کے ہاں کل لڑکا ہوا ہے میں نے منت مانی تھی کہ اگر میرے گھر اس بار لڑکا ہوا تو درگا دیوی کے مندر میں جو بھی بیراگن پہلے آئے گی میں اس کے چرنوں میں مٹھائی کا دونا ارپن کروں گا اسے سویکار کریں۔"

نجمی نے مالا والا ہاتھ بلند کر کے بنگلہ میں کہا۔۔۔ "دھن ہو، دھن ہو۔"

بادل اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ دھوتی پوش مٹھائی کا دونا نجمی کو دے کر دروازے کی طرف بڑھا اور اچانک دروازے سے پلٹا اور جیب سے پستول نکال کر بادل کی طرف نالی کا رخ کر دیا۔ ساتھ ہی مکاری سے ہنسا اور بولا۔۔۔ "چپکے سے میرے ساتھ باہر نکل آؤ میں نے تم دونوں کو پہچان لیا

ہے اگر ذرا بھی گڑ بڑ کی تو یہ مت بھولنا کہ پولیس کی پوری گارڈ مندر کو گھیرے میں لے چکی ہے۔"

بادل کوئی عام قسم کا جرائم پیشہ آدمی نہیں تھا۔ وہ ایک خونخوار قسم کا ڈاکو تھا اور کئی قتل کر چکا تھا۔ دھوتی پوش پولیس کا ٹاؤٹ یا خفیہ ایجنٹ اس سے زیادہ طاقتور بھی نہیں تھا اگر وہ اس سے دوگنا طاقتور بھی ہوتا تب بھی بادل اسے وہاں سے زندہ واپس نہ جانے دیتا۔ دوسری طرف نجمی بھی مرنے مارنے پر اُتر آئی تھی اور اس جھولے کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں اس کا پستول تھا اور جو کوٹھری کی دیوار کے ساتھ لٹک رہا تھا۔ بادل نے ہاتھ باندھ کر بڑی عاجزی سے کہا
" مہاراج! آپ کو دھوکا ہوا ہے ہم تو بیراگی ہیں۔ تری پورہ سے درگا میا کے درشن کرنے آئے ہیں۔"

دھوتی پوش نے غصّے سے دانت پیس کر کہا... " بکواس بند کرو، سیدھی طرح میرے آگے آگے کوٹھڑی سے نکل کر باہر چلو، چلو تم بھی فراڈ عورت میں جانتا ہوں تم کون ہو اور کلکتے میں کتنے آدمیوں کو قتل کر کے بھاگی ہو۔"

بادل گڑگڑاتے ہوئے جھک گیا... " شما کر دیں مہاراج! شما کر دیں مہاراج۔" یہ کہتے کہتے بادل نے نیچے سے دھوتی پوش کے پستول والے ہاتھ پر اپنا الٹا ہاتھ مارا۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر اوپر کو اُچھلا۔ بادل نے اوپر اٹھتے ہی دھوتی پوش کی ٹھوڑی پر اچھل کر اتنے زور سے لات ماری کہ وہ پیچھے کو گرا۔ بادل نے نجمی سے کہا... " دروازہ بند کر دو۔" اور دھوتی پوش پر چھلانگ لگا کر اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں کے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہ ایک خونخوار سخت جان پہاڑوں میں رہنے والے قاتل ڈاکو کا شکنجہ تھا۔ دیکھتے دیکھتے دھوتی پوش کی آنکھیں باہر کو اُبل پڑیں۔ ہاتھ پاؤں ٹیڑھے ہو گئے۔ بادل اس کی گردن کو مزید دبائے جا رہا تھا اس نے چھ سات خوفناک جھٹکے دیئے اور اپنے ہاتھ اس وقت الگ کیے جب دھوتی پوش کی جان نکل چکی تھی۔ نجمی نے کوٹھڑی کے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی تھی۔ پولیس کے ٹاؤٹ کی لاش چارپائی کے پاس زمین پر پڑی تھی۔ نجمی نے جھک کر لاش کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا دل کی دھڑکن بند ہو چکی تھی۔

اس نے بادل سے کہا... " اس لاش کو یہیں رہنے دیں گے۔ ہمیں صرف رات کے بارہ بجے تک ہی یہاں رہنا ہے اس کے بعد ہم نکل جائیں گے۔" بادل نے دھوتی پوش سی آئی ڈی کی تلاشی لی

اس کی جیب میں ایک رومال۔ سگریٹ کی ڈبیا، کچھ نقدی اور ایک شناختی کارڈ تھا۔ موم بتی روشن کر کے نجمی نے شناختی کارڈ کو دیکھا۔ یہ کلکتہ پولیس ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے جاری کردہ کارڈ تھا۔ جس پر دھوتی پوش کا نام شانتی پرشاد مکرجی اور عہدہ انسپکٹر درج تھا۔ بادل نے اس کا پستول اپنے قبضہ میں لے لیا تھا۔ جلدی سے لاش کو چارپائی کے نیچے گھسیٹ کر ڈال دیا گیا۔ اس کے اوپر چھپڑی بھی رکھ دی گئی۔ نجمی نے اپنا اور بادل کا جھولا اٹھا کر لاش کے اوپر ایک طرف رکھ کر اسے چھپانے کی کوشش کی مگر آدھی لاش اب بھی نظر آ رہی تھی۔ بادل بولا..." میں باہر سے گھاس پھوس جمع کر کے لاتا ہوں اس سے ہم لاش کو ڈھانپ دیں گے اور میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ باہر کوئی پولیس کا آدمی تو نہیں ہے۔"

نجمی نے غصّے میں کہا... " یہ حرامی جھوٹ بولتا تھا، پولیس اگر یہاں ہوتی تو اب تک ہمیں گرفتار کر لیا گیا ہوتا۔ یہ ہمیں گرفتار کر کے تھانے لے جانا چاہتا تھا تم جلدی سے سوکھے گھاس کے پتے اٹھا کر لے آؤ۔"

بادل نے پستول وہیں چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور جلدی سے کوٹھری سے نکل گیا۔ باہر آسمان ابر آلود ضرور تھا مگر بارش نہیں شروع ہوئی تھی۔ دن کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی اور درگا مندر کی طرف سے کھڑتالوں اور گھنٹیوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ بادل مندر کے پیچھے درختوں کے نیچے جا کر سوکھی شاخیں اور پتے جمع کرنے لگا۔ اس کے سوکھے پتوں اور جھاڑیوں سے اپنی جھولی بھری اور واپس کوٹھری میں آ کر اسے لاش کے اوپر ڈال کر اسے ڈھک دیا۔

بادل بولا..." اب تمھیں ہر حالت میں اسی جگہ رہنا ہو گا، میں بھی یہاں سے نہیں جاؤں گا، باہر پولیس کہیں نہیں، اس کے باوجود میں مندر کے باہر جا کر دیکھتا ہوں۔"

بادل ایک بار پھر باہر نکل گیا۔ نجمی نے دھوتی پوش خفیہ آدمی کے پستول کو چارپائی سے اٹھا کر موم بتی کی روشنی میں غور سے دیکھا یہ پرانی قسم کا پستول تھا، میگزین میں سات گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ نجمی نے پستول کو اپنی ران کے نیچے چھپا کر رکھ لیا اور جھک کر لاش کو دیکھا۔ لاش چارپائی کے نیچے بے حس و حرکت سوکھے پتوں اور شاخوں کے اندر پڑی تھی۔ نجمی اٹھ کر دروازے کے پاس گئی اس نے آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر دن کی روشنی میں دیکھا بادل وہاں نہیں تھا۔

مندر میں کھڑتالیں اور گھنٹیاں زور زور سے بج رہی تھیں۔ پجاری پوجا کرنے آرہے تھے۔ خدا جانے یہ کوئی خاص دن تھا کہ پوجا کرنے والوں کا تانتا بندھ رہا تھا۔ بادل مندر کے باہر پولیس کے آدمیوں کو دیکھنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ نجمی دروازے کو تھوڑا سا کھولے باہر جھانک رہی تھی کہ اچانک اس نے چوکیدار کو کوٹھری کی طرف آتے دیکھا۔ وہ مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہا تھا۔ بادل نے نجمی کو بتایا ہوا تھا کہ سی آئی ڈی کا آدمی چوکیدار سے باتیں کر رہا تھا اور اسی نے دھوتی پوش کو ان کی کوٹھری کی طرف بھیجا تھا۔ چوکیدار کو اپنی طرف آتا دیکھ کر نجمی نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ کنڈی لگانے کی اس نے ضرورت محسوس نہ کی۔ نجمی نے لپک کر جھولے میں سے اپنا بھرا ہوا ریوالور نکالا اور اسے چھپا کر چارپائی پر بیٹھ کر مالا جپنے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

نجمی نے بنگلہ میں پوچھا..... "کون ہے باہر؟"

چوکیدار نے لجاجت سے کہا..... "دیوی جی! میں اپنے پیسے لینے آیا ہوں پانچ روپے۔"

نجمی نے کہا..... "میرے پتی دیو باہر گئے ہیں دوپہر کے بعد آنا۔" مگر چوکیدار دروازہ کھول کر اندر آگیا۔ اندر آتے ہی اس نے جیب سے چاقو نکال کر نجمی کی طرف تان دیا۔ اس کی آنکھوں میں خباثت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔ نجمی کو پہلے سے معلوم تھا کہ وہ وہاں کس لیے آیا ہے پھر بھی وہ اس کی جان لینا نہیں چاہتی تھی۔

اس نے بڑی نرمی سے کہا..... "بھائی ہم تو بیراگی لوگ ہیں ہمیں کس لیے مارتے ہو؟"

چوکیدار نے آگے بڑھ کر نجمی کا بازو پکڑ کر کھینچا اور بولا..... "تم جانتی ہو میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

اور ساتھ ہی اس نے نجمی کو کھینچ کر نیچے گرانے کی کوشش کی۔ اس کشمکش میں وہ خود نیچے گر پڑا اور اس کی ٹانگ چارپائی کے نیچے لاش سے ٹکرا گئی۔ موم بتی کی روشنی میں اس نے تیزی سے سوکھے پتے ایک طرف ہٹا دیئے۔ سامنے اس دھوتی پوش کی لاش اس کی طرف بے جان ابلی ہوئی آنکھوں سے تک رہی تھی جس نے اس بیراگی اور بیراگن کے بارے میں پوچھا تھا کہ یہ کب مندر میں آئے ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ چوکیدار نے تڑپ کر چاقو نجمی پہ تان لیا اور

گھبرائی ہوئی کسی قدر تحکمانہ آواز میں بولا..... "تم نے اسے قتل کر دیا؟ میں تمھیں جانے نہیں دوں گا۔"

وہ باہر بھاگنے کے لیے پیچھے کو ہٹنے لگا لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ نجمی اسے وہاں سے زندہ سلامت باہر جانے کی اجازت دے دیتی۔ اس نے اپنے گیروی ساڑھی کے اندر ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ چوکیدار کی طرف کر کے بولی "یہاں چپکے سے بیٹھ جا۔"

بنگالی چوکیدار گھبرا کر بھاگنے لگا تو نجمی نے اچھل کر اسے نیچے گرا لیا۔ ریوالور اس کی گردن پر رکھا اور غرائی اب اس نے بنگالی ہی اسے کہا کہ اگر یہاں سے ہلے تو گولی چلا دوں گی بنگالی چوکیدار زمین پر پڑا خوف کے مارے کانپنے لگا تھا۔ چارپائی کے نیچے ایک اور لاش اس کے سامنے پڑی تھی۔ نجمی نے تیزی سے اٹھ کر دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔ وہ ریوالور تانے چوکیدار کے سر پہ کھڑی ہوئی تھی۔ بنگالی چوکیدار پچھتا رہا تھا کہ وہ کیوں موت کے منہ میں آ گیا۔ نجمی کو بادل کے آنے کا انتظار تھا۔ وہ فائر نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اگرچہ مندر میں کھڑتالوں کا اتنا شور تھا کہ اگر فائر کرتی تو ممکن تھا کہ گولی کی آواز اس شور میں دب جاتی لیکن وہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتی تھی۔ اتنے میں بادل بھی آ گیا۔ اس نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ نجمی نے بادل کے پاؤں کی چاپ پہچان لی تھی۔ پھر بھی اس نے پوچھا کہ کون ہے؟

بادل نے کہا..... "میں ہوں چندا بی بی بادل۔"

نجمی نے ایک ہاتھ بڑھا کر کنڈی کھول دی۔

بادل نے اندر آ کر جو منظر دیکھا تو بولا "یہ..... یہ کہاں سے آگیا؟"

بنگالی کے ہاتھ میں جو چاقو تھا وہ نجمی نے اٹھا لیا تھا۔

وہ ہاتھ باندھ کر بولا "دادا میں..... میں تو اپنے پانچ روپے لینے آیا تھا کہ دیوی جی نے....."

اس کا حلق سوکھ گیا اور وہ آگے نہ بول سکا۔

بادل نے کنڈی لگا دی۔ نجمی نے اسے بتایا کہ اس نے چارپائی کے نیچے لاش کو دیکھ لیا ہے۔ بادل غرایا "تو ابھی تک یہ کافر زندہ کیوں ہے؟" اور بادل نے بنگالی چوکیدار کی گردن

کو اپنے مضبوط ہاتھوں کے شکنجے میں دبوچ کر جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ ہندو بنگالی چوکیدار دبلا پتلا سا تھا۔ اس نے کوئی مدافعت نہ کی۔ بادل جیسے طاقتور اونچے لمبے ڈاکو کے مقابلے میں اس کی تاب بھی نہیں تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر وہ ٹھنڈا ہو گیا۔

جب بادل اور نجمی کو یقین ہو گیا کہ چوکیدار مر چکا ہے تو انھوں نے اس کی لاش کو بھی چارپائی کے نیچے سی آئی ڈی والے ہندو دھوتی پوش کی لاش کے اوپر ڈال کر ان پر سوکھے پتے اور درختوں کی شاخیں اس طرح بکھیر دیں کہ دونوں لاشیں ان میں چھپ گئیں اس کے آگے انھوں نے اپنے جھولے رکھ دیئے۔ بادل نے موم بتی بجھا دی اور دھوتی پوش کا شناختی کارڈ، رومال اور پستول بھی اس کی لاش کے اوپر دوسری طرف پھینک دیا۔ نجمی نے اپنا ریوالور جھولے میں رکھ دیا اور بادل سے پوچھا کہ باہر پولیس تو نہیں تھی؟ بادل نے اُسے بتایا کہ سی آئی ڈی والا جھوٹ بول رہا تھا۔ باہر پولیس کا کہیں نام و نشان تک نہیں ہے۔ اگر وہ یہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تو البتہ اس وقت تک یہاں پولیس کی پوری مسلح گارڈ پہنچ چکی ہوتی۔

نجمی چارپائی پر کچھ پریشان سی ہو کر بیٹھ گئی کہنے لگی "اگر کسی نے چوکیدار کو ادھر آتے دیکھ لیا ہو گا تو مندر کے آدمی اس کی تلاش میں ادھر آ سکتے ہیں۔"

بادل نے جھولے میں سے اپنا ریوالور نکال کر صدری کے اندر ڈال لیا اور بولا "اب جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ ہم رات ہونے سے پہلے یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ ہمیں نکلنا بھی نہیں چاہیئے۔ یہ جگہ منجر یکھر کی کوٹھی کے بہت قریب ہے۔ اندھیرا ہونے پر ہم یہاں سے چل دیں گے۔ کسی طرح باقی کا وقت اسی جگہ گزار لو۔"

نجمی نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "تم باہر خیال رکھو۔"

بادل نے گردن میں سے منکوں کی مالا اتار کر ہاتھ میں لے لی اور کوٹھری سے نکل کر ایک طرف زمین پر بیٹھ گیا۔ نجمی نے اندر سے کنڈی لگا لی تھی۔ بادل بیراگیوں کے بھیس میں کوٹھری کے باہر مالا کا جاپ کرتا بڑی بے چینی سے شام کا اندھیرا ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے یہ بھی خطرہ تھا کہ پولیس والے اپنے آدمی کی تلاش میں مندر میں نہ نکل آئیں۔ مگر اس خیال سے اسے تھوڑا سا اطمینان بھی تھا کہ ایسا ہوا نہیں کرتا۔ سی آئی ڈی والے عام طور پر شام کو جا کر تھانے میں رپورٹ دیا کرتے

ہیں۔ بنگالی چوکیدار کی اسے فکر نہیں تھی۔ اس کے بارے میں وہاں شاید کسی کو زیادہ تشویش نہیں ہو سکتی تھی۔ مندر میں خوب رونق تھی۔ پوجا کرنے والے لوگ اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ ماتھا ٹیکنے چلے آ رہے تھے۔ دور درختوں کے نیچے الاؤ کے سامنے بیٹھے نیم عریاں سادھوؤں کی بھانمتی بن رہی تھی۔ ایک آدمی نے سب سے الگ بیٹھے ایک بیراگی کو مالا جاپ کرتے دیکھا تو بادل کے آگے بھی بڑی عقیدت سے مٹھائی کی ٹوکری رکھ گیا۔ بادل کو اس وقت مٹھائی بڑی غنیمت لگی۔ کیونکہ وہ رات کا کھانا لینے بازار نہیں جا سکتا تھا۔ جب شام کا اندھیرا چھا گیا تو بادل مٹھائی کی ٹوکری اٹھا کر کوٹھری میں آ گیا۔ نجمی بھی اندر بے چین بیٹھی تھی۔ دونوں کو بھوک لگ رہی تھی انھوں نے پیٹ بھر کر مٹھائی کھائی اور نجمی نے وقت پوچھا۔ بادل نے بتایا کہ ابھی شام ہوئی ہے۔ حالات ٹھیک جا رہے ہیں۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ آدھی رات کے بعد اگر وہ کوٹھری سے نکلیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ نجمی اس پر تیار نہیں تھی۔ وہ لاشوں والی کوٹھری سے جتنی جلدی ہو سکے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن بادل کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ نجمی خاموش ہو کر بیٹھ گئی۔ بادل ایک بار پھر حالات کا جائزہ لینے کے لیے باہر نکل گیا۔ یوں رات گزرتی چلی گئی۔ رات کے گیارہ بجے بادل کوٹھری کے ایک طرف بیٹھا رام رام کر رہا تھا کہ ایک مہنت اس کی طرف آیا اور بنگالی چوکیدار کے بارے میں پوچھنے لگا کہ وہ ادھر تو نہیں آیا۔ بادل نے ہاتھ باندھ کر مہنت کو پرنام کیا اور کہا کہ "مہاراج ادھر چوکیدار بڑی دیر سے نہیں آیا۔" مہنت نے ترش روئی سے پوچھا "تم کب تک یہاں ٹھہرو گے؟" "ہم بیراگیوں کو دو روز سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔"

بادل نے بڑی عاجزی سے کہا "مہاراج میری پتنی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے مگر ہم کل ضرور تہری پورہ واپس چلے جائیں گے۔"

مہنت نے اگلے روز کوٹھری خالی کرنے کی تاکید کی اور وہاں سے چلا گیا۔ بادل نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آدھی رات کے بعد مندر سے نکلنا چاہتے تھے۔ خدا خدا کر کے رات کے بارہ بجے اور بادل نے نجمی کو ساتھ لیا اور کوٹھری سے نکل کر مندر کے پیچھے سے ہوتے ہوئے ایک پگڈنڈی پر آ گئے۔ دونوں لاشیں کوٹھری میں چارپائی کے نیچے پڑی تھیں۔ جھولے ان دونوں نے اپنے کاندھوں سے لٹکا رکھے تھے جن میں بھرے ہوئے ریوالور موجود تھے۔ نجمی تھوڑا آگے آگے چل

رہی تھی۔ کیونکہ اسے مرہٹہ پولیس انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کا راستہ معلوم تھا۔ رات کی تاریکی میں چلتے ہوئے وہ انسپکٹر منجریکر کی کوٹھی کے پچھواڑے پہنچ گئے۔ خلاف توقع کوٹھی میں اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ صرف عقبی لان کی کوٹھی جل رہی تھی۔

بادل نے سرگوشی کی "لگتا ہے یہاں کوئی نہیں ہے۔"

نجمی دبے پاؤں چلتی کوٹھی کے سامنے والے حصّے میں آ گئی۔ یہاں بھی صرف برآمدے کی بتی روشن تھی۔ کمروں میں اندھیرا تھا۔ گیراج میں گاڑی بھی نہیں کھڑی تھی۔

نجمی نے بادل کو ایک طرف جھاڑیوں کی طرف لے جا کر آہستہ سے کہا "ہو سکتا ہے کافر کی اولاد منجریکر اندر سو رہا ہو۔ تم اس جگہ ٹھہرو۔ میں دوسری طرف سے اندر جا کر دیکھتی ہوں۔ مجھے اس کوٹھی کے تمام راستوں کا علم ہے۔"

بادل کو وہیں چھوڑ کر نجمی نے جھولے میں سے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لیا۔ جھولے کو وہیں بادل کے پاس رکھ دیا اور خود کوٹھی کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتی اس جگہ آ گئی جہاں لان میں منجریکر کے بیڈ روم کی کھڑکی کھلتی تھی۔ کھڑکی پر بھی تاریکی چھائی تھی۔ دیوار کے ساتھ اینٹوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگا تھا۔ نجمی اس پر پاؤں رکھ کر دیوار پھاند گئی۔ لان میں پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی وہ منجریکر کے بیڈ روم کی کھڑکی کے قریب آ گئی۔ اس نے کھڑکی کو اندر کو دبایا۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ اس نے کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نجمی جھک کر چلتی باتھ روم کے عقبی دروازے کے پاس آ گئی۔ دروازے کو اندر کو دبایا تو اس کے بدن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ باتھ روم کا عقبی دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ نجمی نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ باتھ روم میں اندھیرا تھا وہ اندر چلی گئی۔ باتھ روم کا بیڈ روم کی جانب کھلنے والا دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ بیڈ روم میں آ گئی۔ ریوالور کا رخ پلنگ کی طرف کیے وہ دبے پاؤں آگے بڑھی مگر پلنگ بالکل خالی تھا۔ ایک طرف انسپکٹر منجریکر کا سلیپنگ گاؤن آرام کرسی پر پڑا تھا۔ نجمی وہاں سے نکل کر ساتھ والے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس نے کوٹھی کے سارے کمروں میں گھوم پھر کر دیکھا۔ کوٹھی خالی پڑی تھی۔ منجریکر وہاں نہیں تھا۔ نجمی کو سخت مایوسی ہوئی۔ وہ بڑی دور سے اس کافر کو ہلاک کرنے آئی تھی۔ وہ سوچنے لگی کہ یہ کافر کہاں جا سکتا ہے رات کے وقت؟ نجمی کو اچانک کرشنا بائی کا خیال

آ گیا۔ آدھی رات کے وقت انسپکٹر منجریکر لکھی بائی کی پرانی کوٹھی میں کرشنا بائی کے پاس ہی ہو سکتا ہے وہ تیزی سے کمروں سے گزرتی باہر عقبی لان میں آ گئی۔ یہاں سے اس نے دیوار پھاندی اور دبے پاؤں چلتی بادل کے قریب آ کر بیٹھ گئی اور اسے بتایا کہ کافر کوٹھی میں نہیں ہے مگر اسے معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہو گا؟ بادل نے پوچھا۔ چلو وہاں چلتے ہیں۔ اب آئے ہیں تو اس خبیث آدمی کو ٹھکانے لگا کر ہی جائیں گے۔ نجمی نے بادل کو وہاں سے نکالا اور حضرپور روڈ پر آ کر بتایا کہ انہیں دریائے ہگلی کے کنارے والی لکھی بائی کی پرانی کوٹھی میں جانا ہو گا۔ یہ کوٹھی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ دریا قریب ہی بہہ رہا تھا۔ نجمی اور بادل نے سڑک پار کی اور آدھی رات کی تاریکی میں دریا کے کنارے والی ڈھلان اتر کر کائی اور تنہاری کی جھاڑیوں میں سے گزرتے لکھی بائی کی پرانی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

.. .. ؞ .. ..

لکھی بائی کی پرانی کوٹھی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ گیٹ کے اوپر لگا کمزور سا بلب اس تاریکی کو اجالنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ نجمی اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اس کوٹھی میں وہ پہلی بار طوائف بنانے کے لیے لائی گئی تھی۔ اس کوٹھی کے تہہ خانے میں اس پر انسانیت سوز تشدد ہوا تھا اور اسے ناچنے اور گانے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ وہ اس کوٹھی کو کیسے بھلا سکتی تھی۔ اس نے بادل کو ساتھ لیا اور کوٹھی کے ٹوٹے ہوئے پھاٹک سے گزر کر برآمدے کے کونے کی طرف آ گئی۔ چوکیدار پھاٹک سے کچھ فاصلے پر گھاس پھوس کے چھپر تلے بینچ پر لمبی تانے سو رہا تھا۔ جس طرف نجمی آئی تھی ادھر کرشنا بائی کے کمرے کی پچھلی کھڑکی تھی۔ اس کا دروازہ کوٹھی کے سامنے کی جانب راہداری میں سے گزر کر آتا تھا۔ مگر نجمی اس طرف سے نہیں جانا چاہتی تھی۔ ایک بات سے نجمی کو تشویش ضرور ہوئی تھی کہ یہاں بھی اسے انسپکٹر منجر یکر کی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی ہو سکتا ہے کہ وہ کرشنا بائی کے پاس بھی نہ آیا ہو۔ لیکن نجمی کرشنا سے مل کر منجر یکر کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی کہ آج کل راتوں کو وہ کس کے کوٹھے پر جاتا ہے۔ کرشنا بائی کے کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ نجمی نے بند کھڑکی کے ساتھ کان لگا دیا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ نجمی نے بادل سے سرگوشی میں کہا ”ممکن ہے منجر یکر اسی کمرے میں سو رہا ہو۔ تم یہاں ٹھہرو میں دروازے کی طرف سے جاتی ہوں۔“

بادل کو وہیں کھڑکی کے نیچے چھوڑ کر نجمی برآمدے اور تاریک راہداری میں سے گزرتی ہوئی کرشنا بائی کے کمرے کے سامنے آ کر رک گئی۔ دروازہ بند تھا۔ نجمی ... دروازے پر آہستہ سے دستک دینے ہی لگی تھی کہ اندر سے کرشنا بائی کے کھانسنے کی آواز آئی۔ نجمی نے دروازے پر فوراً آہستہ سے ٹھک ٹھک کی۔ اندر خاموشی چھا گئی۔ نجمی نے اس خیال سے ریوالور اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا کہ اگر اندر منجر یکر ہوا تو وہ اسے یہیں ڈھیر کر دے گی۔

دوسری بار دستک دی تو کرشنا نے پوچھا ”کون ہے؟“

نجمی اپنی آواز نہیں نکالنا چاہتی تھی کہ اگر منجر یکر اندر موجود ہے تو وہ اس کی آواز پہچان کر ہوشیار نہ ہو جائے۔ نجمی نے ایک بار پھر دستک دی۔

اب کرشنا نے بند دروازے کی دوسری جانب منہ قریب لا کر پوچھا ”چوکیدار تم ہو کیا؟“

نجمی نے سرگوشی میں کہا ”میں ہوں کرشنا میں۔ چندا۔“

کنڈی ایک دم سے کھلی اور دروازہ بھی ساتھ ہی کھل گیا۔ اس کے سامنے کمرے کی نیم تاریکی میں کرشنا کھڑی تھی اس کے سیاہ بال کاندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اس سے پہلے کہ نجمی اس سے منجر یکر کے بارے میں پوچھتی کرشنا نے نجمی کو بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

”چندا تم؟ تم اس وقت کیسے؟“

نجمی نے اندھیرے میں کرشنا کے پلنگ کی طرف دیکھا۔ پلنگ پر منجر یکر نہیں تھا۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کرشنا نے جلدی سے باتھ روم کی بتی جلا کر اس کا دروازہ اس طرح سے بند کر دیا کہ بلب کی روشنی کمرے میں بھی تھوڑی تھوڑی آنے لگی تھی۔

نجمی کو بیراگنوں کے روپ میں دیکھ کر کرشنا نے پوچھا ”یہ تم نے کیا حلیہ بنا لیا ہے چندا۔“ اور پھر اسے گلے سے لگا کر کرشنا رونے لگی۔

نجمی کو بالکل رونا نہ آیا۔ وہ رونے دھونے کی حدود سے بہت آگے آگ اور خون کی دنیا میں نکل چکی تھی جہاں عورت اپنے اوپر ظلم ہونے پر روتی نہیں تھی بلکہ رائفل اٹھا کر ظلم کرنے والے کو بھون کر رکھ دیتی تھی۔

نجمی نے کرشنا کو الگ کیا اور بولی ”میرا ایک ساتھی بادل کھڑکی کے نیچے بیٹھا ہے۔ میں اسے اندر بلاتی ہوں۔“ اور نجمی نے اٹھ کر کھڑکی کھول دی۔ ریوالور نجمی کے ہاتھ میں ہی تھا۔

کرشنا کچھ پریشان سی ہو کر پلنگ کی پٹی پر بیٹھ گئی۔ کھڑکی میں سے بادل بھی اندر آ گیا۔ اسے بھی بیراگیوں کے بھیس میں دیکھ کر کرشنا کو عجیب سا لگا۔

نجمی نے کھڑکی بند کر دی اور پلٹ کر کرشنا سے پوچھا "وہ حرامزادہ منجریکر کہاں ہے؟"

یہ ساری باتیں بنگلہ زبان میں ہو رہی تھیں۔ کرشنا نے نجمی کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ دیا اور دھیمی آواز میں بولی "او نچا مت بولو۔ وہ خبیث ساتھ والے کمرے میں نشے میں دھت پڑا ہے۔"

نجمی کی آنکھیں اس کامیابی پہ چمک اٹھیں۔ اس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "بادل میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ خبیث اسی جگہ موجود ہے۔"

کرشنا گھبرا سی گئی۔ ریوالور اس نے نجمی کے ہاتھ میں دیکھ لیا تھا۔ اب اس کے چہرے سے اندازہ لگا چکی تھی کہ نجمی وہاں کیا کرنے آئی ہے۔ اس نے ایک دم سے نجمی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور ناجہزانہ لہجے میں بولی "چندا! بھگوان کے لیے اس خیال کو اپنے دل سے نکال دو۔ پولیس پہلے ہی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے تم پر دھومل کے خون کا الزام ہے۔"

نجمی نے نفرت سے کہا "دھومل کا میں ایک بار نہیں ہزار بار خون کرنا چاہتی تھی۔ افسوس کہ وہ ایک ہی بار مر گیا۔ کرشنا! کیا دھومل نے تم پر ظلم نہیں کیا؟ کیا تم اس کی درندگی کا نشانہ نہیں بنی تھیں۔ کیا ان لوگوں نے تمہاری عزت و عفت اور تمہاری زندگی کے ٹکڑے کر کے بھوکے کتوں کے آگے نہیں ڈالے؟ پھر تم ان لوگوں سے ہمدردی کیوں کرتی ہو؟ اگر تم اپنی زندگی کی بربادی کا ان سے بدلہ نہیں لے سکتیں تو میرا راستہ کیوں روک رہی ہو۔ میں ان درندوں سے اپنی تباہی کا نہیں تمہاری بربادیوں کا بھی انتقام لے رہی ہوں۔ تم یہاں بیٹھو۔ میں اس شیطان صفت منجریکر سے ہزاروں بے بس عورتوں کی بے بسی اور مجبوریوں کا انتقام لے کر ابھی اسی جگہ واپس آتی ہوں۔"

کرشنا کمزور اور بزدل بنگالی عورت تھی۔ وہ نجمی کے پاؤں پر گر پڑی۔ اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے نجمی کو منجریکر کی موجودگی کے بارے میں کیوں بتایا۔ کوٹھی میں ایک خون ہونے والا تھا اور اس کے بعد کرشنا کے ساتھ کیا بیتنے والی تھی اسے اچھی طرح معلوم تھا لیکن نجمی کو اس کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ان ہزاروں عورتوں کو بھی بچانا چاہتی تھی جو خبیث منجریکر کی بربریت کا نشانہ بننے والی تھیں۔

اس نے بادل کی طرف دیکھ کر کہا "کرشنا کو سنبھالو بادل میں ابھی آتی ہوں۔"

بادل نے کرشنا بائی کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے اپنے قریب ہی فرش کی دری پر بٹھا لیا وہ نہیں چاہتا تھا کہ کرشنا اونچی آواز نکالے۔

نجمی کے ہاتھ میں بھرا ہوا ریوالور تھا۔ وہ اس کمرے سے بخوبی واقف تھی جہاں منجریکر نشے میں دھت پڑا تھا۔ وہ اسے نشے میں ہلاک نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب وہ موت بن کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے تو منجریکر کی کانپتی ہوئی ٹانگوں کا بھی تماشا کرے اور فائر کرنے سے پہلے اسے بتائے کہ وہ کون ہے اور اسے کیوں ہلاک کر رہی ہے۔ لیکن نجمی کو موقع مل گیا تھا اور وہ اس موقع کو ہاتھ سے نہیں کھونا چاہتی تھی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ بند تھا۔

یہی وہ کمرہ تھا جہاں کئی بار اس پر بھی منجریکر نے تشدد کیا تھا۔ دروازے کو اندر سے کنڈی نہیں لگی تھی۔ نجمی اندر داخل ہو گئی۔ باتھ روم کی بتی روشن تھی مگر کمرے کی بتی بجھی ہوئی تھی۔ نجمی نے نیم اندھیرے میں دیکھا کہ منجریکر صرف دھوتی میں ملبوس پلنگ پر اس طرح اوندھا پڑا تھا کہ اس کی ایک ٹانگ پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھی۔ میز پر مشروب کی بوتل گلاس میں بھنی ہوئی مچھلی کے کانٹے پڑے تھے۔ نجمی نے آگے بڑھ کر پاؤں سے منجریکر کے چہرے کو دوسری طرف دھکیلا۔ وہ نشے میں بالکل دھت تھا اسے کوئی ہوش نہیں تھا۔ نجمی نے سوچا کہ اسے اس کتے پر گولی ضائع نہیں کرنی چاہیئے۔ ریوالور نجمی نے ساڑھی میں اڑس لیا۔ وہ منجریکر کی گردن میں پھندا ڈال کر اسے دروازے میں لٹکانا چاہتی تھی۔ لیکن اسے ڈر تھا کہ بعد میں کرشنا اسے اتار دے گی۔ اور ممکن ہے منجریکر اسپتال جا کر بچ جائے۔ نجمی نے اس خیال کو دل سے نکال دیا۔

ریوالور دوبارہ نکال کر ہاتھ میں لیا اور منجریکر کی کھوپڑی کے عین بیچ میں رکھ کر شیرنی کی طرح دھاڑی "منجریکر! میں چندا ہوں۔ مرنے سے پہلے مجھے پہچان لے۔ دوزخ میں جاتے جاتے میری آواز سن لے تاکہ تیری روح جب تک جہنم میں جلتی رہے میری آواز بھی تیرے کانوں میں آتی رہے۔"

منجریکر نے شاید لاشعور میں چندا کی آواز سن لی تھی۔ زیادہ نشے کی وجہ سے اس کا سر تو اپنی جگہ سے نہ ہلا مگر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے ڈیلے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ہونٹوں سے بڑبڑاہٹ سی سنائی دی۔

نجمی نے جھک کر کہا "میں چندا ہوں منجریکر اور تجھے کتے کی موت مارنے آئی ہوں۔ تجھ سے اپنے اوپر کیے گئے ظلم کا بدلہ لینے آئی ہوں۔ کیا تو میری آواز سن رہا ہے؟ کاش تو اس گولی کی آواز بھی

سن لے جو تھوڑی دیر میں تیری کھوپڑی کو پاش پاش کرنے والی ہے۔"

منجر یکر کو کچھ ہوش نہیں تھا لگتا تھا کہ وہ چندا کی آواز سن رہا ہے۔ اسے پہچان گیا ہے۔ وہ جواب میں کچھ کہہ رہا تھا مگر الفاظ اس کے ہونٹوں سے نہیں نکل رہے تھے۔ چندا نے ریوالور کی نالی کو منجر یکر کی کھوپڑی سے ایک اینچ اونچا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ دوسرے کمرے میں بادل نے کرشنا کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا رکھا تھا۔ وہ بے تابی سے فائر کی آواز کا انتظار کر رہا تھا۔ پھر گولی چلنے کا دھماکہ ہُوا۔ کرشنا کے حلق سے نکلی ہوئی چیخ اس کے حلق میں ہی دب کر رہ گئی۔ بادل نے کرشنا کے ہونٹوں پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔ خطرہ تھا کہ گولی کی آواز پر وہ شور نہ مچا دے یا رونا شروع کر دے۔ باہر سے چوکیدار وہاں بھاگ کر آ سکتا تھا اور بادل خواہ مخواہ دوسرا قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس کے ساتھ ہی نجمی کمرے میں داخل ہوئی۔ ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے بادل سے کہا: "میں نے کافر کے بچے کو مار ڈالا ہے۔"

پھر کرشنا پر جھکی اور بولی: "کرشنا! تو اس جہنم میں ہمیشہ جلتی رہے گی۔ تو یہاں سے کبھی نہیں نکل سکے گی اس لیے کہ تو پیدا ہی اس جہنم کی ایندھن بننے کے لیے ہوئی ہے۔"

اس نے بادل سے کہا کہ وہ کرشنا کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لے۔ بادل نے ہاتھ ہٹا دیا۔ کرشنا بے حد دہشت زدہ تھی۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکل رہی تھی۔

نجمی نے ریوالور پلنگ پر رکھتے ہوئے کہا: "تو فکر نہ کر۔ میں تجھ پر اس قتل کا الزام نہیں آنے دوں گی۔ لا مجھے کاپی پنسل دے۔"

کرشنا روئے جا رہی تھی۔ اس پر بے حد خوف طاری تھا۔

نجمی نے اس کی الماری میں سے کاپی پنسل نکالی اور کاغذ پر ایک مختصر سی تحریر لکھی: "انسپکٹر منجر یکر کو میں نے پستول سے ہلاک کیا ہے۔ کرشنا بائی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ چندا بائی۔" کاغذ پھاڑ کر [illegible] نے تحریر پڑھ کر کرشنا کو سنا دی اور کہا: "اب تمھیں قانون کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے نیچے اپنے دستخط کر [illegible]"

[illegible] نجمی نے کرشنا بائی کو اٹھا کر اپنے گلے سے لگا لیا۔ اس کے ماتھے کو چوما اور کہا

"اب شاید آئندہ کبھی ہماری ملاقات ہو کرشنا لیکن اگر میرے لیے کچھ کر سکو تو اتنا ضرور کرنا کہ جب میرا محبوب ندیم ادھر آئے تو اسے بتا دینا کہ میں اس کے لائق نہیں رہی وہ واپس پاکستان چلا جائے۔"

یہ کہہ کر نجمی نے پلنگ پر پڑا ہوا ریوالور اٹھا کر جھولے میں ڈالا۔ جھولا کاندھے سے لٹکایا اور بادل کو ساتھ لے کر کھڑکی کے راستے عقبی باغیچے میں کود گئی۔

کچھ دیر بعد بادل اور نجمی بیراگیوں کے بھیس میں دریائے ہگلی کے کنارے رات کی تاریکی میں کلکتے کے ہوڑہ ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جہاں سے وہ منہ اندھیرے کوئی بھی گاڑی پکڑ کر بردوان اور پھر وہاں سے اپنی خفیہ کمین گاہ کی طرف نکل جانا چاہتے تھے۔ نجمی کو یقین تھا کہ کرشنا اس کی سہیلی ہے اور وہ اسے اتنا موقع ضرور دے گی کہ وہ کلکتے سے باہر یا کم از کم جائے واردات سے کافی دور نکل جائے۔ اس کے باوجود وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے کلکتہ چھوڑ دینا چاہتی تھی۔ بادل اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ کالی گھاٹ کے پاس پہنچے تو انھیں سڑک پر ایک خالی ٹیکسی دور سے آتی دکھائی دی۔ اس کی سرخ بتی چھت کے اوپر جل رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ ٹیکسی خالی ہے۔ بادل ہاتھ جوڑ کر سڑک کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ ٹیکسی واقعی خالی تھی ڈرائیور نے ایک سادھو منش بیراگی بیراگن کو دیکھا تو گاڑی روک لی۔

بنگلہ میں پوچھا: "گورو دیو کہاں جاؤ گے؟ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہا ہوں۔"

بادل نے پرنام کرنے کے بعد کہا: "بیٹا ہمیں بھی اسٹیشن جانا ہے تری پورہ والی گاڑی پکڑنی ہے۔ درگا ماتا کے درشن کو آئے تھے کالی گھاٹ پر۔"

ٹیکسی والے نے انھیں اپنی گاڑی میں بٹھا لیا اور ٹیکسی اسٹیشن کی طرف روانہ ہو گئی۔ اسٹیشن پر پہنچے تو پتہ چلا کہ بردوان جانے والی گاڑی پلیٹ فارم پر تیار کھڑی تھی۔ نجمی اور بادل بھاگ کے پلیٹ فارم پر آئے اور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں گھس کر بیٹھ گئے۔ اس گاڑی نے انھیں بردوان پہنچا دیا۔ یہ گاڑی آگے نہیں جاتی تھی۔ یہاں سے انھوں نے دوسری گاڑی پکڑی اور اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔

دوسرے دن انسپکٹر منجر یکر کے قتل کی خبر علاقے کے بچے بچے کی زبان پر تھی۔ پولیس کو چندا کا خط مل گیا تھا جس میں اس نے منجر یکر کے قتل کا اعتراف کیا تھا۔ پھر بھی پولیس نے کرشنا بائی کو حراست

میں لے لیا اور اس سے چندا اور اس کے ساتھی کے بارے میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔ انسپکٹر منجر یکر کی جگہ ایک دوسرا مدراسی پولیس انسپکٹر آگیا تھا جس کا نام وی رامن تھا۔ یہ مدراسی پولیس انسپکٹر منجر یکر سے زیادہ سخت مزاج اور جابر قسم کا آدمی تھا۔ اس نے کرشنا بائی کا عدالت سے ریمانڈ لے کر اس پر سات دن تک بے پناہ تشدد کیا مگر اسے چندا بائی اور اس کے ساتھی کے بارے میں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا جتنا کرشنا بائی کو علم تھا۔ کرشنا بائی کو کلکتے کے ایک سیٹھ کی درپردہ مدد کی وجہ سے ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ چندا بائی اور اس کے ساتھی کی تلاش زور شور سے شروع ہو گئی۔ مگر پولیس کو چندا بائی عرف نجمی کے خفیہ ٹھکانے کا بالکل پتہ نہ چل سکا۔ نجمی بہار کے جنگل والی اپنی کمین گاہ میں پہنچ چکی تھی اور اب وہ روپا اور کالی بدمعاش کو قتل کرنے کا منصوبہ تیار کر رہی تھی۔ یہ وہ دو بدمعاش تھے جنھوں نے نجمی پر بے پناہ ظلم ڈھائے تھے ابھی مونچھوں والا موجھدار بھی باقی تھا جو نجمی کو مشرقی پاکستان سے خرید کر کلکتے لایا تھا۔

اس وقت کہانی ہماری اس جگہ پر پہنچ گئی ہے کہ ایک طرف نجمی پوری طرح ڈاکوؤں کے گروہ کی سرغنہ بنی ہوئی ہے اور اپنے تین دشمنوں، روپا، کالی اور موجھدار بردہ فروشوں کو قتل کرنے ان سے اپنے اوپر کی گئی زیادتیوں کا بدلہ لینے کے منصوبے تیار کر رہی ہے اور دوسری طرف ندیم کالے پانی کی جیل میں "پاکستانی جاسوس" کے بے بنیاد الزام کے تحت قید میں پڑا ہے۔ تیسری جانب ہماری... پرانی ساتھی شبانہ امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن کی ایک ہائی رائز بلڈنگ کے ڈبل بیڈ والے فلیٹ میں اپنے خاوند ظفر کے ظلم سہہ رہی ہے مگر زبان سے اف تک نہیں کرتی۔ اس کا چھوٹا بھائی عامر... کیلی فورنیا میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا ہے جس کا سارا خرچ اس کا ظالم اور احساس کمتری کا شکار خاوند ظفر اٹھا رہا ہے۔ لاہور والی کوٹھی کیناں لاج میں شبانہ کا بڑا بھائی عقیل اپنی بیوی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ یہ کوٹھی بھی ظفر نے اس کے مرحوم باپ سے اپنے نام لکھوالی تھی کیونکہ ظفر نے شبانہ کے باپ کا قرضہ چکا کر انھیں بدنامی اور ذلت کی موت سے بچایا تھا۔ ظفر نے یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا تھا۔ وہ نو دولتیہ تھا۔ معمولی پڑھا لکھا تھا مگر امریکہ جا کر کاروبار میں اس نے لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کمائے تھے۔ شبانہ کے ساتھ وہ بچپن ہی سے کھیلا تھا۔ شبانہ مغرور لڑکی تھی۔ اس نے ظفر کو کبھی منہ نہیں لگایا تھا اور ہمیشہ اس کی بے عزتی کی تھی۔

جب حالات نے بدتر صورت اختیار کی تو شبانہ کے باپ کو مجبوراً اس کی شادی ظفر سے کرنی پڑی۔ ظفر اب شبانہ سے انتقام لے رہا تھا۔ اسے یہ بھی ملال تھا کہ شبانہ اس سے زیادہ پڑھی لکھی کیوں ہے۔ ظفر نے شبانہ سے شادی بھی اسی لیے کی تھی کہ وہ اسے انتقام کا نشانہ بنائے وہ بات بات پر اس کی بے عزتی کرتا تھا۔ آدھی آدھی رات کو اسے اٹھا کر کہتا "کہ میرے سر میں درد ہے میرے لیے کافی بناؤ۔"

شبانہ اگر اپنی امریکی سہیلیوں میں بیٹھی ہوتی تو ظفر جیب سے گندا رومال نکال کر اس کی طرف پھینک کر کہتا "میرا رومال دھو لاؤ۔ تم کیسی پڑھی لکھی لڑکی ہو کہ اپنے خاوند کا رومال بھی نہیں دھو کر رکھ سکتیں۔" شبانہ کا چھوٹا بھائی عامر کیلی فورنیا سے کبھی کبھی اپنی بہن سے ملنے واشنگٹن آ جاتا تھا۔ لیکن ظفر اس کے سامنے بھی شبانہ کی بے عزتی کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ عامر کو بے حد صدمہ ہوتا۔ وہ اپنی بہن کو چھپ چھپ کر روتے دیکھتا۔ مگر وہ اس کی کوئی مدد نہ کر سکتا تھا۔ وہ خود اپنے بہنوئی ظفر کے ٹکڑوں پر پڑا تھا اور وہی اس کی تعلیم کے سارے اخراجات اٹھا رہا تھا۔ شبانہ نے لاہور میں اپنے بڑے بھائی عقیل کو اپنی حالت زار کبھی نہیں بتائی تھی۔ ہر خط میں یہی لکھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ظفر صاحب میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ لیکن اندر ہی اندر اس کا سینہ جل کر کوئلہ ہو گیا تھا۔ اسے راشد کا کئی بار خیال آتا۔ یہ خوابوں کا شہزادہ اسے پھر نہیں ملا تھا۔ اس نے اپنی آخری ملاقات میں کہا "اگر وہ اسے ملنے امریکہ ضرور آئے گا۔ لیکن شبانہ اس کی راہ دیکھ دیکھ کر نا امید ہو گئی۔ شبانہ کو واشنگٹن آئے ایک سال ہو گیا۔ ایک روز اس نے ڈرتے ڈرتے ظفر سے کہا کہ وہ لاہور اپنے بھائی سے ملنے جانا چاہتی ہے۔ اسے لاہور بہت یاد آ رہا ہے۔ ظفر نے اس پر بھی شبانہ اور اس کے بھائی کو گالیاں دیں اور باہر نکل گیا۔ لیکن ایک ہفتے بعد اس نے شبانہ کو اکیلی لاہور جانے کی اجازت دے دی۔ عامر اپنی تعلیم کی وجہ سے اس کے ساتھ نہیں جا سکتا تھا۔ پھر بھی عامر نے کیلی فورنیا سے لکھا کہ وہ چھٹی لے کر اپنی بہن کے ساتھ لاہور جائے گا۔ اس پر ظفر کا پارہ چڑھ گیا "کیا تم اکیلی نہیں جا سکتیں۔ تم نے ایم اے کس لیے کیا تھا؟ ایم اے کیا ہے تو اب اکیلی بھی سفر کرو۔ تمھیں کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا۔"

چنانچہ ایک روز شبانہ اکیلی پی آئی اے کے طیارے میں سوار ہو کر لاہور کی طرف پرواز کر گئی۔

شبانہ کا بھائی اسے لینے کراچی پہنچ گیا تھا۔ شبانہ نے اپنے بھائی کو دیکھا تو اس کے صبر کا بندھ ٹوٹ گیا اور وہ بھائی کے ساتھ لگ کر بے اختیار رونے لگی۔

بڑا بھائی عقیل اپنی بہن کے دکھوں سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انھوں نے اپنے کاروبار کی ساکھ اور اپنی خاندانی عزّت کے دیوتا پر اپنی بہن کی زندگی اور اس کے مستقبل کو قربان کر کے ایک ایسے آدمی کے پلّے باندھ دیا ہے جو اسے سکھ پہنچانے کی بجائے اسے مسلسل اذیتیں دے رہا ہے مگر وہ بھی بے بس تھا۔ وہ سوائے خاموش تماشائی بنے رہنے کے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

شبانہ کو اپنے بڑے بھائی سے بھی بڑی محبت تھی۔ ماں باپ کی وفات کے بعد اب عقیل بھائی ہی اس کے باپ کی جگہ تھا وہ اسے اپنا دکھ بتا کر اس کی گھریلو زندگی پر اپنے غم کی چھاؤں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے آج تک اپنے بھائی کو اپنے عذاب کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا تھا وہ ہمیشہ یہی کہتی کہ وہ اپنے گھر میں بڑی خوش ہے۔ شبانہ نے اپنی زندگی کو اس طرح قبول کر لیا تھا۔

"کینیال لاج" میں اپنے کمرے میں آ کر اس کی ویران آنکھیں شیلف میں لگی اپنی کتابوں کو تکنے لگیں جن پر گرد جم گئی تھی کسی نے آج تک کمرے کی اچھی طرح صفائی نہیں کی تھی۔ جس زرد چینی کے گلدان میں وہ گلاب کے پھول سجایا کرتی تھی۔ وہ گرد آلود میز پر ویران ویران اور خالی پڑا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنے کالج گئی اس کی اکثر سہیلیاں تعلیم ختم کر کے اپنے اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ شبانہ کو نجمی کی بہت یاد آئی۔ نجمی کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا جانے وہ اس وقت کہاں ہو گی۔

جب سے نجمی لاہور سے ندیم کے ساتھ شادی کرنے کے خیال سے بھاگی تھی اس کے بعد سے لے کر اب تک شبانہ کو اس کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ شبانہ کار لے کر پبلک لائبریری میں آ گئی۔ لائبریری کی خاموش فضا ویسے ہی پرسکون تھی۔ آخری الماری کے پاس لکڑی کی جافری میں وہ میز اسی طرح لگی تھی جس پر راحیل کو اس نے پہلی مرتبہ دیکھا اور جو وہاں گلاب کا سرخ پھول چھوڑ جایا کرتا تھا۔ اسے راحیل کا یخستہ یونانی چہرہ، بالوں کی سفید لٹ اور پائپ میں سے نکلتا نیلا خوشبودار دھواں یاد آنے لگا۔ وہ خاموشی سے لائبریری سے باہر نکل آئی۔ دوپہر کے بعد وہ نہر کے کنارے

گاڑی لیے کیمپس کے پل کے آگے اس پرانی کچی کوٹھی میں بھی گئی جہاں راحیل اسے ساتھ لے گیا تھا۔ اور جس کے عقبی باغیچے میں انگور کی بیل کے نیچے بیٹھ کر انھوں نے چائے پی تھی۔ کوٹھی ویران پڑی تھی۔ عقبی باغیچہ بھی ویران ہو گیا تھا۔ انگور کی بیل پھیل کر کہیں سے کہیں چلی گئی تھی۔ شبانہ کو ایسے لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ چلتا اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ راحیل ہمیشہ اسی طرح آیا کرتا تھا اس نے پلٹ کر دیکھا مگر وہاں سوائے سوکھے پتوں کے اور کچھ نہیں تھا جنھیں سہ پہر کی خزاں آلود ہوا اپنے ساتھ اڑا رہی تھی۔ شبانہ آزردہ دل ہو کر واپس اپنی کوٹھی "کینیال لاج" میں آ گئی۔ لاہور آ کر شبانہ خوش ہونے کی بجائے اداس ہو گئی تھی۔ وہ لائبریری سے انگریزی ناول نکلوا کر لے آتی اور سارا سارا دن اپنے کمرے میں بند رہ کر ان کے مطالعہ میں غرق رہنے لگی۔ بھائی عقیل کو ان ہی دنوں کاروباری سلسلے میں سلہٹ جانا پڑ گیا۔ مشرقی پاکستان کے حالات فوج کے کنٹرول سنبھالنے کے بعد نارمل ہو گئے تھے۔ مکتی باہنی اور بھارتی تخریب کار بھاگ کر بھارت جا چکے تھے۔ کاروبار پھر سے کھل گئے تھے اور ہر طرف امن وامان تھا۔ بھائی سلہٹ جانے لگا تو شبانہ کو سلہٹ کے چائے کے سرسبز باغات اور نیلے آسمان کے پس منظر میں لہراتے ہوئے ناریل کے درخت یاد آ گئے۔ اس کے کانوں میں مانجھیوں کے مدھر گیت گونجنے لگے۔ اس نے بھائی سے کہا کہ وہ اسے بھی سلہٹ لے جائے شبانہ اس سے پہلے سلہٹ جا چکی تھی۔ وہاں عقیل کے ایک گہرے دوست وزیر آباد کے چوہدری صاحب چائے کا بزنس کرتے تھے اور اپنے بال بچوں کے ساتھ سلہٹ کے مضافات میں چائے کے ایک سرسبز وشاداب باغ میں رہتے تھے، شبانہ کو ان کا چھوٹا سا خوش نما بنگلہ اور وہاں کی پرسکون فضا یاد آنے لگی۔ اس نے سوچا کہ سلہٹ کی فضا میں جا کر وہ بڑی خوش ہو گی۔

عقیل بھائی اپنی دکھی بہن کو اب ہر طرح سے خوش دیکھنا چاہتے تھے چنانچہ وہ شبانہ کو ساتھ لے جانے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے سلہٹ میں چوہدری صاحب کو تار دیدیا کہ وہ شبانہ کے ساتھ آ رہے ہیں۔ ایک روز وہ جہاز میں سوار ہو کر ڈھاکہ کی طرف پرواز کر گئے۔ شبانہ بڑی خوش تھی۔ ڈھاکہ سے انھوں نے چٹاگانگ کی پرواز پکڑی۔ چٹاگانگ سے وہ ریل میں بیٹھ کر سلہٹ آ گئے۔ ریلوے اسٹیشن پر چوہدری صاحب اپنی بیگم کے ساتھ موجود تھے۔ شبانہ کو انھوں نے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار کیا بیگم نے اسے گلے لگا لیا۔ شبانہ کو یوں لگا جیسے وہ غیروں سے نکل کر اپنوں میں آ گئی ہو۔ چوہدری

صاحب کی بیگم اور بڑی لڑکی نے شبانہ کو بتایا کہ فوج کے کنٹرول سنبھالنے سے پہلے مشرقی پاکستان کے حالات انتہائی سنگین صورت اختیار کر گئے تھے۔ ہم لوگ بھی سلہٹ چھوڑ کر ڈھاکہ محمد پور اپنے رشتے داروں کے ہاں چلے گئے تھے مگر پھر فوج حالات کو قابو میں کرنے کے لیے میدان میں آ گئی اور بھارتی تخریب اور مکتی باہنی والے بھاگ گئے۔

شبانہ کی طبیعت اس خوبصورت سرسبز علاقے میں آ کر بے حد خوش ہو گئی تھی۔ وہ چوہدری صاحب کی لڑکی نازی کے ساتھ چائے کے باغات میں لمبی لمبی سیریں کرتی، شام کو دونوں بنگلے کے ٹیرس میں بیٹھ کر چائے پیتیں اور جی بھر کر باتیں کرتیں۔ پھر ٹیپ ریکارڈ پر انگلش اور پنجابی گانے سنتیں۔ عقیل بھائی اس دوران شبانہ سے ملنے ڈھاکہ سے سلہٹ آئے۔ وہ واپس لاہور جا رہے تھے۔ انھوں نے شبانہ کو اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہا۔ تو شبانہ اصرار کر کے وہاں ٹھہر گئی: "بھائی جان! میں یہاں بڑی خوش ہوں..... ابھی میرے امریکہ جانے میں دو مہینے پڑے ہیں..... کچھ روز اور یہاں رہ کر آ جاؤں گی۔"

عقیل بھائی نے بھی کوئی اعتراض نہ کیا وہ اپنی بہن کو خوش دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اگلے مہینے سلہٹ واپس آنے کا وعدہ کر کے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس وقت تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اگلے مہینے یعنی دسمبر ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان پر کیا سانحہ گزرنے والا ہے۔ یہ نومبر ۱۹۷۱ء کا مہینہ تھا شبانہ کو اور مشرقی پاکستان میں رہنے والوں کو بالکل علم نہیں تھا کہ بھارت کے خطرناک عزائم کیا ہیں۔ نومبر کے آخر تک بھارت نے اپنی فوجیں مشرقی پاکستان کی سرحدوں کے ساتھ لا کر کھڑی کر دیں تھیں اور وہ حملہ کرنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ ۴/ دسمبر کے روز دن کے دس بجے شبانہ اپنی سہیلی اور چوہدری صاحب کی بیٹی نازی کے ساتھ بنگلے کے ٹیرس میں بیٹھی کیرم کھیل رہی تھی کہ اچانک فضا میں دو چھوٹے جہاز زناٹے کے ساتھ نمودار ہوئے اور آگے کو نکل گئے۔ یہ انڈین ائیر فورس کے دو ہنٹر جہاز تھے پھر تڑ تڑ گولیوں کی آواز سنائی دی اور چاروں طرف ایک سناٹا چھا گیا۔ لوگ گھروں سے باہر نکل کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے اس کے بعد دو اور ہنٹر جہاز نمودار ہوئے اور سلہٹ شہر کے اوپر گولیاں برسا کر واپس چلے گئے چوہدری صاحب سلہٹ ڈپو میں تھے گھبرائے ہوئے گھر آئے اور بولے کہ حالات کچھ ٹھیک نہیں دکھائی دیتے کوئی پتہ نہیں انڈیا کب مشرقی پاکستان پر حملہ کر دے۔ گھر کے سب لوگ پریشان ہو گئے۔

چوہدری صاحب کی بیگم نے فوراً کہا کہ آپ اسی وقت جا کر جہاز میں سیٹیں بک کروا لیں ہم لاہور چلے جاتے ہیں مگر یہ کام اب اتنا آسان نہیں تھا۔ ائیر پورٹ پر کام کرنے والا بنگالی عملہ بھاگ گیا تھا جہاز کیسے اڑتا۔ شبانہ کے بھائی نے ٹیلی فون کر کے خیریت دریافت کی اور چوہدری صاحب سے کہا وہ لوگ فوراً سلہٹ سے لاہور آ جائیں۔ چوہدری صاحب نے صورتِ حال بتائی تو عقیل پریشان ہو گیا اس نے شبانہ سے بھی بات کی اور اسے تسلی دی کہ فکر نہ کرو سب ٹھیک ہو جائے گا مگر سیاست کاروں اور تخریب کاروں کے ہاتھوں حالات تباہی کے کنارے پر پہنچ چکے تھے اور پھر ۴/ دسمبر کو بھارت نے مشرقی پاکستان پر بارہ ڈویژن فوج کے ساتھ تین طرف سے حملہ کر دیا۔ پہلے ہمارے جانباز جنگلوں، دریاؤں اور دلدلوں میں بے سروسامانی کے عالم میں تخریب کاروں اور مکتی باہنی کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اب دشمن کی پوری بارہ ڈویژن فوج ان کے سامنے تھی مگر وہ سیسہ پلائی دیوار بن کے دشمن کے آگے ڈٹ گئے۔

سلہٹ شہر میں افراتفری پھیل گئی۔ بھارت کی سرحد پر واقع ہونے کی وجہ سے یہاں گولوں اور بموں کے دھماکے صاف سنائی دے رہے تھے۔ چوہدری صاحب نے اپنے بال بچوں اور شبانہ کو لیا اور ویگن میں بیٹھ کر چاٹگانگ کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں سے انھوں نے ٹرین پکڑی اور ڈھاکہ آ گئے ڈھاکہ کے محمد پور میں ان کے ایک دور کے رشتے دار مقیم تھے۔ شبانہ بھی چوہدری صاحب کی فیملی کے ساتھ ڈھاکہ کے محمد پور کے علاقے میں آ گئی۔ چاروں طرف جنگ کی دہشت پھیل ہوئی تھی۔ پاک فوج کے ذرائع مسدود تھے انھیں باہر سے رائفل کی ایک گولی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی وہ بے سروسامانی کے عالم میں صرف جذبے کے بل پر ہر محاذ پر دشمن کے دانت کھٹے کر رہی تھی۔ لاہور سے سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ شبانہ اپنے بھائی کو بھی فون نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے واشنگٹن ظفر کو فون کرنے کی کوشش کی مگر اسے لائن نہ مل سکی۔ ۷/ دسمبر کو ٹیلی فون بھی ڈیڈ ہو گیا۔ ۱۰/ دسمبر کو ڈھاکے کی فضا پر آنے والے خطرات کے سائے منڈلانے لگے تھے۔ شبانہ محمد پور والے مکان میں چوہدری صاحب کی بیگم اور بیٹی نازی کے ساتھ ایک کمرے میں سارا دن بند رہتی۔ طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی تھیں کہ مکتی باہنی والے شہر میں آ گئے ہیں اور پھر ایک روز ڈھاکہ ائیر پورٹ پر دشمن نے اندھا دھند بمباری شروع کر دی۔ زمین ہل رہی تھی۔ کمرے کی کھڑکیاں جھنجھنا رہی تھیں۔ شبانہ آنکھیں بند کیے خدا کو یاد کر

رہی تھی۔ پتہ چلا کہ دشمن نے ڈھاکہ ائیرپورٹ پر کھڑے طیاروں کو تباہ کر دیا۔ غیر بنگالی مسلمان اور اسلام دوست پاکستان سے محبت کرنے والے بنگالی مسلمانوں کے ہونٹ چپ تھے، آنکھیں آسمان کی طرف تھیں اور وہ اللہ سے پاکستان کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے پھر ۱۶/ دسمبر کا منحوس دن آ گیا ڈھاکہ فال ہو گیا۔ میرپور اور محمدپور کی بستیوں پہ موت کا سناٹا چھا گیا۔ چوہدری صاحب نے اسی وقت اپنی فیملی اور شبانہ کو وہاں سے نکالا اور گلشن میں اپنے ایک پارسی دوست کے پاس چلے گئے۔ گلشن ڈھاکہ کا ایک فیشن ایبل علاقہ تھا اور یہاں بڑی خوبصورت کوٹھیاں تھیں اور کاروباری اور سفارتخانوں کے آفیسرز رہائش پذیر تھے۔ چوہدری صاحب کا خیال تھا کہ یہاں وہ محفوظ ہوں گے لیکن ایک دن مکتی باہنی والے ان کے پارسی دوست کی کوٹھی پہ بھی آ گئے۔ پارسی دوست کا نام ہرمز تھا اور وہ ڈھاکہ میں شپنگ بزنس کرتا تھا۔ اس کی کوٹھی میں ایک تہہ خانہ بھی تھا اس نے چوہدری صاحب کی فیملی کو تہہ خانے میں چھپا دیا۔ یہ تہہ خانہ اس طریقے سے بنایا گیا تھا کہ اس کی سیڑھیوں میں دروازہ کمرے کے فرش کا چوکھٹا اٹھا کر کھلتا تھا۔ چوکھٹا جب فرش پہ گرا دیا جاتا تو کسی کو پتہ نہیں چل سکتا تھا کہ اس فرش کے نیچے تہ خانہ بھی ہے ہرمز جی نے اوپر قالین بچھا دیا تھا اس تہ خانے میں تازہ ہوا ایک خاص پائپ کے ذریعے پہنچائی جاتی تھی۔ مکتی باہنی والے دندناتے ہوئے کوٹھی کے اندر آ گئے۔ آگے آگے ایک مکتی باہنی فوج کا افسر تھا جس نے اسٹین گن اٹھا رکھی تھی۔

اس نے ہرمز جی سے کہا: ”ہم جانتا ہے تم پارسی ہو۔۔۔ ہم تم کو کچھ نہیں کہے گا پر ہمیں خبر ملی ہے کہ تمھارے ہاں پاکستانی چھپے ہوئے ہیں انھیں ہمارے حوالے کر دو نہیں تو ہم تمھارے بنگلے کو آگ لگا دیں گے۔“

ہرمز جی نے کہا: ”بھائی اگر میرے پاس کوئی پاکستانی چھپا ہوتا تو میں اسے ضرور تمھارے حوالے کر دیتا۔۔۔ لیکن یقین کرو یہاں سوائے میرے اور میری بیوی کے اور کوئی نہیں ہے تم خود اندر آ کر تلاشی لے سکتے ہو۔“ اور ہرمز جی پیچھے ہٹ گئے مکتی باہنی والے کوٹھی میں داخل ہو کر کمروں میں گھس گئے انھوں نے ایک ایک جگہ چھان ماری، چھت پر بھی گئے، اسٹور دیکھا۔۔۔۔ مکتی باہنی کا افسر فرش پر عین اس جگہ کھڑا تھا جس کے نیچے چوہدری صاحب ان کے بیوی بچے اور شبانہ سہمی ہوئی بیٹھی

تھی۔ مکتی باہنی والا بولا: ”ہم جانتا ہے لیکن اگر تمھارے پاس کوئی پاکستانی آیا تو ہمیں فوراً خبر کرنا۔۔۔۔ اس وقت تمھارے پاس کتنا روپیہ ہے۔“

ہرمز جی نے جیب سے بٹوہ نکال کر اس مکتی باہنی والے کو دے دیا۔ اس بٹوے میں ڈیڑھ ہزار کے قریب روپے تھے۔ مکتی باہنی والے چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نیک دل پارسی۔۔۔۔ ہرمز جی نے تہہ خانے میں جا کر چوہدری صاحب، ان کی فیملی اور شبانہ کو تمام واقعات بتائے اور کہا کہ فکر مت کریں جب تک میں زندہ ہوں کوئی ان تک نہیں پہنچ سکے گا لیکن دوسری طرف کسی نے مکتی باہنی کے ایک ہندو کیپٹن کو مخبری کر دی کہ گلشن کے علاقے میں پارسی سیٹھ ہرمز جی کی کوٹھی کے تہہ خانے میں ایک پاکستانی فیملی چھپی ہوئی ہے۔ مخبر ہرمز جی کا سابقہ ہندو بنگالی ملازم تھا جو تہہ خانے کے خفیہ دروازے سے واقف تھا چنانچہ رات کے گیارہ بجے کے قریب مکتی باہنی کا ہندو کیپٹن اپنے غنڈوں کے ساتھ ہرمز جی کی کوٹھی میں پہنچ گیا۔ اس نے کوٹھی میں داخل ہوتے ہی فائرنگ شروع کر دی۔ ہرمز جی کے مسلمان بنگالی نوکر نے مکتی باہنی والوں کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ کوٹھی میں کوئی پاکستانی نہیں چھپا ہوا۔

ہندو کیپٹن نے مسلمان بنگالی کو دھکا دے کر ایک طرف گرایا اور کڑک کر بولا: ”میں جانتا ہوں اس پارسی نے پاکستانیوں کو تہہ خانے میں چھپا رکھا ہے۔“ ہرمز جی کوٹھی کے اندر یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے جونہی انھوں نے یہ بات سنی بھاگ کر نیچے ڈرائنگ روم میں گئے۔ قالین اٹھا کر لکڑی کا تختہ ہٹایا اور چوہدری صاحب سے کہا: ”جلدی سے باہر نکل آؤ۔۔۔۔ مکتی باہنی کو اس ٹھکانے کا پتہ چل گیا ہے۔“

چوہدری صاحب، ان کی بیگم، بیٹی نازی اور شبانہ گھبراہٹ میں باہر نکل آئے۔ ہرمز جی انھیں کوٹھی کے پچھلے کمرے میں لے گئے اور دروازہ کھول کر بولے: ”میں تمھارے لیے یہی کر سکتا تھا۔۔۔ اب اپنی جانیں بچانے کے لیے اندھیرے میں ائیرپورٹ کی طرف نکل جاؤ۔۔۔۔ وہاں انڈین فوج شاید تمھیں قیدی بنا لے۔“

مکتی باہنی والے ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ چوہدری صاحب نے اپنی بیگم، بیٹی نازی اور شبانہ کو ساتھ لیا اور اندھیری رات میں سامنے والی گراؤنڈ کی طرف دوڑ پڑے۔ بے چاری گھریلو

عورتیں آخر کب تک دوڑ سکتی تھیں پھر بھی موت کے خوف سے وہ گراؤنڈ پار کر گئیں۔ شبانہ کا دوپٹہ راستے میں کہیں گر گیا تھا اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے اور آگے کیا ہو گا۔ لاہور اسے کروڑوں میل دور لگ رہا تھا۔
جونہی وہ سڑک پر آئے سامنے کی جانب سے ایک فوجی جیپ نمودار ہوئی اس میں مکتی باہنی والے سوار تھے۔ جیپ میں سے ان پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ شبانہ نے ایک سوکھے نالے میں چھلانگ لگا دی وہ جدھر منہ اٹھا ادھر کو بھاگنے لگی اسے چوہدری صاحب اور ان کی فیملی کی اب کوئی خبر نہیں تھی کہ ان پر کیا بیتی۔ وہ اندھا دھند بھاگی جا رہی تھی اپنے پیچھے اسے نازی کی دلدوز چیخ سنائی دی۔ شبانہ بھاگتی چلی گئی۔ یہ برساتی نالہ تھا اور سطح زمین سے چھ سات فٹ نیچے تھا۔ نالے میں پانی نہیں تھا اونچی اونچی گھاس اگی تھی ایک جگہ وہ کسی شے سے ٹکرا کر گر پڑی وہ اٹھی اور دوبارہ بھاگنا شروع کر دیا۔ نالہ آگے جا کر دائیں جانب مڑ گیا پھر اندھیرے میں شبانہ نے دور ہلکی سی روشنی دیکھی اس کا سانس پھول رہا تھا اب اس میں دوڑنے کی ہمت نہیں تھی۔ روشنی سرخ تھی اور یہ ایک ٹرک کی پچھلی بتیوں کی روشنی تھی۔ ٹرک نالے کے باہر سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ شبانہ ٹرک کے قریب نیچے نالے میں اونچی گھاس کی اوٹ میں بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ ٹرک پر بڑی بڑی گانٹھیں لدی ہوئی تھیں۔ شبانہ کے کان میں ہرمزجی کا جملہ گونج اٹھا کہ ائیرپورٹ پر انڈین فوج ہو گی وہ تمھیں قیدی بنا لے گی۔ شبانہ مکتی باہنی والوں کی بربریت سے بچنا چاہتی تھی ان کی درندگی کے واقعات اس نے بہت سنے تھے۔ اس نے سوچا شاید یہ ٹرک انڈین ملٹری کا ہے اسے اس میں چھپ کر اپنی عزت بچا لینی چاہیئے مگر انڈین فوجی بھی اس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کر سکتے تھے۔

شبانہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اسے پیچھے فائرنگ کی آواز سنائی دی وہ گھبرا کر نالے سے باہر نکلی اور ٹرک کے پیچھے اس کے اندر کود گئی۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی بڑی گانٹھوں کے پیچھے چھپا لیا۔ ٹرک کا انجن بند تھا خدا جانے اس کا ڈرائیور وغیرہ کہاں چلا گیا تھا۔ شبانہ سہمی ہوئی چھپی بیٹھی تھی۔ ایک گاڑی فائرنگ کے شور کے ساتھ ٹرک کے قریب سے گزر گئی۔ گاڑی میں سے بلند ہوتی کسی عورت کی چیخ بھی شبانہ نے سنی تھی۔ اس کا دل خوف سے لرز اٹھا وہ آنکھیں بند کر کے خدا کے حضور دعائیں مانگنے لگی۔ ایک ہی پل میں وہ گھر سے بے گھر ہو گئی تھی اور اس کا کوئی پرسان حال

نہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو بڑی بڑی گانٹھوں کے پیچھے اچھی طرح سے چھپا لیا تھا۔ ان گانٹھوں میں پٹ سن یا خدا جانے کیا بھرا ہوا تھا۔ شبانہ کو یہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی اسے اپنی عزت اور جان بچانے کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ ایک بات اس نے اپنے دل میں طے کر رکھی تھی کہ اگر اس کی عزت خطرے میں پڑ گئی تو وہ خودکشی کر لے گی۔ دو آدمی بنگلہ میں باتیں کرتے ٹرک کے قریب آ رہے تھے۔ شبانہ بنگلہ زبان نہیں جانتی تھی وہ سانس روکے ٹرک میں گانٹھوں کے پیچھے دبکی بیٹھی رہی پھر کسی نے ٹرک کے پیچھے آ کر ڈرائیور کو بنگلہ میں آواز دی اور تیز تیز قدم اٹھاتا آگے چلا گیا پھر ٹرک کی کھڑکی کے دروازے کے بند ہونے کی آواز آئی۔ انجن اسٹارٹ ہوا اور ٹرک نے سڑک پر ایک طرف رینگنا شروع کر دیا۔ شبانہ کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک اسے کہاں لے جا رہا ہے لیکن کم از کم وہ اس وقت مکتی باہنی والوں سے اپنی عزت اور جان بچانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ ٹرک سڑک کے ایک طرف نپی تلی رفتار کے ساتھ چلا جا رہا تھا شبانہ آنکھیں بند کر کے خدا سے دعا مانگنے لگی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ٹرک کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا۔

- - - - -

ٹرک پوری رفتار سے سڑک پر جا رہا تھا۔

شبانہ پٹ سن کی گانٹھوں کے بیچ میں ایک طرف دبکی ہوئی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ ٹرک کدھر جا رہا ہے اور اگلی سیٹ پر جو دو آدمی بیٹھے ہیں وہ کون ہیں۔ اسے چوہدری صاحب کی فیملی کا خیال آ رہا تھا جن کے ساتھ وہ گلشن کی ایک کوٹھی میں چھپی ہوئی تھی اور جب باہر نکلی تو مکتی باہنی کے آدمیوں نے حملہ کر دیا تھا اور جس کا جدھر منہ اٹھا بھاگ گیا تھا۔ شبانہ کو نالے کے پار رات کے اندھیرے میں یہ ٹرک نظر آیا اور وہ چھپ کر اس میں بیٹھ گئی تھی اور تھوڑی دیر بعد ٹرک چل پڑا تھا۔ ڈھاکہ میں دشمن کی فوج داخل ہو چکی تھی اور مکتی باہنی والے گھروں کو لوٹتے اور لوگوں کو قتل کرتے پھرتے تھے۔ شبانہ کو حالات کی سنگینی کا علم تھا۔ لیکن وہ بے یار و مددگار تھی۔ یہ سوچ کر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ وہ کہاں جا رہی ہے اور اب اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ جہاں ٹرک رکے گا وہ اتر کر کسی طرف بھاگ جائے گی اور پھر کسی مسلمان بنگالی کے گھر میں پناہ لینے کی کوشش کرے گی۔

ٹرک کی رفتار کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ سڑک پر ایک ہی رفتار سے چلا جا رہا تھا۔ شبانہ کو اوپر آسمان پر ستارے نظر آ رہے تھے اسے راحیل کا خیال آنے لگا وہ کسی بھی جگہ اچانک نمودار ہو جایا کرتا ہے کاش وہ یہاں بھی آ جائے اور شبانہ کو اس جہنم سے نکال کر اپنے ساتھ لاہور لے جائے۔ لاہور شبانہ کو سات سمندر پار کا کوئی شہر لگ رہا تھا جہاں تک پہنچنے کے لیے اسے شعلوں میں بھڑکتے ہوئے سمندروں کو عبور کرنا تھا۔

شبانہ ٹرک میں ایسی جگہ بیٹھی تھی جہاں اس کی دونوں جانب اور آگے پیچھے پٹ سن کی بڑی بڑی

گانٹھیں پڑی تھیں۔ صرف ایک طرف تھوڑی سی جگہ تھی جس میں سے گھس کر وہ اندر آ گئی تھی۔ اتنا اسے احساس ہو گیا تھا کہ ٹرک ڈھاکہ شہر سے نکل آیا ہے اور اب کسی دوسرے شہر کی طرف جا رہا ہے۔ ساری رات ٹرک اسی طرح چلتا رہا۔ پھر آسمان پر پو پھٹنے لگی اور ستاروں کی چمک ماند پڑنے لگی۔ ٹرک ایک طرف کو گھوم گیا۔ اب وہ ایک ایسی سڑک پر جا رہا تھا جو غیر ہموار تھی۔ ٹرک ہچکولے کھا رہا تھا اور اس کی رفتار ہلکی ہو گئی تھی۔ مگر اتنی بھی کم نہیں تھی کہ شبانہ ٹرک میں سے چھلانگ لگا سکتی۔ وہ کھسکتی ہوئی پٹ سن کی گانٹھوں میں سے باہر نکلی اور پیچھے جاتی سڑک کو دیکھا۔ پچھلے پہر کی ہلکی نیلی روشنی میں اسے چھوٹی سڑک کی دونوں جانب ناریل کے اونچے اونچے جھکے ہوئے درخت نظر آئے۔ ٹھنڈی ہواؤں میں رطوبت محسوس ہو رہی تھی۔ دریا قریب ہی تھا اور ٹرک اس کے کنارے کنارے ویران جنگل میں جا رہا تھا۔ ٹرک کی رفتار مزید کم ہو گئی۔ اب موقع تھا۔ شبانہ ٹرک کے پیچھے آ گئی۔ سڑک ویران تھی اور منہ اندھیرے کی دھندلی روشنی میں بل کھاتے سانپ کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔ شبانہ کو چھلانگ لگاتے خوف سا محسوس ہو رہا تھا اس نے پہلے کبھی کسی چلتے ٹرک سے اس طرح چھلانگ نہیں لگائی تھی۔ اگرچہ ٹرک کی رفتار کم ہو گئی تھی لیکن اس بات کا احتمال تھا کہ شبانہ سڑک پر گر پڑے اور زخمی ہو جائے۔ وہ ٹرک کی رفتار مزید کم ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ لگتا تھا یہ کوئی جنگل ہے۔ صبح کی دھیمی دھیمی سفیدی رات کی تاریکی پر غالب آنے لگی تھی۔ اب درخت سڑک اور آس پاس کا منظر شبانہ کو بخوبی دکھائی دینے لگا تھا۔ ٹرک کچی سڑک پر دائیں بائیں مڑتے ہوئے چلا جا رہا تھا ایک جگہ وہ ایک دھچکے کے ساتھ رک گیا۔ شاید وہ کسی گڑھے میں پھنس گیا تھا۔ شبانہ نے موقع غنیمت جان کر باہر چھلانگ لگا دی وہ سڑک پر گری جلدی سے اٹھی اور کنارے کی جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ٹرک میں سے ڈرائیور کو باہر نکلتے دیکھ لیا تھا۔ اگر وہ کسی طرف دوڑتی تو پکڑی جا سکتی تھی۔ وہ وہیں سانس روکے بیٹھی رہی۔ ڈرائیور اور اس کا ساتھی نیچے بیٹھ کر ٹرک کے پہیے کو جھک کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے بنگلہ زبان میں کچھ کہا اور واپس ٹرک میں جا کر بیٹھ گئے۔ ٹرک کا انجن شور مچانے لگا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد ٹرک کا پہیہ گڑھے میں سے نکل آیا اور ٹرک جنگل میں آگے چل پڑا۔ جب ٹرک شبانہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے جھاڑیوں میں سے نکل کر جائزہ لیا۔ چاروں طرف ناریل اور سنبل

کے درخت ہی درخت پھیلے ہوئے تھے ان کے بیچ میں اُگی ہوئی جنگلی جھاڑیاں دور تک چلی گئی تھیں مشرق کی طرف آسمان پر طلوع ہوتے سورج کی گولڈن روشنی دم بہ دم پھیلتی جا رہی تھی شبانہ نے اللہ کا نام لے کر طلوع ہوتے سورج کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ دیکھتے دیکھتے درختوں میں صبح کی سنہری روشنی پھیل گئی۔ جنگلی جھاڑیاں شبانہ کے کندھوں تک آتی تھیں۔ وہ سہمی ہوئی چل رہی تھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کونسی جگہ ہے اور راتوں رات وہ ڈھاکہ سے نکل کر کہاں آ گئی ہے۔ ایک جگہ درختوں کے درمیان کھلی جگہ پر اُسے ایک جھونپڑی نظر آئی جس کے پیچھے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ ایک کتا اچانک بھونکنے لگا۔ اس نے کسی اجنبی کی بو پا لی تھی شبانہ نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا۔ وہ جھونپڑی سے آگے نکل جانا چاہتی تھی۔ اسے ایک عورت کی آواز سنائی دی۔ شاید وہ کتے کو چپ کرا رہی تھی۔

شبانہ نے شلوار قمیض پہن رکھی تھی۔ یہ پاکستانی لباس تھا اور خطرے کا نشان تھا۔ مگر وہ اپنا لباس تبدیل نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جھونپڑی سے چند قدموں کے فاصلے پر ایک جھاڑی کے عقب سے باہر نکلی تو اچانک ایک ادھیڑ عمر کی بنگالی عورت اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ اس نے سفید سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ پاؤں سے ننگی تھی۔ ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں ترکاری پکڑی ہوئی تھی۔

اس نے شبانہ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔
"گھبراؤ نہیں بیٹی میں جانتی ہوں تم پاکستانی ہو ادھر مکتی باہنی والے تمھیں پکڑ لیں گے میرے ساتھ آ جاؤ۔ میں تمھیں چھپا لوں گی۔"

شبانہ کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے دل خوف سے سہما ہوا تھا۔ عورت کے جملے اس کے لیے سکون کا پیغام لائے۔ اسے یوں لگا جیسے اس قتل و غارت گری کے ماحول میں کوئی ہمدرد ساتھی مل گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بنگالی عورت نے آگے بڑھ کر شبانہ کو اپنے گلے سے لگا لیا۔ اسے پیار کیا اور اپنے ساتھ اس جھونپڑی کی طرف لے گئی جس سے بچ کر شبانہ نے آگے نکلنے کی کوشش کی تھی۔ درخت سے بندھا ہوا کتا اب بھی بھونکے جا رہا تھا۔ عورت نے اسے بنگلہ میں ڈانٹا۔ کتا خاموش ہو کر بیٹھ گیا۔ جھونپڑی کی چھت ناریل کی چھال کی تھی۔ دروازہ بانس کا تھا۔ باہر کچھ

برتن بکھرے پڑے تھے۔ بنگالی عورت نے شبانہ کو جھونپڑی کے اندر لے جا کر چارپائی پر بٹھا دیا۔
اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور کہا "گھبراؤ نہیں بیٹی شہروں میں جو کچھ ہو رہا ہے ہمیں معلوم ہے یہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ بتاؤ تمھارا نام کیا ہے اور تم کہاں جانا چاہتی ہو؟" شبانہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے بنگالی عورت کو اپنا نام بتایا اور کہا کہ اسے مشرقی پاکستان سے نکال کر کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا جائے۔
بنگالی عورت تسلّی آمیز لہجے میں کہنے لگی "فکر کیوں کرتی ہو بیٹی میرا مالک جنگل میں گیا ہوا ہے وہ بڑا نیک آدمی ہے وہ تمھیں یہاں سے نکال کر نیپال کی سرحد پار کرا دے گا۔ پہلے بھی وہ ایک عورت اور اس کے خاوند کو نیپال پہنچا چکا ہے۔ نیپال جا کر تم بالکل محفوظ ہو گی۔"
شبانہ کو اس بنگالی عورت کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا۔ ان باتوں میں اسے خلوص اور انسانی ہمدردی کی خوشبو آ رہی تھی۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنی عزت بچا کر محفوظ جگہ پر آ گئی ہے۔ اس نے اٹھ کر بنگالی عورت کے ہاتھ چوم لیے اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بنگالی عورت نے اسے ایک بار پھر اپنے گلے سے لگا کر تسلی دی اور یہ کہہ کر جھونپڑی سے باہر نکل گئی کہ میں تمھارے لیے کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔ شبانہ چارپائی پر بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کرنے لگی۔ تھوڑی دیر میں بنگالی عورت المونیم کی تھالی میں اُبلے ہوئے چاول اور گلاس میں پانی لے آئی۔ شبانہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے چاول کھا لیے اور چائے بھی پی جو سخت کڑوی تھی۔ اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی۔
بنگالی عورت اٹھتے ہوئے بولی "میرا آدمی آ گیا ہے میں اسے تمھارے بارے میں بتاتی ہوں وہ تمھیں آج ہی نیپال کی سرحد پار کرا دے گا۔"
بنگالی عورت باہر چلی گئی جھونپڑی کا بانس کا دروازہ آدھا کھلا تھا۔ باہر سے بنگالی عورت کے کسی مرد سے بنگلہ زبان میں باتیں کرنے کی آواز آنے لگی۔ شبانہ چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر ایک دبلا پتلا بنگالی جس نے صرف ایک دھوتی اور بنیان پہن رکھی تھی بنگالی عورت کے ساتھ جھونپڑی میں داخل ہوا اور سلام کر کے شبانہ کے سامنے زمین پر بیٹھ گیا۔
"بیٹی! میری بیوی نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے تم نے اچھا کیا جو ہمارے پاس چلی آئی۔ شہروں

میں غدر مچا ہوا ہے مکتی باہنی والے عورتوں بچوں اور مردوں سب کو قتل کر رہے ہیں مگر یہاں تمھیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی طرح آج کا دن گزار لو رات کو میں تمھیں ساتھ لے کر نیپال کی سرحد کی طرف چل دوں گا۔ مجھے سارے راستوں کا پتہ ہے میں نے پہلے بھی ایک پاکستانی میاں بیوی کو نیپال پہنچایا ہے۔ اب تم آرام کرو مگر یہ کپڑے بدل کر ساڑھی پہن لو تو اچھا ہے۔"

پھر اس نے بنگالی عورت کی طرف دیکھ کر کہا کہ بچی کو ساڑھی پہنا دو۔ وہ باہر چلا گیا۔۔۔ بنگالی عورت نے ٹین کے ایک صندوق میں سے سبز رنگ کی سوتی ساڑھی نکال کر شبانہ کو پہنا دی اس کے بالوں کا بھی سر کے پیچھے بنگالی عورتوں کی طرح جوڑا بنا دیا اور کہا کہ وہ جھونپڑی سے باہر نہ نکلے کیونکہ ہو سکتا ہے قبیلے کا کوئی آدمی اسے دیکھ لے اور پھر مکتی باہنی والوں کو جا کر خبر کر دے۔ شبانہ سارا دن جھونپڑی کے اندر ہی رہی۔ جب سورج غروب ہو گیا اور جنگل میں شام کے سرمئی سائے اترنے لگے، تو بنگالی عورت کا دبلا پتلا خاوند ایک بیل گاڑی لے کر آ گیا۔ گاڑی کے اوپر بانس کی محرابی چھت پڑی تھی اور آگے ایک مریل سا بیل جتا ہوا تھا۔ اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ گاڑی میں تھوڑے چاول ہنڈیا میں ڈال کر رکھ دے۔ پھر اس کی بیوی نے چاول گاڑی میں رکھ دیئے اور شبانہ کو سر پر لینے کے لئے دھوتی دی۔ شبانہ نے چارخانے دار سوتی دھوتی اپنے سر پر اوڑھ لی اور چاول والی ہنڈیا کے پاس گاڑی میں ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ بنگالی گاڑی کی گدی پر بیٹھ گیا۔ اور بیل گاڑی جنگل میں ایک طرف درختوں میں چل پڑی۔ شبانہ کو اس نے بتایا تھا کہ نیپال کی سرحد پر وہ دو دن میں پہنچیں گے اور ایک رات انھیں جنگل میں گزارنی ہو گی۔ شبانہ کے لیے یہ ساری مسافتیں اور راستے اجنبی تھے۔ اس بنگالی نے اپنے آپ کو مسلمان کہا تھا اور شبانہ نے اس پر اعتماد کر لیا تھا۔ بیل گاڑی کے نیچے لالٹین لٹک رہی تھی۔ جس کی ہلکی ہلکی روشنی میں وہ جنگل کے پرپیچ راستوں پر گزرتی چلی جا رہی تھی۔ بنگالی مرد کے مطابق رات کو وہ اس لیے سفر پر نکلا ہے کہ آس پاس مکتی باہنی والے پھر رہے ہیں۔ دن کے وقت انھیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دو گھنٹے تک گاڑی لگاتار جنگل میں چلتی رہی۔ گاڑی کی رفتار بہت دھیمی تھی اور جنگل کی کچی پگڈنڈیوں پر وہ ہچکولے کھاتی جا رہی تھی۔

شبانہ بیل گاڑی کے اندر ایک جانب سمٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ گاڑی کے نیچے جو لالٹین لٹکی ہوئی

تھی اس کی دھیمی روشنی پیچھے کی جانب پگڈنڈی پر پڑ رہی تھی۔ اس پگڈنڈی پر شبانہ کو سوائے اونچی اونچی جھاڑیوں کے اندھیری رات میں اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیل گاڑی اب اونچے نیچے راستوں پر سے گزرنے لگی۔ راستے میں ندی نالوں کے دو تین پل بھی آئے۔ یہ بانس کے بنے ہوئے تھے۔ ایک جگہ پہنچ کر اس بنگالی نے گاڑی کو ایک دم سے روک دیا۔ جلدی سے نیچے اتر کر گاڑی کے نیچے جلتی لالٹین کو بجھا دیا اور شبانہ سے کہا "آگے مجھے خطرہ لگتا ہے۔ مگر تم فکر نہ کرو یہاں سے تھوڑی دور دریا کے کنارے میرا ایک دوست رہتا ہے میرا خیال ہے ہم تھوڑی دیر کے لیے وہاں رک جاتے ہیں۔"

بنگالی نے گاڑی کو جنگل میں ایک طرف موڑ دیا۔ شبانہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ اعتراض کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی اسے اپنے اس بنگالی محسن پر پورا بھروسہ تھا۔ بیل گاڑی جھاڑیوں کے بیچ ایسی جگہ چل رہی تھی جہاں کوئی باقاعدہ پگڈنڈی نہیں تھی۔ کبھی گاڑی ڈھلان اترنے لگتی اور کبھی چڑھائی چڑھنے لگتی۔ اندھیرے کی وجہ سے اب شبانہ کو باہر سوائے درختوں، جھاڑیوں، تاریک ہیولوں کے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ بیل گاڑی ہموار زمین پر آتے ہی دائیں جانب گھوم گئی۔ یہاں شبانہ کو ایسی ہوا محسوس ہوئی جس میں دریا کی ٹھنڈک تھی۔ دریا قریب آ گیا تھا۔ بنگالی نے گاڑی ایک جگہ تاڑ کے درختوں میں کھڑی کر دی اور شبانہ سے کہا کہ وہ اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ شبانہ بیل گاڑی سے اتر کر بنگالی کے پیچھے پیچھے اونچی گھاس میں چلنے لگی۔ گھاس کے چھوٹے سے ٹکڑے سے نکلنے کے بعد شبانہ کو سامنے دو تین جھگیاں اندھیرے میں سایوں کی طرح دکھائی دیں۔

بنگالی نے ان جھگیوں کی طرف اشارہ کر کے آہستہ سے کہا "یہاں میرا دوست اپنے بال بچوں کے ساتھ رہتا ہے وہ بھی مسلمان ہے بڑا نیک آدمی ہے۔ دریا میں مچھلیاں پکڑ کر گاؤں میں لے جا کر بیچتا ہے آؤ میرے ساتھ۔"

وہ جھگیوں کی طرف چلنے لگے۔ وہاں کوئی روشنی نہیں تھی۔ ایک جھگی سے [illegible] بنگالی نے شبانہ کو درخت کے پاس بٹھا دیا اور بولا "میں اپنے دوست سے جا کر پہلے بات [illegible] ہوں، تم اسی جگہ بیٹھی رہنا۔"

بنگالی جھگی کے پیچھے کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد جھگی میں لالٹین کی روشنی ہو گئی۔ بنگالی جھگی کے پیچھے سے نکل کر شبانہ کی طرف بڑھا قریب آ کر بولا "سب ٹھیک ہے میرا دوست اور اس کی بیوی تم سے مل کر بہت خوش ہو گی۔ یہاں ہم باقی رات گزاریں گے صبح میرا دوست ہمارے ساتھ دریا پار تک چلے گا۔"

وہ شبانہ کو لے کر جھگی میں آ گیا۔ اس جھونپڑی کے اندر لالٹین جل رہی تھی۔ دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ ایک پر ایک بھارے بدن والی بنگالی عورت اور دوسری چارپائی پر ایک گنجے سر والا بنگالی مرد بنیان دھوتی پہنے بیٹھا تھا کونے میں بانس کے ساتھ لالٹین جل رہی تھی۔ شبانہ کو دیکھ کر گنجے بنگالی نے اسے مسلمانوں کی طرح سلام کیا اور اپنی بیوی کا تعارف کرایا "یہ میری گھر والی چمپا ہے۔ آؤ یہاں بیٹھو بیٹی ہمارے بچے شہر گئے ہوئے ہیں تم ساتھ والی جھگی میں جا کر سو جاؤ۔ صبح ہم تمھیں اپنے ساتھ دریا پار کرائیں گے۔"

اس کی بیوی چمپا چارپائی سے اٹھی، شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس کے ماتھے کو چوما اور بولی "میرے ساتھ آؤ بیٹی۔"

وہ اسے ساتھ والی جھونپڑی میں لے گئی جہاں صرف بانس کی ایک چارپائی ہی بچھی ہوئی تھی چمپا نے شبانہ کو ایک چادر دی اور کہا کہ وہ سو جائے۔ چمپا جھونپڑی کا بانس کا دروازہ بند کر کے چلی گئی۔ شبانہ نے چادر اوڑھ لی۔ جھونپڑی میں اندھیرا تھا۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا وہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ وہ دوبارہ لاہور پہنچ بھی سکے گی کہ نہیں۔ جھونپڑی میں مچھر بھنبھنا رہے تھے۔ شبانہ کو نیند بالکل نہیں آ رہی تھی۔ اس کا ذہن پریشان خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ ہونٹ بار بار خشک ہو جاتے تھے۔ نیند کوسوں دور تھی۔ مچھروں سے بچنے کے لیے وہ اچھی طرح چادر اوڑھ کر چارپائی پر لیٹ گئی۔ ابھی اسے لیٹے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اسے جھونپڑی کے باہر تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ اس نے چادر منہ پر سے اتار دی اور اندھیرے میں جھونپڑی کے دروازے پر نظریں گاڑ دیں۔

دروازہ کھلا اسے پہلے والے بنگالی کی آواز سنائی دی "بیٹی! جلدی سے باہر آ جاؤ یہاں خطرہ ہے۔ ہم اسی وقت دریا پار کریں گے۔"

شبانہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ چادر پھینک کر جھونپڑی سے باہر نکل آئی۔ باہر دوسرا بنگالی بھی کھڑا تھا اس نے شبانہ کو شفقت آمیز لہجے میں تسلی دی اور کہا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹی۔ میرے آدمی نے ابھی آ کر خبر دی ہے کہ جنگل میں کچھ مکتی باہنی والے پاکستانی عورتوں کی تلاش میں داخل ہو گئے ہیں اس لیے بہتر یہی ہے کہ ہم اسی وقت دریا پار کر جائیں۔"

شبانہ اندھیرے میں خوفزدہ آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ دونوں بنگالیوں نے شبانہ کو ساتھ لیا اور پیدل ہی جنگل میں ایک طرف چلنے لگے۔

کچھ دور چلنے کے بعد دریا کا کنارا آ گیا۔ دریا کا پاٹ زیادہ چوڑا نہیں تھا اور دوسرے کنارے کے درختوں کے سیاہ جھنڈ نظر آ رہے تھے کنارے پر ایک گول قبر ایسی چھت والی کشتی کھڑی تھی۔ شبانہ ان آدمیوں کے ساتھ اس کشتی میں چھت کے نیچے بیٹھ گئی۔ وہ چپو چلانے لگے۔ کشتی کنارے سے دور ہٹتی ہوئی دریا کے وسط میں آ کر مشرق کی طرف چلنے لگی۔ شبانہ چھت کے نیچے ایک طرف ناریل کے ڈھیر کے پاس گھٹنے سینے سے لگائے سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ حالات کے دھارے پر بہی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی قوت مفلوج ہو گئی ہے اس نے اپنا آپ ان آدمیوں کے حوالے کر دیا تھا۔ جدھر وہ اسے لیے جا رہے تھے وہ چلی جا رہی تھی۔ کشتی کی رفتار تیز تھی۔ کیونکہ وہ دریا کے بہاؤ کے رخ پر چل رہی تھی، شبانہ نے دھوتی سے اپنا سر ڈھانپ رکھا تھا۔ جانے کتنی دیر تک کشتی دریا میں بہتی چلی گئی۔ پھر شبانہ نے کسی اسٹیمر کے انجن کی قریب آتی آواز سنی۔ پہلے والا بنگالی چپو چھوڑ کر چھت کے نیچے آ گیا۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا تھا کہنے لگا "شاید بھارتی نیوی کی کوئی گشتی کشتی آ رہی ہے۔ تم اس ترپال کے نیچے چھپ جاؤ۔ خبردار آواز مت نکالنا نہیں تو انڈین فوجی ہم سب کو پکڑ کر لے جائیں گے۔"

قریب ہی ایک ترپال پڑی تھی۔ شبانہ کا حلق دہشت سے خشک ہو گیا۔ اس نے ترپال اٹھا کر اپنے اوپر ڈال لی اور کونے میں ایک ڈھیر کی طرح پڑ گئی۔ بنگالی کشتی کے سامنے رخ پر جا کر اپنے دوسرے ساتھی کے پاس بیٹھ گیا۔ انھوں نے ملاحوں کا ایک بنگلہ گیت گانا شروع کر دیا۔ اسٹیمر کی آواز بہت قریب آ گئی تھی۔ پھر انڈین نیوی کا ایک چھوٹا اسٹیمر کشتی کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔ اسٹیمر کے اوپر سے ایک بنگالی سیلر نے بلند آواز میں پوچھا "تم کون ہو اور ادھر

کہاں جا رہے ہو؟"

دوسرے بنگالی نے ہاتھ باندھ کر کہا: "مہاراج مچھلیاں پکڑنے دوسرے کنارے پر جا رہے ہیں۔"

اسٹیمر والے بنگالی ملاح نے کہا: "ہمارا حصہ کہاں ہے؟"

دوسرے بنگالی نے فوراً کہا: "مہاراج! آپ کا حصہ میرے پاس رکھا ہوا ہے۔"

اسٹیمر کشتی کے قریب آ گئی۔ دوسرے گنجے بنگالی نے ایک تھیلی اسٹیمر کے اوپر اچھال دی۔ اس میں پانچ سو کے نوٹ تھے۔ اسٹیمر والے سیلر نے تھیلی میں سے نوٹ نکال کر گنے اور کہا۔

"چلو بھاگ جاؤ یہاں سے۔"

اس کے ساتھ ہی اسٹیمر پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ ساری گفتگو بنگلہ میں ہوئی تھی جو شبانہ کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ ترپال کے نیچے پسینے میں تر اور سہمی ہوئی بیٹھی یہ آوازیں سن رہی تھی۔

جب اسٹیمر دور چلا گیا تو گنجے بنگالی نے چھت کے نیچے آ کر شبانہ کے اوپر سے ترپال ہٹا دی اور کہا: "بیٹی وہ چلے گئے ہیں خدا کا شکر ادا کرو۔ انڈین فوجی تھے میں نے کہا بھائی ہم مچھیرے ہیں مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں۔"

شبانہ کو اس کی بات کا یقین آ گیا تھا۔ اس نے بھی گہرا سانس بھرتے ہوئے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور دھوتی کے پلو سے اپنی گردن اور چہرے کا پسینہ پونچھنے لگی۔

اس نے گنجے بنگالی سے پوچھا: "انکل! ہم نیپال کس وقت پہنچیں گے؟"

اس پر وہ بولا: "یہ دریا ہمیں صبح ایک گاؤں پہنچا دے گا جہاں سے نیپال کی سرحد دس پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ چھوٹے سے چھوٹا راستہ ہے ہم کل دوپہر تک نیپال کی سرحد پار کر لیں گے اب تم آرام کرو۔ آگے کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

شبانہ وہیں لکڑی کے فرش پر لیٹ گئی۔ کشتی ایک بار پھر دریا کے بہاؤ پر چل نکلی۔ شبانہ کی آنکھوں میں نیند اترنے لگی وہ سونا چاہتی تھی لیکن وہ دو راتوں سے سوئی نہیں تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اسے کچھ اطمینان بھی ہو گیا تھا۔ آنکھیں بند کرتے ہی وہ نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دن کی دھندلی روشنی کشتی میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اٹھ کر دیکھا

آسمان پر کالی گھٹا چھا رہی تھی اور دریا کا پاٹ چھوٹا ہو گیا تھا۔ کشتی ایک ایسے ٹاپو سے گزر رہی تھی جس میں لمبے لمبے سرکنڈے اُگے ہوئے تھے۔

پہلے والا بنگالی شبانہ کے پاس آ گیا اور بولا: "اچھا ہوا تم نے تھوڑی سی نیند لے لی۔ ہمیں دریا میں ایک بڑا لمبا راستہ طے کرنا پڑا ہے۔ انڈین فوج دریا میں گشت لگا رہی تھی لیکن اب ہم محفوظ علاقے میں ہیں۔ یہاں زیادہ خطرہ نہیں ہے۔ میں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔"

دوسرا بنگالی بھی آ گیا اس نے بھی شبانہ کو تسلی دی اور کہا کہ چونکہ انہیں دریا میں ایک لمبا راستہ طے کرنا پڑا ہے اس لیے اب وہ تیسرے پہر نیپال کی سرحد والے گاؤں میں پہنچیں گے۔

شبانہ خاموش رہی وہ کیا بات کرتی بس دل میں خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ وہ اس کی عزت کی حفاظت کرے۔ اسے چاول اور مچھلی کھانے کو دی گئی۔ چاول ٹھنڈے اور موٹے تھے۔ شبانہ نے وہی زہر مار کیے اور چپکی ہو کر کشتی میں بیٹھی رہی۔ کشتی سرکنڈوں کے بیچ میں سے ہو کر جا رہی تھی۔ اس کی رفتار بہت سست تھی۔ بادلوں میں ہلکی ہلکی سی گرج پیدا ہوئی اور پھر بوندا باندی شروع ہو گئی۔ فضا میں خنکی بڑھ گئی شبانہ نے دھوتی اپنے شانوں کے گرد لپیٹ لی۔

کافی دیر تک کشتی اونچے اونچے سرکنڈوں کے بیچ میں سے گزرتی رہی آخر وہ ایک جگہ کنارے پر پہنچ کر رک گئی۔ بوندا باندی نے اب بارش کی شکل اختیار کر لی تھی۔ دونوں بنگالی کشتی سے اتر کر کنارے پر چلے گئے اور کچھ دیر آپس میں باتیں کرتے رہے۔

پھر پہلے والا بنگالی شبانہ کے پاس کشتی کے اندر آ کر بولا: "بیٹی! آگے انڈین فوج کی چوکی ہے میرا دوست ان سے بات کرنے جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے تھوڑی بہت رشوت سے کام چل جائے اور انڈین فوجی ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دیں تم کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے جب تک ہم تمہارے ساتھ ہیں تمہاری طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ خدا سب ٹھیک کر دے گا۔ تم کشتی میں ہی بیٹھی رہو۔ میں باہر درختوں کے نیچے پہرہ دیتا ہوں۔"

وہ چلا گیا۔ کشتی کی چھت پر بارش کی بوندیں گرنے سے ہلکا ہلکا شور بلند ہو رہا تھا۔ شبانہ کو اپنی لاہور والی کوٹھی یاد آ گئی۔ بارش میں وہ اپنے کمرے کی کھڑکی کے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی اور باہر لان کے درختوں پر گرتی بارش کی آواز سنا کرتی تھی۔ پھر اسے نہر کے کنارے والی وہ کچی

کوٹھی یاد آ گئی جس کے عقب میں انگور کی بیل کے نیچے بیٹھ کر وہ اور راحیل چائے پیا کرتے تھے۔ اور بارش کی بوندیں انگور کے چوڑے پتوں پر گرتے ہوئے عجیب اداس موسیقی پیدا کرتی تھیں راحیل کو یاد کر کے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماں باپ کی وفات اور اپنی پیاری سہیلی نجمی کی جدائی کے بعد راحیل ہی ایک ایسی شخصیت تھی جس سے اسے محبت کی ہلکی ہلکی مہک آتی تھی۔ اب وہ بھی اس کے پاس نہیں تھا اور وہ اکیلی مصیبتوں میں گھر چکی تھی۔ کسی وقت اسے خیال آتا کہ یہ لوگ اس سے دھوکہ کر رہے ہیں اور وہ کسی خطرناک جال میں الجھائی جا رہی ہے۔ پھر خیال آتا کہ نہیں یہ لوگ ایسے نہیں ہیں۔ یہ شریف لوگ ہیں اور دل سے اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ شبانہ کے دماغ میں ایسے ہی متضاد خیالات سمندر کی لہروں کی طرح ابھر ابھر کر اس کی روح سے ٹکرا رہے تھے۔

بارش کا شور ہلکا پڑنے لگا اب پھر پہلے ایسی بوندا بوندی شروع ہو گئی تھی۔ کشتی کے اندر بیٹھے بیٹھے شبانہ کو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا وہ چھت کی بانس کی محرابی دیوار کے پاس آ کر باہر دیکھنے لگی۔ سامنے ناریل، آم اور تاڑ کے درخت بارش میں بھیگ رہے تھے۔ وہ پیچھے ہٹ کر واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ گیلی زمین پر کوئی تیز تیز قدم رکھتا کشتی کی طرف آیا۔ شبانہ ناریل کی ڈھیری کی اوٹ میں ہو گئی۔ یہ پہلے والا مسلمان بنگالی تھا اس نے آتے ہی کہا۔

"آؤ بیٹی باہر آ جاؤ۔ ہم جنگل سے گزر کر آگے جائیں گے۔" باہر دوسرا گنجا بنگالی بھی بارش میں چھاتا لگائے کھڑا تھا۔ چھاتا اس نے شبانہ کو دے دیا اور وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ زمین گیلی تھی مگر گھاس کی وجہ سے کیچڑ کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ بارش کی پھواروں میں انھوں نے درختوں کا ایک قطعہ پار کیا اور ڈھلان سے اتر کر ایک پگڈنڈی پر چلنے لگے جس کی ایک جانب دھان کے کھیت تھے اور دوسری جانب اونچے اونچے درخت کھڑے تھے۔ کافی دور تک وہ چلتے گئے۔ دھان کے کھیت ختم ہو گئے۔

پھر ویران علاقہ آ گیا۔ یہاں درخت اور کھیت نہیں تھے۔ صرف جنگلی جھاڑیاں ہی ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ شبانہ کو یہاں ایک عجیب قسم کا سناٹا چھایا ہوا محسوس ہوا۔
گنجے بنگالی نے کہا "یہاں سے جتنی تیز چل سکتی ہو چلو۔ دشمن کا خطرہ ہے۔"

شبانہ بھی ان کے ساتھ تیز تیز چلنے لگی پھر انھوں نے دوڑ کر جھاڑیوں والا علاقہ پار کر لیا۔ دوسری جانب دوبارہ دھان کے کھیت شروع ہو گئے تھے۔ یہاں شبانہ نے خاردار تاروں والی باڑھ دیکھی جو دھان کے کھیتوں کے درمیان سے گزرتی دوسری جانب جا رہی تھی۔
شبانہ کو معلوم نہیں تھا وہ مشرقی پاکستان کی سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو چکی تھی۔ یہ دونوں بنگالی جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کر رہے تھے اصل میں ہندو تھے۔ اور انھوں نے شبانہ کو ایک ہندو بنگالی کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا۔ جو تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑی میں بیٹھا شبانہ کا انتظار کر رہا تھا۔ گنجے بنگالی اس سے معاملہ طے کرنے ہی گیا ہوا تھا۔ بوندا باندی اسی طرح ہو رہی تھی۔ شبانہ چھتری لگائے دونوں ہندو بنگالیوں کے پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ وہ گھنے درختوں کے نیچے آ گئے۔ یہاں ایک جھونپڑی تھی جس کی چھت ناریل کی شاخیں ڈال کر بنائی گئی تھی۔ جھونپڑی خالی تھی۔ زمین پر درختوں کے خشک پتے بچھے ہوئے تھے۔
گنجے بنگالی نے شبانہ سے کہا "بیٹی تم یہاں بیٹھو ہم ابھی آتے ہیں۔"
شبانہ خاموشی سے خشک پتوں کے فرش پر ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ دونوں باہر نکل گئے جھونپڑی کی چھت ایک جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ گزرے تو جھونپڑی میں ایک موٹی توند والا کالا کلوٹا بنگالی اندر داخل ہوا اس نے بنیان اور دھوتی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کانسی کا گلاس تھا۔ بڑی شفقت سے بولا۔
"یہ چائے پی لو بیٹی تمھیں ٹھنڈ لگ رہی ہو گی یہاں چائے نہ پی جائے تو بخار چڑھ جاتا ہے۔"
شبانہ نے کانسی کا گلاس لے لیا۔ گلاس میں چائے گرم تھی۔ یہ کوئی نیا آدمی تھا۔ شبانہ نے سوچا اس کے ہمدرد دوستوں کا ہی ساتھی ہو گا۔ چائے تیز تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چائے پینے لگی۔ گرم چائے نے اس کے اعصاب کو کافی سکون بخشا۔ تھوڑی دیر میں ہی اس نے گلاس خالی کر دیا۔ دوسرے لمحے اس کا سر چکرانے لگا۔ شبانہ نے ہاتھ سے اپنا ماتھا دبایا۔ چکر زیادہ آنے لگے اب اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھی تو لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کی ہمت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو گئی۔ شبانہ کو بیہوش ہوئے دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ جھونپڑی میں وہی کالا کلوٹا ہندو داخل ہوا۔ اب اس کے ہاتھ میں

ایک لالٹین تھی ۔ لالٹین کی روشنی میں اس نے جھک کر شبانہ کو دیکھا ۔ اسے ہلایا جلایا ۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ بے ہوش ہو چکی ہے تو باہر نکل گیا ۔ دوسرے لمحے وہ چار آدمیوں کو لے کر آیا ۔ بے ہوش شبانہ کو اٹھا کر ایک چارپائی پر ڈالا اور جھونپڑی کے پیچھے ٹیکری کے پاس چھوٹے سے کچے راستے میں لا کر رکھ دیا ۔ ایک آدمی لالٹین لے کر ٹیکری کے اوپر چڑھ گیا اور اسے زور زور سے ہلانے لگا ۔

دور سے کسی جیپ کے اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور پھر ایک پرانی کھٹارہ سی جیپ جو ترپال سے ڈھکی ہوئی تھی وہاں آکر رک گئی ۔ موٹے ہندو بنگالی نے ڈرائیور سے کوئی بات کی ۔ شبانہ کو جیپ میں ڈال کر اوپر ترپال ڈالی ۔ خود ڈرائیور کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا ۔ جیپ شام کی بڑھتی پھیلتی سرمگیں فضاؤں اور گرتی بارش میں جنگل میں ایک طرف روانہ ہو گئی ۔

شام ہو چکی تھی جب جیپ دریا کے ایک ویران سے گھاٹ پر پہنچ کر رک گئی ۔ یہاں ایک بہت بڑی کشتی پہلے سے تیار کھڑی تھی ۔ جیپ کو اس کشتی میں اتار دیا گیا اور کشتی دریا میں چل پڑی ۔ دریا پار کرنے کے بعد جیپ ایک بار پھر جنگل کے راستے پر روانہ ہو گئی ۔ یہ مہا کھالی کا بھارتی علاقہ تھا ۔ جیپ جنگل سے نکل کر ایک سڑک پر دوڑی جا رہی تھی ۔ یہاں راستے میں ایک بھارتی فوجی کانوائے ملا ۔ جس کے ٹرکوں میں سامان لدا ہوا تھا ۔ اور جو باریسال سے لوٹا ہوا سامان لاد کر کلکتے کی طرف جا رہا تھا ۔ ساری رات جیپ جنگل سے نکل کر قصبوں اور گاؤں کے قریب سے گزرتی چلی گئی ۔ شبانہ جیپ کے اندر ترپال کے نیچے بے ہوش پڑی تھی ۔ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی کہ جیپ ایک جگہ کھیتوں کے پاس پرانی بارک کے پیچھے جا کر کھڑی ہو گئی ۔ یہاں موٹے ہندو بنگالی نے شبانہ کو دوسرے ٹرک میں ڈالا اور اسی وقت آگے روانہ ہو گیا ۔ اس کی منزل کلکتہ سے پچاس میل ادھر اشوا گھاٹی کا گاؤں تھا ۔ جہاں اسے شبانہ کو ،، ایک ہندو بردہ فروش کے پاس فروخت کرنا تھا ۔ وہ اس سے پہلے ڈھاکہ سے اغواء کی ہوئی چھ سات لڑکیوں کو یہاں لا کر چار چار ہزار روپے میں فروخت کر چکا تھا ۔ اب پو پھٹنے لگی تھی اور صبح کاذب کی جھلکیاں ظاہر ہو رہی تھیں ۔ بارش رک گئی تھی مگر آسمان پر بادل اسی طرح چھائے ہوئے تھے ۔ جنگل کا علاقہ ختم ہو گیا تھا ۔ اب چاروں طرف دھان اور پٹ سن کے کھیت ہی کھیت تھے ۔ ان کے درمیان کہیں کہیں ناریل اور تاڑ کے چھریرے درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ۔ تھا ۔ موٹا ہندو بنگالی اپنے ساتھی ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھا اسے گاڑی تیز

چلانے کی بار بار ہدایت کر رہا تھا ۔ اشوا گھاٹ گاؤں جب تیس میل دور رہ گیا تو دن کی پھیکی پھیکی ابر آلود روشنی چاروں طرف پھیل گئی تھی ۔ ٹرک درختوں میں گھری ہوئی پکی سڑک پر بھاگا جا رہا تھا شبانہ کو آہستہ آہستہ ہوش آنے لگا تھا ۔ ترپال کے نیچے پڑے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں ۔ آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا تھا ۔ وہ سمجھی کہ اسے کسی قبر میں دفن کر دیا گیا ہے ۔ اس کا سانس گھٹ رہا تھا اور سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں ۔ اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ہلائے ۔ یہ محسوس کر کے اسے خوشی ہوئی کہ وہ زندہ تھی اس نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ اس کے اوپر کوئی بھاری کپڑا ڈال دیا گیا ہے ۔ اب اسے ٹرک کے انجن کی آواز سنائی دی ۔ ہچکولوں سے وہ سمجھ گئی کہ اسے ٹرک میں لاد کر کہیں لے جایا جا رہا ہے ۔ شبانہ نے ترپال ہٹا دی اور بھاری ترپال کو اٹھایا ۔ اس کی گردن جیسے اکڑ گئی تھی اس نے دیکھا کہ وہ ٹرک میں پڑی ہے اور ٹرک سڑک پر پوری رفتار سے جا رہا ہے ۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آ گئی تھی ۔ اسے چائے میں بے ہوشی کی دوا پلائی گئی تھی ۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ جو لوگ اسے لائے تھے ان کی نیت خراب تھی اور اسے یقیناً کسی دلدل میں گرانے کے لیے لے جایا جا رہا ہے ۔ ٹرک تیز رفتاری سے جا رہا تھا وہ چھلانگ نہیں لگا سکتی تھی ۔ اچانک ٹرک کو ایک دھچکا لگا اور ایک دم بریک لگا دی گئی ۔ ٹرک رک گیا ۔

شبانہ کو آدمیوں کے زور زور سے باتیں کرنے اور ٹرک سے اترنے کی آواز سنائی دی ۔ وہ جلدی سے لیٹ گئی اور اس نے ترپال اسی طرح اپنے اوپر کر لی ۔

موٹا بنگالی ہندو چلا رہا تھا ،، سالے تم نے پہلے انجن کو چیک کیوں نہیں کیا ۔ میں اشوا گھاٹ ٹائم پر نہ پہنچا تو وہ آدمی کلکتے چلا جائے گا ۔ میں روپیہ تمہارے باپ سے لوں گا ۔ ؟ ،،

دوسری آواز ڈرائیور کی تھی وہ کہہ رہا تھا ،، سیٹھ ابھی ٹرک چالو کرتا ہوں تم فکر نہ کرو ۔ ،،

شبانہ کو ٹرک کا بونٹ اوپر اٹھانے کی آواز آئی پھر کوئی ٹرک کے اندر چڑھ آیا ۔ کسی نے اس کے منہ پر سے ترپال ہٹا دی ۔ شبانہ نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں ۔ جیسے وہ بے ہوش ہو ۔ موٹا ہندو بنگالی شبانہ کو غور سے دیکھ کر اپنے آپ ہی بولا ،، سالی خوبصورت بھی ہے چار ہزار تھوڑی رقم ہے اس کے مجھے سات ہزار سے کم نہیں لینے چاہئیں ۔ ،،

پھر اس نے شبانہ کے منہ پر ترپال ڈال دی اور وہیں سے چیخ کر ڈرائیور سے کہا ،، سالے جلدی

ٹھیک کر لے۔ لڑکی کو ہوش آ گیا تو مصیبت پڑ جائے گی۔"

اب ہر شے صاف ہو گئی تھی۔ شبانہ کو جس بات کا خدشہ تھا وہ صحیح نکلا تھا اسے فروخت کرنے کے لیے اشوا گھاٹ لے جایا جا رہا تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ کلکتہ شہر اشوا گھاٹ کے قریب ہی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک ایک بار پھر آگے چل پڑا۔ شبانہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ راستے میں جہاں بھی ممکن ہو گا وہ ٹرک سے کود کر کھیتوں میں بھاگ جائے گی اور کلکتہ پہنچنے کی کوشش کرے گی۔ وہ پڑھی لکھی لڑکی تھی اور جانتی تھی کہ کلکتے میں بنگالی اور غیر بنگالی مسلمان بھاری تعداد میں رہتے ہیں۔ وہ کسی مسلمان گھرانے میں پناہ حاصل کر لے گی۔ شبانہ کے پاس انڈین کرنسی کا ایک روپیہ تک نہیں تھا لیکن اسے یقین تھا کہ خدا اس کی مدد کرے گا اور وہ کسی نہ کسی طرح کلکتے پہنچ جائے گی۔

سڑک پکی اور کشادہ ہو گئی تھی۔ کبھی درختوں کے جھنڈ آ جاتے اور کبھی دونوں جانب دھان اور پٹ سن کے کھیت گہرے بادلوں کی پھیکی روشنی میں لہلہاتے دکھائی دیتے۔ شبانہ ترپال سے نکل کر ٹرک کے عقبی کنارے کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی اور چھلانگ لگانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار کر رہی تھی۔ سامنے سے ایک فوجی ٹرک آ گیا۔ شبانہ والے ٹرک کی رفتار دھیمی ہو گئی خوش قسمتی سے یہاں سڑک موڑ بھی کاٹتی تھی۔ جونہی ٹرک نے موڑ کاٹا شبانہ ٹرک سے سڑک کے کنارے والی جھاڑیوں میں کود گئی۔ وہ گھنی شاخوں میں گری اور وہیں دبک کر بیٹھی رہی۔ پھر اس نے جھاڑیوں میں سے سر نکال کر دیکھا اس کا ٹرک دور سڑک پر جا رہا تھا۔ یہاں ٹھہرنا مناسب نہیں تھا اس کے فرار کا علم ہو جانے پر بردہ فروش ہندو بنگالی اس کی تلاش میں واپس آ سکتا تھا۔ شبانہ کو گرتے سمے کوئی چوٹ نہیں لگی تھی جھاڑیوں نے اسے بچا لیا تھا۔ جب ٹرک سڑک پر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو شبانہ نے جھاڑیوں سے نکل کر سڑک کے متوازی دھان کے کھیتوں میں چلنا شروع کر دیا۔ بارش کی وجہ سے پگڈنڈی گیلی تھی۔ شبانہ نے ساڑھی باندھ رکھی تھی جو دھوتی اسے دی گئی تھی اس کا پلو اس نے سر کے اوپر ڈال لیا تھا۔ وہ ایک ایسے علاقے میں آ گئی تھی جو اس کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ صرف اندازے سے مغرب کی طرف چلی جا رہی تھی جس طرف اس کے قیاس کے مطابق کلکتہ شہر تھا۔

کھیتوں سے نکل کر وہ ایک میدان میں آ گئی جہاں جنگلی گھاس اگی تھی۔ دور سے ٹیلیفون کے کھمبے نظر آئے۔ شبانہ ان کھمبوں کی طرف چل پڑی۔ وہ تین چار جھونپڑیوں کے قریب سے گزری وہاں کچھ بچے مٹی میں کھیل رہے تھے۔ شبانہ خاموشی سے آگے نکل گئی۔ میدان ختم ہو گیا۔ سامنے ایک پگڈنڈی تھی جو درختوں کے درمیان سے گزر رہی تھی۔ شبانہ پگڈنڈی پر آ گئی۔ جب وہ چلتے چلتے ٹیلیفون کے کھمبوں کے پاس آئی تو اس نے دیکھا کہ چند قدموں کے فاصلے پر ایک چھوٹی پکی سڑک پورب سے پچھم کی طرف جاتی ہے۔ شبانہ اس سڑک پر آ گئی۔ وہ سڑک سے اتر کر کنارے کی جھاڑیوں کی اوٹ لے کر آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ٹرک جس پر مال لدا ہوا تھا سڑک پر سے گزر گیا۔ شبانہ اسے دور ہی سے دیکھ کر جھاڑیوں کے نیچے بیٹھ گئی۔ چلتے چلتے وہ تھک گئی اسے پیاس لگ رہی تھی۔ پانی وہاں کہیں نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے تالاب کے قریب سے گزری۔ تالاب کی سطح پر کائی جمی ہوئی تھی۔ تالاب کا پانی پینے کو اس کا دل نہ چاہا۔ وہ وہاں سے گزر گئی۔ ایک درخت کے نیچے وہ ستانے کو بیٹھ گئی وہ تھک گئی تھی۔ آبادی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ جب اس کی تکان کسی حد تک دور ہو گئی تو وہ اٹھی اور دوبارہ چل پڑی۔ دائیں جانب اسے جھگیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں نظر آیا۔ دس پندرہ جھونپڑیاں تھیں۔ باہر ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے۔ ایک عورت چولہے میں آگ جلائے کچھ پکا رہی تھی وہاں مرد کوئی نہیں تھا۔ شبانہ اس عورت کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔ وہ بنگالی نہیں بول سکتی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ منہ کے ساتھ لگا کر کہا "پانی"۔

بنگالی عورت نے مسکرا کر شبانہ کی طرف دیکھا اور جھونپڑی کے اندر جا کر اس کے لیے ناریل کے پیالے میں پانی لے آئی۔ شبانہ نے پانی پی کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

عورت نے بنگلہ میں کچھ پوچھا شبانہ نے کہا "بنگلہ نہیں ہندوستانی۔"

بنگالی عورت نے ٹوٹی پھوٹی ہندوستانی میں پوچھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے۔!

شبانہ نے کہا "میں بہاری ہوں۔ میرا آدمی چھوڑ کر چلا گیا ہے کلکتہ جا رہی ہوں۔"

بنگالی عورت نے تعجب سے شبانہ پر نگاہ ڈالی اور ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا کہ کلکتہ یہاں سے بہت دور ہے۔ اس بنگالی عورت کی زبانی شبانہ کو معلوم ہوا کہ آگے دو میل کے فاصلے پر بدر والی اسٹیشن ہے جہاں سے اسے کلکتہ جانے والی ریل مل جائے گی۔

اس بنگالی عورت نے شبانہ کو تھوڑی سی کھچڑی دی جسے شبانہ نے جلدی جلدی کھا لیا۔ پانی پیا اور آگے روانہ ہو گئی۔ مزید دو میل کی مسافت طے کرتے ہوئے شبانہ تھکن سے چور ہو گئی۔ ایک چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کا سگنل اور ڈھلانی چھت اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ اس کے پاس ریل کا کرایہ نہیں تھا لیکن اسے ہر حالت میں کلکتے پہنچنا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کلکتہ ایک بڑا شہر ہے اور وہاں اسے کسی نہ کسی مسلمان گھرانے میں ضرور پناہ مل جائے گی۔

اس نے بغیر ٹکٹ کے سفر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسٹیشن کا ایک ہی پلیٹ فارم تھا۔ کچھ دیہاتی قسم کے مسافر سامان کی گٹھڑیاں سنبھالے ادھر اُدھر بیٹھے تھے۔ شبانہ بھی ایک درخت کے ساتھ لگ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ ایک گھنٹے بعد ٹرین آ کر رک گئی۔ اس کے اوپر انگریزی اور بنگلہ زبانوں میں "سیالدہ پسنجر ٹرین" لکھا تھا۔ یہ ٹرین کلکتے ہی جا رہی تھی۔ شبانہ عورتوں کے ایک تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دوسری مسافر عورتوں کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ ڈبے میں کافی رش تھا۔ کسی نے شبانہ کی طرف خاص توجہ نہ کی۔ انجن نے سیٹی دی اور ٹرین اپنے سفر پہ روانہ ہو گئی۔

* * *

ریل گاڑی ہرے بھرے کھیتوں میں فراٹے بھرتی چلی جا رہی تھی۔

شبانہ کو یہی دھڑکا لگا تھا کہ اگر ٹکٹ چیک کرنے والا ڈبے میں آ گیا تو وہ اسے کیا کہے گی۔ یہ پسنجر ٹرین تھی اور سارا دن کوئی ٹکٹ چیکر نہ آیا۔ ڈبے میں دیہاتی بنگالی عورتیں سوار تھیں۔ شبانہ نے انھیں بھی یہی کہانی سنائی کہ وہ بہار کی رہنے والی ہے اپنے آدمی کے ساتھ بھدرا والی آئی تھی۔ وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا ہے اب وہ اس کی تلاش میں کلکتہ جا رہی ہے اور وہ بنگلہ نہیں جانتی۔ عورتوں نے اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے دوپہر کو چاول مچھلی بھی کھلائی۔ شبانہ نے انھیں یہ بھی بتا دیا کہ اسکے پاس ٹکٹ کے پیسے نہیں تھے۔ عورتوں نے کہا کہ تم فکر نہ کرو ٹکٹ والا بابو آئے گا تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔ ٹرین جس وقت کلکتہ کے اسٹیشن سیالدہ پہنچی تو شام ہو چکی تھی اور اسٹیشن بجلی کی روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔۔۔ پلیٹ فارم پر کافی رش تھا۔ شبانہ زندگی میں پہلی بار کلکتہ آئی تھی۔ اس کی ساتھی عورتوں میں سے ایک ادھیڑ عمر بنگالی عورت بھی تھی۔ جس کو ٹرین میں سب عورتیں بڑی دیدی کہہ کر پکارتی رہی تھیں۔ ٹرین سے نکل کر شبانہ ایک طرف کھڑی ہو گئی۔ بڑی دیدی اس کے پاس آئی اور بڑی شفقت سے پوچھا کہ وہ اپنے خاوند سے ملنے کہاں جائے گی۔ شبانہ کیا جواب دیتی۔ اسے اتنے بڑے شہر میں اکیلے ہونے کی وجہ سے خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ وہ کہاں جائے گی؟ اس کے پاس کوئی پیسہ بھی نہیں ہے۔ اس نے بڑی دیدی کو اپنے دل کا حال بتا دیا اور کہا کہ اسے ڈھاکہ سے کچھ لوگ اغواء کر کے لائے تھے کہ موقع پا کر وہ جنگل میں فرار ہو گئی۔

بڑی دیدی نے شبانہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولی "بیٹی! پریشان مت ہو۔ میرے ساتھ چلو رات میرے ہاں گزارو۔ کل تمہارا کوئی بندوبست کر دوں گی۔"

شبانہ اس ادھیڑ عمر بنگالن "بڑی دیدی" کے ساتھ چل دی۔ اس عورت کا مکان دریائے ہگلی کے پار ایک گندی بستی میں تھا۔ یہ دو تنگ کوٹھریوں پر مشتمل ایک کوارٹر تھا۔ بڑی دیدی نے شبانہ کا بستر ایک کوٹھری میں لگا دیا۔ یہ عورت ہندو تھی۔ دیوار پر کالی ماتا کی تصویر لگی تھی۔ شبانہ کو ڈر لگ رہا تھا لیکن رات سر پر آ چکی تھی۔ شہر میں اس کا کوئی جاننے والا نہیں تھا۔ اس نے یہی سوچا کہ کسی طرح رات یہاں گزار دے۔ دوسرے دن وہ یہاں سے پاکستانی سفارتخانے پہنچنے کی کوشش کرے گی یا کسی دردمند مسلمان کے گھر میں پناہ لے لے گی۔ بڑی دیدی نے شبانہ کو کھانا کھلایا اور کوٹھری میں آ کر کہنے لگی۔

"میرا بیٹا درگا پور میں ایک کارخانے میں کام کرتا ہے وہ اپنی پتنی کے ساتھ وہیں رہتا ہے۔ شاید وہ صبح آئے میں اس سے کہہ کر تمھارے پاکستان پہنچانے کا کوئی انتظام کر دوں گی۔ یہاں میرے بیٹے کے جاننے والے بہت ہیں۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔" بڑی دیدی نے بتی بجھا دی اور کوٹھری سے نکل گئی۔ شبانہ نے اٹھ کر اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بھیانک انقلاب نے اسے دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں لا پھینکا تھا۔ وہ چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ کیا اسے اس عورت کے بیٹے پر بھروسہ کرنا چاہیئے؟ نہیں یہ لوگ ہندو ہیں۔ انھیں اس سے کیا ہمدردی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے یہ لوگ بھی اس کو کسی جگہ بیچ دیں۔ ابھی تک شبانہ اپنی عزت کو سینے سے لگائے ہوئے تھی۔ وہ اپنے فیصلے پر قائم رہی کہ دن نکلتے ہی یہاں سے شہر کی طرف بھاگ جائے گی۔

اس فیصلے کے بعد اس کے دل کو کچھ اطمینان سا ہو گیا اور وہ چارپائی پر لیٹ گئی۔ چادر اوپر کر لی اور آنکھیں بند کر کے سوچنے لگی کہ نہ جانے اس کی طرح کتنی معصوم لڑکیاں اغوا ہونے کے بعد فروخت کر دی گئی ہوں گی۔ پھر آہستہ آہستہ اسے نیند آنے لگی اور وہ سو گئی۔ وہ ساری رات گہری نیند سوئی رہی۔ اس کی آنکھ کھلی تو کوٹھری میں دن کی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ شبانہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر بڑی دیدی چائے کا گلاس لیے کھڑی تھی اور باہر کوارٹر کے چھوٹے سے دالان کے کمرے میں ایک بوڑھی عورت بیٹھی برتن مانجھ رہی تھی۔

"لو بیٹی چائے پی لو۔ میں نے بیٹے کو پیغام پہنچا دیا ہے۔ وہ آج کسی وقت آ جائے گا۔ پھر تم واپس پاکستان چلی جانا۔"

شبانہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنی جلدی اس جہنم سے نکل جائے گی۔ اسے بڑی دیدی پر بھی

زیادہ بھروسہ نہیں تھا۔ اس نے گلاس لے لیا اور چارپائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ بڑی دیدی اندر آ گئی اور شبانہ کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بیٹی! جب تک میرا لڑکا نہیں آ جاتا تم یہاں سے باہر مت نکلنا۔ اگر کسی کو یہاں پتہ چل گیا کہ تم ڈھاکہ سے آئی ہو تو وہ پولیس کو خبر کر دیں گے میں کچھ ترکاری لینے جا رہی ہوں تم کوٹھری کا دروازہ بند کر کے اندر ہی رہنا۔"

شبانہ نے آہستہ سے سر ہلایا۔ بڑی دیدی شبانہ کے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیر کر چلی گئی۔ شبانہ اٹھ کر دروازہ بند کرنے لگی تو بڑی دیدی کوارٹر کے دروازے سے نکل کر گلی میں جا رہی تھی۔ بوڑھی عورت کمرے میں بیٹھی اسی طرح برتن دھو رہی تھی۔ شبانہ دروازہ بند کر کے چارپائی پر بیٹھ کر چائے پینے لگی۔ اسے اس بڑی دیدی کی باتوں سے خطرے کی بو آنے لگی تھی۔ ابھی اس نے چائے کے دو تین گھونٹ ہی پیئے تھے کہ کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ سامنے برتن دھونے والی بوڑھی عورت کھڑی ساڑھی کے پلو سے ہاتھ پونچھ رہی تھی۔ اس نے ایک نظر دالان میں ڈالی اور پھر شبانہ کے قریب آ کر ٹوٹی پھوٹی ہندی زبان میں بولی۔

"یہاں سے جتنی جلدی ہو بھاگ جاؤ۔ یہ عورت تمھیں اپنے بیٹے سے مل کر کسی دلال کے پاس بیچنے والی ہے ابھی وقت ہے بھاگ جاؤ۔" اتنا کہہ کر بوڑھی عورت واپس کمرے میں جا کر بیٹھ گئی اور برتن صاف کرنے لگی شبانہ کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج گئی تھی۔ اسے پہلے ہی بڑی دیدی پر شک تھا اب یہ شک یقین میں بدل گیا۔ اس نے چائے کا گلاس وہیں رکھا۔ ساڑھی کو جسم کے گرد اچھی طرح سے لپیٹا اور کوٹھری سے نکل کر دالان میں آئی اور پھر کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔ اس نے تیز تیز قدموں سے چلنا شروع کر دیا۔ وہ جتنی تیزی سے چل سکتی تھی چلتی ہوئی گلی عبور کر کے بازار میں آ گئی۔ دن کافی نکل آیا تھا۔ اگرچہ آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ بارش نہیں ہو رہی تھی۔ گوالے سائیکلوں پر دودھ لے کر جا رہے تھے۔ ایک رکشا قریب سے گزر گیا وہ خالی تھا۔ مگر شبانہ کے پاس پیسے نہیں تھے۔ وہ سڑک کے کنارے تیز تیز چلتی رہی۔ بازار ختم ہوا تو سامنے ایک نالے کا پل آ گیا۔ وہ پل پر سے بھی گزر گئی۔ آگے ایک کشادہ پکی سڑک تھی جس پر موٹر گاڑیاں، رکشے وغیرہ آ جا رہے تھے۔ ایک جانب ڈھلانی میدان تھا۔ دوسری جانب کارخانوں کی اونچی اونچی چمنیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں۔ یہاں پہنچ کر شبانہ نے

اپنی رفتار کم کر لی اور عام عورتوں کی طرح چلنے لگی۔ جیسے بازار سودا سلف خریدنے جا رہی ہو۔ وہ دل ہی دل میں اس بوڑھی عورت کا شکریہ ادا کر رہی تھی جس نے عین وقت پر اسے ایک بہت بڑے جہنم میں گرنے سے بچا لیا تھا۔ کارخانوں کے بیچ میں سے ایک چھوٹی سڑک جاتی تھی۔ شبانہ اس سڑک پر آ گئی۔ یہاں وہ پھر تیز چلنے لگی۔ کیونکہ یہاں اِکّا دُکّا لوگ ہی نظر آ رہے تھے۔ چونکہ اس نے ساڑھی پہن رکھی تھی اور سر کو چادر نما دھوتی سے ڈھانپ رکھا تھا اس لیے کسی نے اس کی طرف خاص طور پر دھیان نہ دیا۔ کارخانوں کے درمیان والا راستہ شبانہ کو ایک اور سڑک پر لے آیا۔ جہاں ایک بس اسٹاپ پر بس کھڑی تھی مسافر سوار ہو رہے تھے۔ شبانہ بھی اس میں سوار ہو گئی۔ بس چل پڑی۔ ٹکٹ چیکر اس کے پاس آیا تو شبانہ نے ہندو عورتوں کی طرح ہاتھ جوڑ کر اسے عاجزی سے کہا کہ میں غریب ہوں میرا آدمی مجھے چھوڑ گیا ہے۔ میرے پاس کرائے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ ٹکٹ چیکر نے ترش روئی سے کہا اگلے اسٹاپ پر اُتر جانا۔

اگلا اسٹاپ کافی دور تھا شبانہ نے یہی غنیمت جانا۔ کم از کم وہ شدید خطرے کے علاقے سے نکل آئی تھی۔ اسے یہ بھی ڈر تھا کہ اگر کسی پولیس والے کو پتہ چل گیا کہ وہ ڈھاکہ سے بھاگ کر غیر قانونی طور پر انڈیا میں داخل ہوئی ہے تو وہ اسے تھانے لے جائے گا اور پھر اس کے ساتھ جو حشر ہو گا وہ اس سے اچھی طرح واقف تھی۔ یہ لمبا روٹ تھا بس بڑی سڑک پر کافی دیر تک دوڑتی رہی۔ پھر ایک بارونق اور اونچی عمارتوں والے علاقے میں داخل ہو کر ایک اسٹاپ پر رک گئی۔ شبانہ وہیں اتر گئی اور ایک کھلی گلی میں داخل ہو گئی جہاں لڑکے فٹ بال کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ شبانہ کو کسی جگہ پناہ لینے کی ضرورت تھی۔ اس کا زیادہ دیر تک شہر کی سڑکوں پر چلتے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ سی آئی ڈی یا پولیس والوں کی نظروں میں آ سکتی تھی۔ اگرچہ اس نے بنگالی عورتوں کی طرح سوتی ساڑھی پہن رکھی تھی مگر اس کا رنگ گورا تھا اور وہ بنگالی عورت نہیں لگتی تھی۔

شبانہ ایک مکان کے پاس جا کر رک گئی۔ اس مکان کے دروازے پر ایک مسلمان وکیل کے نام کی تختی لگی تھی۔ شبانہ کو یوں محسوس ہوا جیسے اسی گھر میں اسے پناہ مل سکتی ہے اس نے بغیر کچھ سوچے سمجھے گھنٹی کا بٹن دبا دیا۔ سانولی رنگت درمیانے قد کے ایک باریش بزرگ نے دروازہ کھولا۔ چہرے پر نورانی چمک تھی اور ماتھے پر نشان تھا۔ انھوں نے غور سے شبانہ کی طرف دیکھا اور بنگلہ میں پوچھا کہ وہ کون ہے شبانہ نے اردو میں کہا کہ میں بنگالی زبان نہیں بول سکتی۔ بزرگ نے اردو میں پوچھا کہ وہ کون ہے

اور کس سے ملنا چاہتی ہے۔

شبانہ نے کہا "انکل! میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا مصیبت کی ماری ہوں مسلمان ہوں۔ کیا یہاں مجھے کوئی کام مل جائے گا۔"

بزرگ بولے "بیٹی اندر آ جاؤ۔"

کمرے میں فرش پر پٹ سن کی دری بچھی تھی۔ کونے میں پلنگ کے پاس پیچوان پڑا تھا میز پر کچھ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ دیوار پر کعبہ شریف کی تصویر فریم میں لگی لٹک رہی تھی۔ بزرگ نے شبانہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بیٹھو بیٹی! میں تمھارے لیے کچھ کھانے کو لاتا ہوں۔"

شبانہ ایک کرسی پر سمٹ کر بیٹھ گئی اور سوچنے لگی کہ وہ اس بزرگ کو اپنی داستان الم سنا دے یا خاموش رہے۔ بزرگ واپس آئے تو ایک انہی کی عمر کی ایک باوقار چہرے والی عورت بھی ان کے ساتھ تھی جس نے ہاتھ میں تھالی اٹھا رکھی تھی۔ تھالی میں چاول اور تھوڑی سی ترکاری تھی۔

تھالی شبانہ کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے عورت نے پوچھا "تم کون ہو شکل سے تم نوکرانی نہیں لگتی ہو۔"

شبانہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "مصیبت کی ماری ہوں جی۔ خاوند چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بہار کی رہنے والی ہوں۔ بے سہارا ہوں کوئی کام مل جائے تو آپ کو دعائیں دوں گی۔"

عورت بولی "ہمارے ہاں پہلے ہی ایک نوکرانی کام کرتی ہے تم کھانا کھا لو اور کسی دوسرے گھر میں کام تلاش کرو۔"

عورت چلی گئی۔ بزرگ پلنگ پر بیٹھ کر حقہ پینے لگے "کھانا کھاؤ بیٹی گھبراؤ نہیں اللہ مسبب الاسباب ہے۔ میں تمھیں کہیں نہ کہیں کام دلوا دوں گا۔"

شبانہ کو اس نیک دل بزرگ کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا۔ اگر وہ اس بزرگ کے آگے اپنا دل کھول کر رکھ دے تو یہ اس کی مدد کر سکتے ہیں۔ شبانہ کو بھوک نہیں لگی تھی وہ چلتے پھرتے کر کوارٹر سے بھاگی تھی۔ اور ابھی دن بھی زیادہ نہیں گزرا تھا۔ پھر بھی اس نے دو چار لقمے چاول کے لیے اور کہنے لگی "میں پڑھی لکھی بھی ہوں۔ تھوڑی انگریزی بھی جانتی ہوں۔ اگر کسی جگہ لکھنے پڑھنے کا کام مل جائے تو آپ کی

بڑی مہربانی ہوگی۔"

بزرگ شبانہ کی طرف گہری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور آہستہ آہستہ حقہ پی رہے تھے۔ انھوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب شبانہ نے تھالی میز پر پرے کر دی اور رومال سے ہاتھ صاف کرنے لگی تو بزرگ نے شبانہ کی طرف گھورتے ہوئے نرم آواز میں کہا "بیٹی! مجھے لگتا ہے کہ تم بہاری نہیں بلکہ پنجابی ہو اور مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آئی ہو۔"

شبانہ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بزرگ نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور پدرانہ شفقت بھرے لہجے میں بولے "بیٹی روؤ نہیں ہم مسلمان بنگالیوں کے دل بھی مشرقی پاکستان کے المیے پر خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ اب تم مجھے بتاؤ کہ تم یہاں کیسے پہنچیں اور تمھارے ماں باپ کہاں ہیں؟ گھبراؤ نہیں مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھو۔"

شبانہ نے ساڑھی کے پلّو سے آنسو پونچھتے ہوئے شروع سے آخر تک اپنی ساری داستانِ غم بیان کر دی۔ بزرگ شبانہ کی مصیبت بھری کہانی کو غور سے سنتے رہے۔ جب شبانہ چپ ہو گئی تو گہرا سانس بھر کر کہنے لگے "ہماری مسلمان بچیوں پر ہندو بنگالیوں اور مکتی باہنی والوں نے بڑا ظلم کیا ہے۔ اچھا ہوا کہ تم میرے پاس آ گئی ہو۔ اگر سی آئی ڈی والوں کی تم پر نظر پڑ جاتی تو خدا جانے تمھارے ساتھ کیا گزرتی۔"

انھوں نے شبانہ کو تسلی دی اور کہا "میری بیوی تنگ مزاج عورت ہے طبیعت کی بھی سخت ہے شاید اسے تمھاری کہانی پر یقین نہ آئے مگر میں تمھیں بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا۔ میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔"

شبانہ نے کہا "انکل! میں آپ کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی آپ مجھے کسی طرح پاکستان کی سرحد پر پہنچا دیجیے۔"

بزرگ نے کہا "بیٹی یہ کوئی آسان کام نہیں ہے سرحدوں پر جنگ ہو رہی ہے۔ میں کوئی دوسرا طریقہ نکالتا ہوں۔ فی الحال میں تمھیں اپنی بیوہ بہن کے پاس لے جاتا ہوں وہ بڑی رحمدل خاتون ہے اسی محلّے کے ایک فلیٹ میں اکیلی رہتی ہے تم وہاں رہو۔ اتنی دیر میں میں تمھارے پاکستان پہنچانے کی کوئی ترکیب سوچتا ہوں۔"

اسی روز دوپہر سے پہلے پہلے اس بزرگ نے شبانہ کو اپنی بیوہ بہن کے ہاں پہنچا دیا۔ اس نیک دل خاتون نے شبانہ کی روداد غم سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے شبانہ کو اپنے گلے سے لگا کر بہت پیار کیا اور حوصلہ دیا کہ خدا پر بھروسہ رکھو۔ وہ ضرور تمھیں تمھارے گھر والوں کے پاس پہنچا دے گا۔ شبانہ وہاں رہنے لگی۔ بیوہ خاتون نے اسے مکان سے باہر جانے سے منع کر رکھا تھا۔ شفیق بزرگ شام کو آ کر شبانہ سے مل جاتے اور حوصلہ دیتے کہ وہ اس کے لیے کوشش کر رہے ہیں۔ چوتھے دن شام کو بزرگ اپنی بیوہ بہن کے ہاں تشریف لائے تو شبانہ کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ بیوہ خاتون بھی چائے لے کر وہیں آ گئیں۔ بزرگ کہنے لگے "بیٹی! میں نے تمھارا بندوبست کر دیا ہے۔ تمھیں کلکتے سے بحری جہاز میں سوار ہو کر رنگون جانا ہوگا۔ رنگون میں میرا ایک دوست رہتا ہے وہ پھلوں کی تجارت کرتا ہے اور بڑا نیک دل مسلمان ہے میں نے اسے ٹیلیفون بھی کر دیا ہے اور اس کے نام ایک خط بھی تمھیں دوں گا۔ تم رنگون پہنچو گی تو وہ بندرگاہ پر تمھیں لینے آیا ہوگا۔"

پھر بزرگ نے جیب سے اپنے رنگون والے دوست کی ایک پاسپورٹ سائز کی تصویر نکال کر دکھائی اور بولے "یہ میرا بچپن کا دوست ہے۔ اس کا نام سید بہاء الدین ہے۔ یہ بھی میری طرح بنگالی ہے۔ بال بچوں کے ساتھ رنگون میں رہ رہا ہے۔ وہ تمھیں رنگون سے کراچی جانے والے جہاز میں سوار کروا دے گا۔"

شبانہ کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشخبری ہو سکتی تھی احسان مندی کے جذبے سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دونوں نیک دل بہن بھائی نے شبانہ کو پیار کیا اور تسلّی دی کہ اب اسے کوئی فکر نہیں کرنا چاہیے۔ انشاء اللہ وہ بہت جلد پاکستان اپنے گھر والوں کے پاس پہنچ جائے گی۔ شبانہ کو معلوم تھا کہ رنگون جانے کے لیے پاسپورٹ کی ضرورت ہے۔ جب اس نے پاسپورٹ کے بارے میں پوچھا تو بزرگ مسکراتے ہوئے کہنے لگے "بیٹی! تمھارا پاسپورٹ بنانا ان حالات میں ناممکن بات ہے۔ لیکن تمھیں پاسپورٹ کی ضرورت نہیں پڑے گی جس بحری جہاز پر تم سفر کرو گی وہ مرچنٹ نیوی کا باربردار جہاز ہے اور اس کا کپتان ناظم الدین میرا بچپن کا دوست ہے۔ ہم کلکتے کی گلیوں میں اکٹھے فٹ بال کھیلا کرتے تھے۔ وہ بڑا سچا مسلمان اور پاکستان سے محبت کرتا ہے میں نے تمھارے بارے میں اسے سب کچھ بتا دیا ہے وہ تمھیں اپنی حفاظت میں رنگون لے جائے گا۔ تم اس کی

قریبی رشتے دار کی حیثیت سے جہاز میں اس کے ساتھ سفر کرو گی۔ وہ تمھیں رنگون کی بندرگاہ سے باہر نکال کر ہمارے مشترکہ دوست کے حوالے کر دے گا تمھیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے! اللہ تعالیٰ نے تمھاری بہت مدد کی ہے۔ میرا کپتان دوست ناظم الدین اتفاق سے سنگاپور سے جہاز لے کر آج صبح ہی کلکتے پہنچا ہے۔ اب تم تیاری شروع کر دو۔ جہاز کل صبح صبح یہاں سے روانہ ہو رہا ہے۔ میں خود تمھیں بندرگاہ پر لے جاؤں گا۔"

شبانہ نے ان بزرگ کا بے حد شکریہ ادا کیا۔ انھوں نے شبانہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تم ہماری بیٹی ہو کیا باپ اپنی بیٹیوں کی مدد نہیں کیا کرتے؟"

شبانہ بے اختیار رو پڑی۔ اسے اپنا شفیق باپ یاد آ گیا جو اس کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا کس قدر خیال رکھا کرتا تھا۔ دوسرے دن صبح صبح بزرگ تشریف لے آئے۔ شبانہ پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی۔ ایک بستر بندھا تھا چھوٹے اٹیچی کیس میں ضرورت کی کچھ چیزیں اور دو سوتی ساڑھیاں رکھی تھیں شفیق بزرگ نے جیب سے بٹوا نکال کر شبانہ کو دو سو روپے دیئے اور کہا "کاش میں اس سے زیادہ اپنی بیٹی کی مدد کر سکتا۔"

شبانہ کا دل احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ انھوں نے شبانہ کو اپنے ساتھ ٹیکسی میں بٹھایا اور خضر پور والی بندرگاہ کی طرف چل دیئے۔ باربردار انڈین بحری جہاز جیٹی نمبر دو پر ایک طرف لنگر انداز تھا اور اس پر سامان لادا جا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان ناظم نے جس طرح بتایا اسی طرح کیا گیا۔ شفیق بزرگ ڈاک یارڈ کے عقبی کیفے میں آ کر بیٹھ گئے۔ شبانہ نے نئی ساڑھی پہن رکھی تھی کاندھوں پر چھوٹی کشمیری شال تھی۔ یہ شال شفیق بزرگ کی بیوہ بہن نے شبانہ کو دی تھی۔ ٹھیک وقت پر جہاز کا کپتان کیفے میں آ گیا۔ اس نے بحری کپتانوں والی وردی پہن رکھی تھی اپنے دوست کے گلے لگ کر ملا۔ شبانہ کو اس نے ہیلو بے بی کہہ کر یوں مخاطب کیا جیسے اسے پہلے ہی سے جانتا تھا۔ یہ سب کچھ طے شدہ منصوبے کے تحت ہو رہا تھا۔ کیونکہ جہاز کے کپتان نے وہاں یہ بتا رکھا تھا کہ اسکے ساتھ اسکی بھانجی بھی جا رہی ہے شفیق بزرگ نے ایک بار پھر کپتان کو ساری بات سمجھائی۔ پھر شبانہ کے سر کو چوما اور چلے گئے شبانہ انھیں عقیدت بھری آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ کپتان نے شبانہ کو ساتھ لیا اور ڈاکیارڈ سے نکلکر خاص راستے سے جیٹی پر آ گیا جہاں ایک بہت بڑا بحری جہاز لنگر انداز تھا۔ شبانہ کا یہ پہلا بحری سفر تھا اس سے پہلے وہ کبھی کسی بحری جہاز پر سوار نہیں ہوئی تھی کپتان اسے اپنے کیبن میں....

لے گیا۔ یہاں اس نے شبانہ کے لیے کافی منگوائی اور کہا کہ میرے دوست سید صاحب نے مجھے تمھاری بابت سب کچھ بتا دیا ہے۔ تمھیں اب فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم محفوظ ہاتھوں میں آ گئی ہو۔ دو دن کے بعد جہاز رنگون کی بندرگاہ سے جا لگے گا۔ جہاں میں تمھیں چوہدری صاحب کے حوالے کر دوں گا وہ تمھیں کراچی کے ہوائی جہاز میں سوار کرا دیں گے تم بڑی خوش قسمت ہو کہ کلکتہ پہنچ کر سید صاحب کے پاس آ گئیں۔ خدا دوسری مسلمان بچیوں کی عزتوں کی حفاظت فرمائے۔

دو گھنٹے کے بعد جہاز نے لنگر اٹھا دیا اور خلیج بنگال کے سمندر میں رنگون کی طرف روانہ ہو گیا۔ موسم ابر آلود ضرور تھا مگر سمندر پر سکون تھا معمول کے مطابق ہوا چل رہی تھی۔ شبانہ کو کپتان نے اپنے ساتھ والا الگ چھوٹا کیبن دے دیا تھا۔ دوپہر کو کپتان نے شبانہ کو اپنی میز پر ساتھ بٹھا کر کھانا کھلایا۔ شبانہ کی چائے بھی اس نے کپتان کے ساتھ ہی پی۔ رات کو شبانہ کو بڑی گہری نیند آئی۔ وہ خوش تھی کہ درندوں کی دنیا سے نکل آئی ہے اور اب اپنے پیارے وطن پاکستان پہنچ جائے گی۔ دوسرا دن بھی خوشگوار تھا۔ سورج طلوع ہوا تو شبانہ اس کا نظارہ کرنے جہاز کے عرشے پر آ گئی۔ ٹھنڈی مرطوب ہوا چل رہی تھی۔ چاروں طرف پانی ہی پانی تھا۔ مشرقی افق پر سرخ سورج کا تھال آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا۔ سورج سے لے کر جہاز تک ایک سرخ سڑک سی بچھ گئی تھی۔ شبانہ اس منظر کے سحر میں گم ہو گئی۔ نہ جانے وہ کب تک طلوع صبح کے منظر میں گم رہتی کہ اچانک ایک زبردست دھماکہ ہوا اور وہ سمندر میں گرتے گرتے بچی۔ جہاز کو ایک بھیانک دھچکا لگا اور وہ ایک طرف کو گھوم گیا۔ شبانہ وہیں جنگلے کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہوا ہے عرشے پر خلاصی ادھر ادھر گھبراہٹ کے عالم میں دوڑنے لگے۔ پندرہ سیکنڈ کے بعد دوسرا دھماکہ ہوا یہ دھماکہ پہلے سے زیادہ شدید تھا اور جہاز ایک طرف کو جھک گیا۔ شبانہ کا دل خوف کے مارے اندر سے دھڑکنے لگا وہ عرشے کے فرش پر ایک طرف کو لڑھک گئی اگر وہ لنگر کی بڑی زنجیر کو نہ پکڑ لیتی تو سمندر میں گر گئی ہوتی۔ لنگر کی زنجیر عرشے پر گول چکر کی شکل میں پڑی تھی۔ شبانہ وہیں سہمی بیٹھی ملاحوں کو گھبراہٹ کے عالم میں ادھر ادھر دوڑتے دیکھنے لگی۔ وہ زور زور سے بنگلہ اور تامل زبانوں میں ایک دوسرے کو پکار رہے تھے جہاز آہستہ آہستہ

ایک طرف کو جھکتا جا رہا تھا۔ پھر جہاز کے بڑے ہوا دان میں سے پہلے گاڑھا سیاہ دھواں نکلا اور پھر آگ کے شعلے نکلنے لگے۔ جہاز میں شور مچ گیا کہ آگ لگ گئی ہے۔ شبانہ کا دل بیٹھنے لگا۔ حلق دہشت کے مارے خشک ہو گیا۔ موت سامنے آن کھڑی ہوئی۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ جہاز ڈوب گیا تو وہ بھی اس کے ساتھ ہی سمندر میں غرق ہو جائے گی۔ وہ کوشش کر کے اٹھی کر کسی طرح جہاز کے کپتان کے کیبن تک پہنچے۔ وہ عرشے پر پڑے سامان کو پکڑتی جہاز کے نیچے جاتی سیڑھی کی طرف بڑھنے لگی اتنے میں ایک ساتھ دو زبردست دھماکے ہوئے اور جہاز کا اگلا حصہ پانی میں ڈوب گیا ساتھ ہی کیبن کی سیڑھیوں میں سے آگ کے شعلے باہر نکلنے لگے۔ جہاز کا درمیانی حصہ بری طرح آگ میں جل رہا تھا۔ ملاحوں نے کشتیاں سمندر میں پھینک دیں اور اس میں چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ چاروں طرف آگ ہی آگ پھیل گئی۔ نیچے سے کوئی اوپر نہ آ سکا۔ جہاز تیزی سے پانی میں غرق ہو رہا تھا۔ عجیب عجیب سی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کسی نے شبانہ کو دیکھا تو چلّا کر کہا "کشتی میں کود کر جان بچاؤ۔" شبانہ بھی دوسرے ملاحوں کے ساتھ دوڑتی ہوئی جنگلے تک گئی۔ کچھ کشتیاں تیزی سے سمندر میں تیرتے ہوئے جہاز سے دور جا رہی تھیں۔ ایک کشتی جہاز کے نیچے سمندر میں کھڑی ڈول رہی تھی۔ اس میں جہاز کے کچھ ملاح کھڑے اوپر دیکھ کر بنگلہ زبان میں چلا رہے تھے ایک رسّہ عرشے سے نیچے کشتی تک لٹک رہا تھا۔ شبانہ نے رسے کو پکڑ لیا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترنا شروع کر دیا۔ جہاز میں آگ مزید بھڑک اٹھی تھی اور اس کی تپش شبانہ کو ناقابل برداشت محسوس ہو رہی تھی۔ کشتی سے دس پندرہ فٹ کی اونچائی سے شبانہ نے کشتی میں چھلانگ لگا دی۔ ملاحوں نے چپو زور زور سے چلانے شروع کر دیئے۔ کشتی سمندر کی بڑی بڑی لہروں پر ڈولتی تیزی سے جہاز سے دور ہونے لگی۔ شبانہ ایک طرف سہمی ہوئی بیٹھی تھی اسے رہ رہ کر جہاز کے کپتان کا خیال آ رہا تھا۔ خدا جانے وہ کہاں ہو گا۔ یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا اور کشتی جہاز سے تھوڑی دور ہی پہنچی تھی کہ جہاز آدھے سے زیادہ سمندر میں ڈوب گیا۔ سمندر کی لہریں شور مچاتی۔ جہاں جہاز ڈوب رہا تھا اس طرف کو جانے لگیں۔

جہاز کے ملاح تجربہ کار تھے وہ اس بھنور سے کشتی کو نکال کر لے گئے۔ شبانہ نے پیچھے مڑ کر

دیکھا تو جہاز سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ اس کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ وہ سمندر میں اکیلی رہ گئی تھی۔ چاروں طرف سمندر ہی سمندر تھا۔ کیا وہ زندہ بچ سکے گی۔ یہ کشتی اتنے بڑے سمندر میں.. کہاں تک ان کا ساتھ دے گی؟ شبانہ کا جسم خوف کے مارے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ کشتی، سمندر کی ابھرابھر کر ڈوبتی لہروں پر بری طرح ڈول رہی تھی۔ شبانہ نے کشتی کی دیوار کے ساتھ لگے رسّے کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ سمندر کے پانی نے اس کے کپڑوں اور سر کے بالوں کو شرابور کر دیا تھا۔ ملاح چیخ چیخ کر ایک دوسرے کو آوازیں دے رہے تھے۔ سات آٹھ ملاح پوری طاقت سے دیوانہ وار بڑے بڑے چپو چلا رہے تھے۔ جہاز کے ڈوبنے سے وہاں جو بہت بڑا بھنور پیدا ہو گیا تھا وہ آس پاس کی سمندری لہروں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ ملاح اب اس بھنور سے نکلنے کی سر توڑ کوشش کر رہے تھے۔ آخر سخت جدوجہد کے بعد وہ اس آخری بھنور سے بھی کشتی کو نکال کر لے گئے۔ اب کشتی کھلے سمندر میں قدرے سکون کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ شبانہ نے پھٹی پھٹی آنکھیں اٹھا کر ملاحوں کو دیکھا۔ یہ سب وردیوں میں تھے جو بھیگ چکی تھیں دس بارہ ملاحوں میں شبانہ ایک اکیلی لڑکی تھی۔ جب ذرا سکون ہوا تو ایک بنگالی ملاح جو پکی عمر کا تھا اور جس کی چھوٹی سی داڑھی تھی شبانہ کے پاس آ کر بنگلہ میں بولا "تم کو چوٹ تو نہیں آئی؟"

شبانہ نے اردو میں کہا "میں بنگلہ نہیں جانتی۔"

ادھیڑ عمر ملاح نے حیرانی سے شبانہ کو دیکھا اور اردو میں بولا "بیٹی تم کپتان صاحب کی بھانجی ہو اور بنگلہ نہیں جانتی؟"

شبانہ نے بتایا کہ وہ دلی میں پیدا ہوئی اور وہیں پلی بڑھی تھی۔ اس نے کپتان کے بارے میں تشویش کے ساتھ پوچھا تو ملاح نے سر جھکا دیا اور غم زدہ آواز میں بولا "افسوس بیٹی! نیچے والے کیبنوں سے کوئی بھی اوپر نہیں آ سکا کپتان صاحب بھی نیچے اپنے کیبن میں تھے۔"

شبانہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ملاح نے اسے بتایا کہ جہاز کے انجن روم میں کسی نے طاقتور ٹائم بم رکھ دیئے تھے۔ جہاز کا بچنا ناممکن تھا۔ ہم مشکل سے اپنی جان بچا سکے۔ اس لیے کہ ہم اوپر والے کیبنوں میں تھے۔ اس ادھیڑ عمر ملاح کا نام عبدل تھا اور وہ کلکتے ہی کا رہنے والا تھا۔ اس نے شبانہ کو یہ بھی بتایا کہ کشتی میں چھ دن کی خوراک اور پانی محفوظ ہے۔ یہ خوراک پندرہ

آدمیوں کے لیے ہے۔

"جہاز چلنے سے پہلے ہر کشتی میں ایک ہفتے کا راشن پانی رکھ دیا جاتا ہے جو منزل پر پہنچنے کے بعد ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور واپسی پر اس کی جگہ تازہ راشن رکھ دیا جاتا ہے۔"

یہ کشتی، لائف بوٹ تھی اور کافی بڑی تھی۔ پیچھے کی جانب ایک جگہ ترپال ڈال کر چھوٹی سی چھت بنا دی گئی تھی۔ عبدل نے شبانہ کو اس چھت کے نیچے بٹھا دیا۔ سبھی ملاح شبانہ کی عزت کرتے تھے کیونکہ انھیں معلوم تھا کہ وہ ان کے کپتان کی بھانجی ہے۔ اب انھیں اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ آسمان بادلوں سے صاف ہو گیا تھا اور سورج اوپر آ گیا تھا۔ دھوپ چمک رہی تھی۔ سمندر کا پانی کالے رنگ کا تھا۔ عبدل نے شبانہ کو بتایا کہ اسے کالا پانی بھی کہتے ہیں کیونکہ یہ بہت گہرا ہے اور اس کے نیچے کالی چٹانیں اور پہاڑیاں ہیں۔ دوپہر کو ملاحوں نے آپس میں تھوڑا سا راشن تقسیم کیا۔ شبانہ کو بھی ابلے ہوئے چاول کی ایک پیالی اور پانی کا ایک گلاس دیا گیا۔ دن کھلے سیاہ سمندر میں سفر کرتے گزر گیا۔ عبدل شبانہ کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بیڑی پینے لگا۔ ملاح باری باری چپو چلاتے تھے۔ کشتی چونکہ کھلے سمندر کی دیو پیکر لہروں پر بہہ رہی تھی اس لیے زیادہ چپو چلانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ عبدل کہہ رہا تھا "ہم کشتی کو انڈیمان کی طرف لیجانے کی کوشش کر رہے ہیں جہاں ہمارا جہاز غرق ہوا تھا وہاں سے انڈیمان کے جزیرے جنوب مشرق کی طرف ایک دن اور ایک رات کے فاصلے پر ہیں۔ اگر ہماری کشتی کی سمت ٹھیک رہی تو ہمیں آج رات کسی وقت انڈیمان کے جزیروں میں پہنچ جانا چاہیئے۔"

جو کشتیاں جہاز میں آگ لگ جانے کے بعد ان کے ساتھ سمندر میں اتری تھیں ان کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ وہ کس طرف کو نکل گئی تھیں۔ شبانہ کے ذہن میں سوائے خوف اور دہشت کے اور کچھ نہیں تھا۔ اتنے بڑے سمندر میں وہ اپنے آپ کو پہلی بار بے یار و مددگار پا رہی تھی۔ سورج مغرب کی طرف جھکنے لگا۔ دھوپ سنہری ہو کر سورج کی طرف سمٹنے لگی تھی۔ ایک بار پھر جب سورج نے مغربی افق کا کنارہ چھوا تو سورج سے لیکر کشتی تک ایک سنہری راستہ بن گیا۔ پھر سورج سمندر میں ڈوب گیا لیکن غروب آفتاب کی روشنی دیر تک سمندر پر پھیلی رہی۔ اس کے بعد سمندر کو اندھیرے نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ شبانہ کو سمندر سے ڈر آنے لگا۔ رات کے شروع میں عبدل نے اسے چاول

کی ایک کٹوری اور پانی دیا۔ شبانہ کھانے کے بعد ترپال کے نیچے سکڑ کر لیٹ گئی۔ آسمان پر تارے نکل آئے تھے۔ سمندر کی نمکین مرطوب ہوا نے شبانہ کے چہرے پر جیسے موم کی تپلی سی تہہ جما دی تھی۔ عبدل دوسرے ملاحوں کے ساتھ کشتی میں آگے کی جانب کھڑا ستاروں کی مدد سے سمت کا تعین کر رہا تھا۔ یہ ملاح رات کے اندھیرے میں سایوں کی طرح لگ رہے تھے۔ ہوا سرد ہو گئی تھی۔ شبانہ نے چادر اوپر کر لی اور منہ باہر نکالے کشتی کو کبھی اوپر اور کبھی لہروں کے ساتھ نیچے جاتے دیکھنے لگی۔

کچھ دیر بعد عبدل اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا اور بولا "بیٹی سو جانے کی کوشش کرو۔ ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں۔ امید ہے آدھی رات کے بعد ہمیں انڈیمان کے لائٹ ہاؤس کی روشنی نظر آ جائے گی۔"

شبانہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں گھر پڑی تھی۔ دل میں خدا سے دعا مانگنے لگی۔ نیند اسے بالکل نہیں آ رہی تھی۔ عبدل اٹھ کر دوسرے ملاحوں کے پاس چلا گیا جو اندھیری رات میں بھوتوں کی طرح چپو چلاتے ہوئے آگے پیچھے ہو رہے تھے۔

شبانہ آنکھیں بند کیے سونے کی کوشش کرنے لگی۔ رات گزرتی چلی جا رہی تھی۔ شبانہ کے ذہن میں منتشر خیالات گردش کر رہے تھے اور نیند کوسوں دور تھی۔ پھر بھی وہ آنکھیں بند کیے ترپال کی چھت کے نیچے پڑی رہی۔ اچانک ایک ملاح نے چیخ کر لائٹ ہاؤس کا نام لیا۔ دوسرے ملاح بھی خوشی سے چیخنے لگے۔ شبانہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ مشرق میں دور اندھیرے سمندر کے کنارے روشنی کی ایک جھلک بار بار روشن ہو جاتی اور پھر بجھ جاتی تھی۔ عبدل نے فرط مسرت سے کانپتی آواز میں شبانہ کے پاس آ کر بتایا کہ انڈیمان کا لائٹ ہاؤس نظر آ گیا ہے وہ دیکھو۔ یہ لائٹ ہاؤس کی روشنی ہے جو ایک بار سامنے آ کر دوسری طرف گھوم جاتی ہے۔

شبانہ کے مردہ جسم میں یہ روشنی دیکھ کر جان سی پڑ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑ کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور عبدل سے پوچھا کہ وہ کتنی دیر تک ساحل پر پہنچ جائیں گے۔

عبدل نے سمندر کی تیز ہوا میں بڑی مشکل سے بیڑی سلگائی اور بولا "بس بیٹی اب پہنچے ہی سمجھو۔ ساحل قریب آنے سے سمندری لہروں کی رفتار تیز ہو گئی ہے۔ ہم نے کشتی کو اور تیز دوڑ

پر ڈال دیا ہے۔ دو تین گھنٹوں تک ہم ساحل پر ہوں گے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔"

یہ کہہ کر عبدل اپنے ملاح ساتھیوں کے پاس چلا گیا۔ شبانہ بڑے غور سے اور پُر اشتیاق نظروں سے لائٹ ہاؤس کی طرف روشنیوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ روشنی لائٹ ہاؤس کی سب سے اوپر والی منزل میں لگی ہوتی ہے اور گھومتی رہتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ روشنی کا ایک دھیما سا جھپاکا سا دکھائی دیتا اور پھر بجھ جاتا۔ دو سیکنڈ بعد جب روشنی اپنی گردش پوری کر لیتی تو یہ جھپاکا پھر دکھائی دے جاتا۔ جوں جوں کشتی ساحل کے قریب ہو رہی تھی لائٹ ہاؤس کی روشنی اب سمندر پر بھی ایک روشن لکیر چھوڑنے لگی تھی۔ کشتی کو سمندر کی لہریں ساحل کی طرف تیزی سے لیے جا رہی تھیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کشتی سمندر سے ابھری ہوئی کالی سیاہ چٹانوں کے درمیان سے گزرنے لگی۔

ملاح بڑی جانفشانی اور مہارت سے کشتی کو چلا رہے تھے کہ وہ کسی چٹان سے نہ ٹکرا جائے۔ انڈمان کے جزیروں کے چھوٹے چھوٹے ٹاپو شروع ہو گئے۔ شبانہ نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے بیکراں سیاہ سمندر سے نجات مل گئی تھی۔ اب دوسرے بڑے جزیروں کی روشنیاں دکھائی دینے لگیں۔ آخر تجربہ کار ملاح کشتی کو ساحل کے قریب لے جانے میں کامیاب ہو گئے۔ کشتی ایک چھوٹے جزیرے کے ساحل پر چڑھ گئی۔ شبانہ بھی دوسرے ملاحوں کے ساتھ گھٹنے گھٹنے سمندری پانی میں چلتی ہوئی کنارے کی ریت پر آ گئی۔ ملاح ایک جگہ کھڑے ہو کر جزیرے کے سیاہ درختوں اور ان کے درمیان کچھ فاصلے پر ٹمٹماتی روشنیوں کو دیکھنے لگے۔ عبدل ان سب میں زیادہ تجربہ کار اور زیادہ عمر کا تھا۔ وہ بنگلہ میں باتیں کر رہے تھے۔ عبدل نے ان سب کو ایک طرف چلنے کے لیے کہا اور خود شبانہ کے پاس آ کر بولا۔

"بیٹی! خدا کا شکر ہے کہ ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ یہ انڈمان کا ایک چھوٹا جزیرہ ہے۔ یہاں اس قسم کے بے شمار جزیرے ہیں۔ مگر سب سے بڑا جزیرہ یہاں سے تھوڑی دور ہے۔ اسی جزیرے میں کالے پانی کی مشہور جیل بھی ہے اور وہاں کافی لوگ آباد ہیں۔ ان جزیروں پر انڈیا کی حکومت ہے۔ ہم بھی انڈین ہیں یہ لوگ ہماری مدد کریں گے۔"

شبانہ بھی عبدل کے ساتھ ناریل کے درختوں کی طرف چل پڑی۔ عبدل کو اس نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ وہ اسے بتانا بھی نہیں چاہتی تھی۔ عبدل سمیت سب ملاح یہی سمجھ رہے تھے

کہ شبانہ جہاز کے کپتان کی بھانجی ہے۔ عبدل سمیت یہ کل سات ملاح تھے۔ ان میں بنگالی بھی تھے اور مدراس کے تامل بھی۔ ناریل کے درختوں سے نکل کر وہ ایک پکی سڑک پر آ گئے۔ اِدھر اُدھر درختوں میں کچھ بیرکیں بنی ہوئی تھیں جن کے باہر روشنی ہو رہی تھی۔ اچانک ایک طرف سے دو سنتری رائفلیں تانے نکلے اور "ہالٹ" کا نعرہ لگا کر ان کے سامنے رائفلیں تان کر کھڑے ہو گئے۔

یہ انڈین سنتری تھے۔ عبدل نے آگے بڑھ کر انھیں ساری داستان سنائی کہ کس طرح ان کا جہاز سمندر میں غرق ہو گیا اور وہ کشتی کے ذریعے اپنی جانیں بچا کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ انڈین فوجیوں پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا اور وہ ان سب کو ایک بیرک کی طرف لے گئے اور وہاں بند کر دیا۔

عبدل کہنے لگا "گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ صبح کو ان کا افسر آئے گا تو وہ ہمیں صرف آزاد ہی نہیں کر دے گا بلکہ ہمیں کسی جہاز میں بٹھا کر ہندوستان بھی پہنچا دے گا۔ آخر جہاز کے ڈوبنے کی خبر ان تک پہنچ گئی ہو گی۔ کپتان نے دھماکہ ہوتے ہی ایس او ایس سگنل دے دیا ہو گا۔"

شبانہ پریشانی کے عالم میں بیرک کے کونے میں فرش پر بیٹھ گئی۔ عبدل تھوڑی تھوڑی دیر بعد اسے تسلی دے دیتا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ایک سکھ کیپٹن آنکھیں ملتا ہوا یہاں آ گیا۔ اس نے آتے ہی سب کو غور سے دیکھا۔

شبانہ کی طرف گھورتے ہوئے بولا "یہ کون ہے اوئے؟"

عبدل نے بتایا کہ یہ جہاز کے کپتان کی بھانجی ہے اور کلکتے سے کپتان کے ساتھ رنگون جا رہی تھی۔ سکھ کیپٹن نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا "اوئے تم جاسوسی کرنے یہاں آئے ہو۔ میں تم سب کو جانتا ہوں صبح تمھیں میں خود شوٹ کر دوں گا۔ ابھی رات گزر جانے دو۔"

سکھ کیپٹن اپنے گارڈز کے ہمراہ بیرک سے نکل گیا اور بیرک کے باہر دو رائفل بردار سنتریوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ شبانہ کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ موت اسے سامنے نظر آ رہی تھی۔ عبدل نے اگرچہ اسے حوصلہ دیا مگر شبانہ کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ اکھڑ فوجی اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

- - ⁘ - -

دوسرے دن سکھ کیپٹن بیرک میں آیا تو وہ ہوش میں تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ رات اس نے عبدل اور اس کے ساتھی ملاحوں کو شبانہ سمیت شوٹ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ ان سب کو اسٹیمر میں سوار کرا کہ انڈیمان کے سب سے بڑے جزیرے میں لے گیا۔ جہاں کالے پانی کی سنٹرل جیل تھی اور جس کی ایک سلاخ دار زمین دوز کوٹھری میں ندیم قید و بند کے شب و روز گزار رہا تھا۔ یہاں انھیں ایک کمانڈر کے سامنے پیش کیا گیا۔ عبدل نے اسے بھی جہاز کے غرق ہونے کی داستان سنائی۔ وہ بولا "کل ہمیں اس جہاز کے سگنل موصول ہوئے تھے لیکن پھر یہ سگنل اچانک بند ہو گئے۔"

عبدل نے بتایا کہ جہاز میں دھماکے ہوئے اور آگ لگ گئی اور وہ اتنی تیزی سے ڈوب گیا کہ جہاز کے کپتان کو بھی کیبن سے اوپر ڈیک پر آنے کی مہلت نہ مل سکی۔" کمانڈر نے ان سب ملاحوں کے نام لکھ کر کلکتے میں مرچنٹ نیوی کے سنٹرل آفس کے ساتھ وائرلیس پر بات کی وہاں سے ان ملاحوں کے ناموں کی تصدیق ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ کپتان کے ساتھ اس کی ایک بھانجی بھی سفر کر رہی تھی۔ عبدل نے شبانہ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کمانڈر سے کہا "یہ بچی ہی کپتان صاحب کی بھانجی ہے جو ہمارے ساتھ ہی بدقسمت جہاز پر سفر کر رہی تھی۔ کمانڈر نے انھیں فوراً رہا کر دیا۔

انھیں کھانا کھلایا، کافی پلائی اور کہا "تم لوگ ابھی بیرکوں میں ہی ٹھہرو گے ... کرشنا نامی جہاز پندرہ دنوں کے بعد کلکتے سے انڈیمان آئے گا ... دو دن یہاں ٹھہرنے کے بعد جہاز واپس جائے گا تو تم لوگوں کو بھی اس میں سوار کروا دیا جائے گا۔"

سب بڑے خوش ہوئے شبانہ نے بھی ایک بار پھر سکھ کا سانس لیا۔ پھونس کی ڈھلوان

چھتوں والی لمبی لمبی کتنی ہی بیرکیں تھیں۔ ایک بیرک میں ان سب کے لیے چار پائیاں لگا دی گئیں۔ عبدل نے شبانہ کی چارپائی بیرک کے کونے والے چھوٹے سے کمرے میں بچھا دی جہاں لکڑی کے کنستروں کا ڈھیر لگا تھا۔ اب یہ لوگ ہندوستان سے آنے والے "کرشنا" جہاز کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دن بھر جزیرے کے بازاروں اور گنجان ہری بھری وادیوں میں گھومتے پھرتے اور رات کو کھانا کھا کر سو جاتے۔ شبانہ زیادہ وقت اپنی کوٹھڑی میں ہی گزارتی اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ اسی جزیرے میں اس کی کوٹھڑی سے تھوڑی دور پہاڑی ٹیلوں کے درمیان سنٹرل جیل کی ایک کوٹھری میں ندیم قید ہے۔

اس سے پہلے ہم بیان کر چکے ہیں کہ ندیم کو انڈین آرمی انٹیلی جنس نے پاکستانی جاسوس سمجھ کر گرفتار کیا تھا اور کلکتے سے یہاں کالے پانی کی جیل میں پوچھ گچھ کے لیے لے آئے تھے یہاں لانے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ندیم ان کے بقول اپنے ساتھیوں سے مل کر کلکتے میں کوئی تخریب کاری نہ کر سکے۔ حالانکہ حقیقت کا اس سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ ندیم پاکستانی جاسوس نہیں تھا وہ تو لاہور سے محض اپنی محبوبہ نجمی سے ملنے اور اسے وہاں سے نکال کر واپس پاکستان لے جانے کے لیے ہندوستان آیا تھا کہ کلکتے پہنچ کر پکڑا گیا۔ ہندوستان میں جو بھی پاکستانی ویزے کے بغیر یا ویزے کی مدت سے زیادہ دیر ٹھہرتے پر پولیس کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اگر وہ وی آئی پی نہیں ہے تو انڈین پولیس اسے پاکستانی جاسوس ہی سمجھتی ہے اور اسے قید کر کے اس پر تشدد کرتی ہے اور پوچھ گچھ شروع کر دیتی ہے۔

ندیم پر بھی کالے پانی کی جیل میں بھیانک تشدد کیا گیا۔ اس سے پہلے دلی اور کلکتے میں بھی وہ انڈین انٹیلی جنس والوں کے ہاتھوں کافی اذیتیں برداشت کر چکا تھا چونکہ وہ پاکستانی جاسوس نہیں تھا اس لیے ندیم نے کبھی اس کا اقرار نہیں کیا تھا۔ یہاں کالے پانی کی جیل کی کوٹھری میں شروع شروع میں اس کو شدید اذیتیں دی گئیں پھر جیل کے حکام نے کچھ دیر کے لیے ہاتھ روک لیا جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ اس جیل میں نذرل نام کا ایک بنگالی مسلمان میٹ تھا جس کی ڈیوٹی صبح شام یہاں پر قیدیوں کی مختصر تعداد کی گنتی کرنا تھی۔ نذرل بڑا پکا بنگالی مسلمان تھا اور پاکستان سے محبت کرتا تھا۔ سقوط ڈھاکہ کا اسے سب سے زیادہ صدمہ ہوا تھا۔ ندیم پر جب تشدد کیا جاتا تو

وہ اس کی چیخیں نہیں سن سکتا تھا۔ وہ ایک پاکستانی مسلمان پر ہندو افسروں کے ہاتھوں ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ نوکری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ ندیم پاکستانی جاسوس نہیں ہے اور اسے ملٹری پولیس محض شبہے میں پکڑ کر یہاں لے آئی ہے دن میں کسی وقت وہ ندیم کے پاس کسی نہ کسی بہانے جا کر اس سے تھوڑی بہت باتیں کر لیتا تھا۔

ایک بار اس نے ندیم سے کہا "بیٹا! اگر تم جاسوس ہو تو اقرار کر لو کم از کم اس عذاب سے تو نجات مل جائے گی۔ یہ لوگ تمھیں اذیتیں دے دے کر مار ڈالیں گے۔"

ندیم نے خدا کو حاضر ناظر جان کر نذرل کے سامنے تسلیم کیا کہ وہ پاکستانی جاسوس نہیں ہے .... پھر اس نے اپنی ساری کہانی نذال کو شروع سے آخر تک سنا دی۔ نذرل ایک ادھیڑ عمر کا بال بچوں والا نیک دل بنگالی مسلمان تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ ندیم جو کچھ کہہ رہا ہے جھوٹ نہیں ہے۔

چنانچہ ایک روز جب ندیم نے موقع پا کر نذرل بابا سے کہا "میں یہاں سے فرار ہو کر ہندوستان جانا چاہتا ہوں کیا اس کی کوئی ترکیب ہو سکتی ہے ؟"

تو نذرل نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر ندیم کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور وہاں سے چل دیا۔

دو روز بعد وہ گنتی کرنے آیا تو ندیم کی کوٹھری کی سلاخوں کے پاس باہر راہداری میں بیٹھ کر بیڑی پینے لگا۔ سنتری راہداری کے کونے میں اسٹول پر بیٹھا تھا۔ جیل کے سنتری نذرل بابا کا بڑا احترام کرتے تھے اور کبھی اس پر روک ٹوک نہیں کرتے تھے۔

نذرل بابا نے راہداری کی طرف دیکھتے ہوئے ندیم سے آہستہ سے کہا "کرشنا" نام کا ایک انڈین جہاز مال لینے بیس روز بعد یہاں آنے والا ہے .... اگر تم کسی طرح یہاں سے نکل سکو تو اس جہاز پر بیٹھ کر ہندوستان جا سکتے ہو .... دوسرا کوئی طریقہ نہیں ہے۔"

ندیم جلدی سے سلاخوں کے پاس ایک طرف اوٹ میں ہو کر بیٹھ گیا اور سرگوشی میں بولا "نذرل بابا! میں یہاں سے کیسے نکلوں؟ صرف تم ہی میری مدد کر سکتے ہو۔"

نذرل بیڑی کا کش لگا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سامنے سے سنتری راہداری میں ٹہلتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ نذرل نے ندیم کو مخاطب کر کے بلند آواز میں کہا "ارے پاکستانی جاسوسوں کو تو ہم کبھی نہیں چھوڑا کرتے۔ بہتر یہی ہے کہ مان لو کہ تم پاکستانی جاسوس ہو۔"

اور نذرل سنتری کو سلام کرتا ہوا راہداری میں آگے چل دیا۔ ندیم دیوار کے ساتھ لگ کر پرانے کمبل پر بیٹھ گیا اور سوچنے لگا۔ نذرل اگر اسے یہاں سے کسی طرح نکال دے تو وہ کرشنا جہاز پر سوار ہونے کی پوری کوشش کرے گا۔ یہ جان کر ندیم کو جیسے ایک نئی طاقت مل گئی تھی کہ نذرل اس کی مدد پر آمادہ ہو گیا ہے۔ اب اسے آزادی کی روشنی دکھائی دینے لگی تھی۔

تین دن گزر گئے۔ نذرل راہداری میں سے گنتی کی آواز لگاتا ہوا گزر جاتا۔ وہ ندیم سے کوئی بات نہ کرتا اس کی کوٹھری کے آگے ایک پل کے لیے بھی نہ ٹھہرتا تھا چوتھے روز دوپہر کے وقت وہ بالٹی ہاتھ میں لیے راہداری میں داخل ہوا اور ندیم کی کوٹھری کے آگے سلاخوں کے پاس کھڑے ہو کر بولا "ڈونگا لاؤ .... شربت لے لو .... آج رشورا تری کا تہوار ہے سب قیدیوں کو ناریل کا میٹھا شربت پلایا جا رہا ہے۔"

سنتری اس وقت کاریڈار میں نہیں تھا۔ سلاخ دار دروازے پر تالا پڑا تھا۔ ندیم ڈونگا ہاتھ میں لیے سلاخوں کے پاس آ گیا۔ نذرل نے اس کے ڈونگے میں شربت ڈالتے ہوئے آہستہ سے لوہے کی ایک چابی اس کے ڈونگے میں ڈال دی اور دھیمی آواز میں کہا "یہ چابی تمھارے تالے کی ہے۔ سیدھے ہاتھ کو راہداری میں آگے جا کر سیڑھیاں نیچے اترتی ہیں .... وہاں سے ایک نالہ باہر جنگل میں نکلتا ہے .... رات بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی تم یہاں سے نکل جانا .... اس وقت راہداری میں سنتری سو رہا ہو گا .... میں تمھیں جنگل میں نالے کے باہر ملوں گا۔ سنتری جاگ رہا ہو تو اسے مار ڈالنا۔ پکڑے گئے تو میرا نام نہ لینا .... یہ تمھارا آخری چانس ہے۔"

نذرل بالٹی اٹھائے چلا گیا۔ ندیم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس کی آزادی کا پروانہ کوٹھری کے سلاخ دار دروازے کے باہر لگے ہوئے بھاری تالے کی چابی اس کے ڈونگے میں تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ ڈال کر ڈونگے میں سے چابی نکالی اور اسے کمبل کے نیچے چھپا دیا پھر آہستہ آہستہ شربت پیتے ہوئے رات کو فرار کا منصوبہ تیار کرنے لگا۔ وہ اس سے پہلے دلی کی جیل سے فرار ہو چکا تھا۔ اسے صرف سنتری کی فکر تھی کہ اگر وہ راہداری میں موجود ہوا اور وہ اس پر قابو نہ پا سکا تو سارا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ وہ ہر حالت میں

موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد شاید اسے ساری زندگی ایسا موقع نہیں مل سکتا تھا۔ ندیم کونے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے سوچ رہا تھا ہر ایک امکان پر غور کر رہا تھا۔ ندرل نے اسے یہ اشارہ بھی دیا تھا کہ ہو سکتا ہے سنتری بارہ بجے رات راہداری میں نہ ہو اس کی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ اس رات شوراتری کا جشن منایا جا رہا تھا ممکن ہے ہندو سنتری اس جشن میں حصہ لینے کچھ دیر کے لیے چلا جائے۔ جو بھی ہو ندیم نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ہر حالت میں قسمت آزمائے گا۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا کہ وہ پکڑا جائے گا اس پر تشدد کیا جائے گا۔ تشدد تو اس پہ ہونا ہی رہتا تھا یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بے چینی سے رات کا انتظار کرنے لگا۔

جیل میں ہر ساٹھ منٹ کے بعد ہلکی سی آوازا سے سنائی دیا کرتی تھی۔ ندرل رات کو ٹھیک نو بجے آتا تھا۔ ندرل اس رات بھی ٹھیک نو بجے آیا اور گنتی کی آواز لگاتا اس کی کوٹھری کے آگے سے گزر گیا۔ یہاں سے ندیم نے وقت کا حساب رکھنا شروع کر دیا۔ دس کا گھنٹہ بجا پھر گیارہ کا گھنٹہ بجا تو ندیم اضطراب کے عالم میں پہلو بدلنے لگا۔ کچھ دیر کے لیے وہ کوٹھری میں ٹہلتا بھی رہا اسے بارہ بجے کے گھنٹے کا انتظار تھا۔ ایک بار وہ اٹھ کر سلاخوں کے پاس آیا اس نے سلاخوں کے ساتھ منہ لگا کر دائیں جانب دیکھا ندرل نے اسے سیدھے ہاتھ کو جانے کی ہی ہدایت کی تھی۔ اسے راہداری کا تھوڑا سا کونا نظر آیا وہاں سنتری اسٹول پر بیٹھا اونگھ رہا تھا اس کے سر کے اوپر کمزور سا بلب جل رہا تھا۔ رائفل سنتری کے گھٹنوں پر پڑی تھی۔ ندیم واپس کونے میں آ کر بیٹھ گیا۔ یہ کم بخت اگر نہ گیا تو اس کے لیے کوٹھری کا تالا کھولنا ناممکن ہو جائے گا۔ ندیم خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ یہ کم بخت یہاں سے دفع ہو جائے۔ رات کے بارہ کا گھنٹہ بجا تو ندیم اپنی جگہ پر کانپ سا گیا۔ وہ دبے پاؤں اٹھ کر سلاخوں کے پاس گیا یہ دیکھ کر اس کا دل خوشی سے اچھل پڑا کہ راہداری کے کونے میں سنتری نہیں تھا اسٹول خالی تھا اب تاخیر کا وقت نہیں تھا۔

ندیم نے کمبل کے نیچے سے چابی اٹھائی۔ سلاخوں میں سے تھوڑا سا بازو باہر نکال کر ہاتھ کو موڑتے ہوئے چابی تالے میں لگانے کی کوشش شروع کر دی۔ اس کے ہاتھ ٹھنڈے ہو کر کانپنے لگے تھے چابی تالے میں لگ گئی۔ ندرل نے تالے کی دوسری چابی بنوا کر اسے دی تھی تالا کھل گیا۔

ندیم نے کنڈے کی سلاخ آہستہ سے پیچھے کر دی اب دروازہ کھل سکتا تھا۔ ندیم نے ایک بار پھر راہداری کے کونے میں نگاہ ڈالی راہداری اپنے موڑ تک سنسان پڑی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ کھولا باہر نکل کر سلاخوں والے دروازے کو دوبارہ بند کیا اور دیوار کے ساتھ لگ کر راہداری میں سیدھے ہاتھ کو تیز تیز قدموں سے چلنے لگا جہاں راہداری کا موڑ تھا وہاں وہ رک گیا۔ دوسری جانب بھی راہداری بالکل خالی تھی۔ وہ آگے بڑھا تو اوپر سے لوگوں کے قہقہوں کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دیں شاید جیل کا عملہ شوراتری کا جشن منا رہا تھا۔ ندیم جتنی تیزی سے چل سکتا تھا اس نے راہداری پار کی آگے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں سیڑھیوں میں اندھیرا تھا وہ سیڑھیوں میں آ کر رک گیا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

• • • • • • • •